نسیم

مصالحہ ریسپی مکس

روایتی ذائقہ اور کوالٹی

PIONEERS SINCE

1947

pklibrary.com

روایتی کھانوں کی

اصل پہچان

شاندار بچت EXTRA VALUE 2 BAGS INSIDE

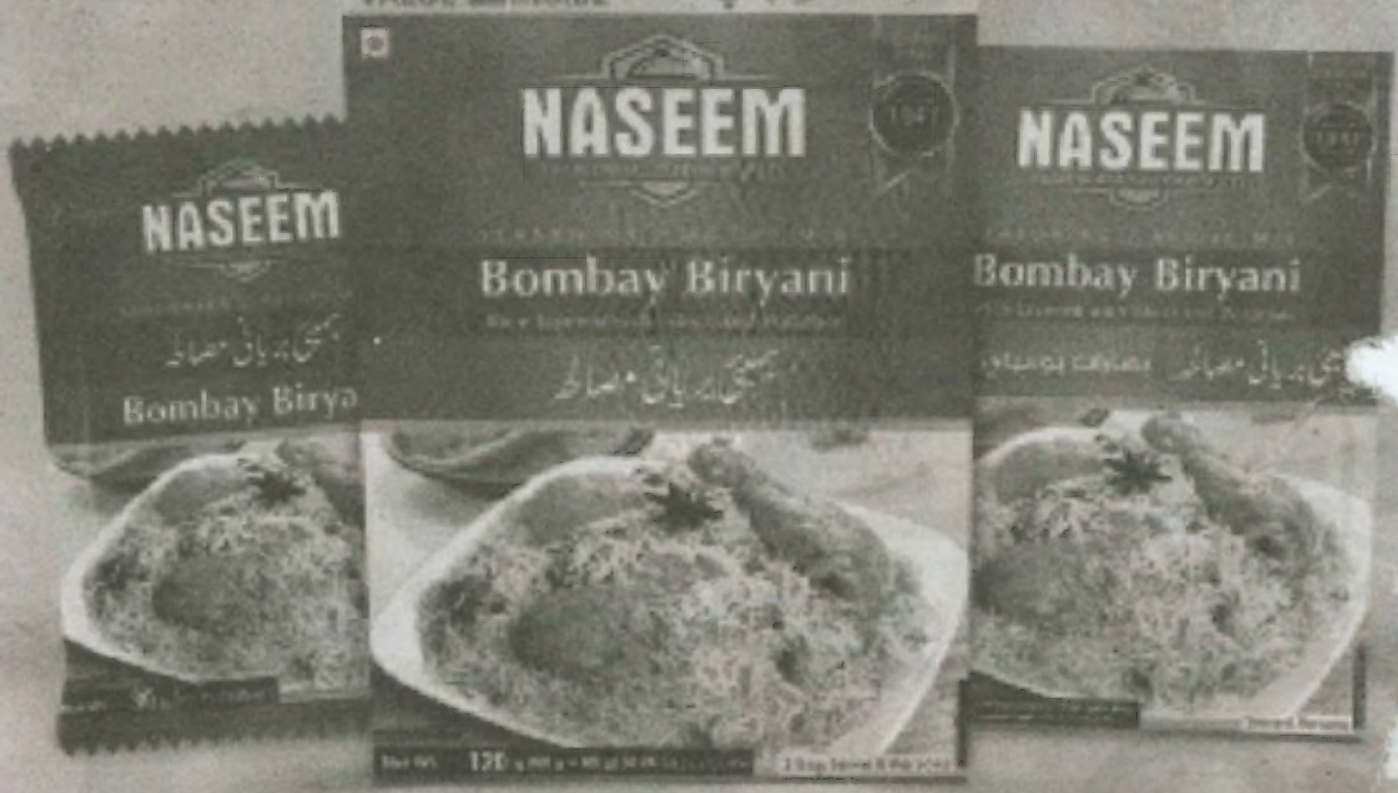

سلسلہ... روایتی کھانوں کا

pklibrary.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خواتین و حضرات کا پسندیدہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — اذر ریاض

مدیر اعزازی — امت الصبور

فلم ٹی وی — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

واٹس اپ
03172266944

pklibrary.com

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 8
حمد، تنویر پھول 9
نعت، ایم یوسف وحید 9
نبی کی باتیں، ادارہ 10

انٹرویو

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرتا، آمنہ زریں 15
وہاج علی سے ملاقات، شاہین رشید 29
دستک، شاہین رشید 33
جب تجھ سے ناتا، م۔ ج 17
جب تجھ سے ناتا، ح۔ ع۔ ص 20
عید قربان اور آپ، ادارہ 22

ناول

شام کی حویلی میں، رخسانہ نگار عدنان 36

مکمل ناول

عسر یسرا، حسنہ حسین 114
تلافی، نعیمہ ناز 76
دوپہری کے گیت، سدرۃ المنتہیٰ 186
خزاں رسیدہ پتے، مصباح یونس 142

افسانے

پیام عید، مونا شاہ قریشی 57
کرپال سنگھ کی ڈائری، فرح بخاری 69
ہم تم اور چاند، حمیرا شفیع 103
ماں جایا، وردہ بخاری 136
شمع کی لو، شازیہ الطاف ہاشمی 182
انا، قرۃ العین خرم ہاشمی 220

نظمیں و غزلیں

غزل، قابل اجمیری 229
غزل، خمار بارہ بنکوی 229

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ..... 960/- روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ..... 17,000/- روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ... 20,000/- روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

جولائی 2021
جلد 35 شمارہ 11
قیمت 80 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع اگست کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

pklibrary.com

pklibrary.com

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	236	آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	248
مسکراہٹیں	ادارہ	230	موسم کے پکوان	واصفہ سہیل	252
باتوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	232	مہندی کے ڈیزائن	ادارہ	256
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	235	خوبصورت بنئے	ادارہ	258
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	245			

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے نیو حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ جمیل

پہلی کرن

شعاع جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

پورا ملک شدید گرمی اور لوڈ شیڈنگ کی لپیٹ میں ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری اس وقت عوام کا سب سے بڑا مسئلہ ہے لیکن اس شدید گرمی میں لوڈ شیڈنگ بھی کم ستم نہیں ہے۔ گھر میں ہے نہ باہر۔ نہ دن میں سکون ہے نہ رات کو آرام۔ جائیں تو کہاں جائیں؟

سابقہ دور حکومت میں بجلی کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس وقت بھی ملک میں بجلی وافر مقدار میں موجود ہے لیکن ترسیلی نظام میں خرابی کی وجہ سے لوڈ شیڈنگ کرنا پڑ رہی ہے۔ لائنیں ٹرپ کر جاتی ہیں، اور بھی مسائل ہیں کوئی توجہ دے تو ترسیلی نظام درست کرنا اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے۔

پچھلے دنوں حکومتی سالانہ بجٹ پیش کیا گیا تو بجٹ سیشن کے دوران جو کچھ ہوا، وہ ٹی وی اسکرینوں کے ذریعے پوری دنیا میں دیکھا گیا۔ نوبت بدکلامی اور گالم گلوچ سے اس حد تک جا پہنچی کہ دیکھنے سننے والوں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

انتہا پسندی کا یہ رجحان بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کی اجازت نہ ہماری تہذیب دیتی ہے نہ یہ ہماری روایت رہی ہے۔

زندگی اعتدال اور توازن کا نام ہے۔ نفرت ہو یا محبت، کاروبار ہو یا سیاست، دوستی ہو یا دشمنی، دنیا کے تمام امور میں توازن اور اعتدال بہترین راستہ ہے۔ کبھی بھی معاملات کو اس حد تک نہیں لے جانا چاہیے کہ واپسی ناممکن ہو جائے۔

عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہے۔

یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو آپ عید کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔

ہماری طرف سے عید الاضحیٰ کی پیشگی مبارک باد قبول کیجیے۔ دعا ہے کہ عید آپ کے آنگن میں خوشیوں کی بارات لے کر اترے۔ آمین۔

ایک ضروری وضاحت،

بہن حسنہ حسین جن کا ناول عمر یسرا قارئین میں بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علم میں آیا ہے کہ ان کی مقبولیت اور نام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ایک آن لائن رائٹر جن کا اصلی نام کچھ اور ہے، وہ حسنہ حسین کے نام سے لکھ رہی ہیں۔ حسنہ حسین کے ناول نور سین کی اشاعت کے بعد انہوں نے حسنہ حسینی کے نام سے لکھنا شروع کیا۔

ہم وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ حسنہ حسین نے کبھی آن لائن نہیں لکھا۔ نور سین ان کی پہلی تحریر تھی جو ڈائجسٹ میں شائع ہوئی اور عمر یسرا ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا پہلا قسط وار ناول ہے۔

سالگرہ نمبر،

شعاع کا اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا جس میں پرانی مصنفین کے ساتھ ساتھ نئی مصنفین کی تحریریں بھی شامل ہوں گی۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- نعیمہ ناز کا مکمل ناول۔ تلافی، ، حسنہ حسین کا مکمل ناول۔ عمر یسرا، ، مصباح یونس کا مکمل ناول۔ خزاں رسیدہ پتے،
- سدۃ المنتہیٰ کا ناول۔ دوپہری کے گیت، ، رخسانہ نگار عدنان کا ناول شام کی حویلی میں تکمیل کے مراحل میں،
- فرح بخاری، مونا شاہ خریفی، وردہ بخاری، شازیہ الطاف ہاشمی، امیرا شفیع اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے،
- معروف فنکار وہاج علی سے ملاقات، ، جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ فاریحہ کا پسندیدہ سلسلہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

pklibrary.com

حمد باری تعالیٰ

ہے تو ہی سُننے والا، سُن لے یارب ان دعاؤں کو
فلاحِ دین و دُنیا میں بدل دے سب بلاؤں کو

محبت تجھ کو بندوں سے ہے ستر ماؤں سے بڑھ کر
ہمارے سر پہ کر سایہ فگن رحمت کی چھاؤں کو

تری مخلوق پھیلی ہے جہاں میں ہر طرف مولا
الٰہی! رونقیں دیتا ہے تُو شہروں کو گاؤں کو

تری قدرت، تری حکمت بھلا انسان کیا سمجھے
بدلتا موسموں کو ہے، چلاتا ہے ہواؤں کو

زمین اور آسمانوں میں اُجالا تجھ سے ہے مولا
ضیا بخشی ہے تُو نے چاند تاروں، کہکشاؤں کو

الٰہی واسطہ دیتا ہوں تجھ کو اُس محبت کا
تجھے جو مصطفٰےؐ سے ہے، مٹا میری خطاؤں کو

ہوا ہے پھُول پژمُردہ، کرم کی اس پہ بارش کر
الٰہی! حکم دے دے اپنی رحمت کی گھٹاؤں کو

تنویر پھُول

نعت رسول مقبولؐ

سب سے اعلا و برتر تیری ذاتِ گرامی
تجھ کو بھیجا بنا کے خدا کا پیامی

بجا لاتے ہیں جھک کے آدابِ پیہم
فلک پر ہیں کرتے فرشتے سلامی

فلک سے زمیں تک تیری ذاتِ اقدس
لب پہ ہے ہر دم تیرا نامِ نامی

ازل سے ابد تک تیری پاک ہستی
کہاں تک کروں بیاں تیرا فیضِ دوامی

محشر میں ہے مجھ کو صرف تیرا سہارا
نہیں کوئی تیرے سوا میرا حامی

بھروسا ہے یوسف کو تیرے کرم پر
مبارک ہے اس کو تیرے در کی غلامی

ایم یوسف وحید

pklibrary.com

قربانی کے مسائل

pklibrary.com

قربانی سے متعلق احکام و مسائل

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو چتکبرے اور سینگوں والے مینڈھوں کی قربانی دیا کرتے تھے اور (ذبح کرتے وقت) بسم اللہ اور تکبیر پڑھتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ کر اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کرتے دیکھا۔

فوائد و مسائل:

1۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر صاحب استطاعت کو کم از کم ایک بکری، مینڈھا، گائے یا اونٹ کے ایک حصے کی قربانی کرنا ضروری ہے۔

2۔ ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی بھی جائز بلکہ افضل ہے۔

3۔ گھر کے فرد کو اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا چاہیے، تاہم کوئی دوسرا شخص بھی ذبح کر سکتا ہے۔

4۔ قربانی کا جانور عمدہ اور خوب صورت ہونا چاہیے۔

5۔ ذبح کرتے وقت جانور کے جسم پر پاؤں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جانور قابو میں رہے اور بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو مینڈھے قربان کیے۔ جب انہیں قبلہ رخ کیا تو فرمایا:

ترجمہ:

میں نے یکسو ہو کر اپنا چہرہ اس اللہ کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں۔ بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔ اے اللہ! یہ جانور تجھی سے ملا اور تیرے ہی لیے قربان کیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت کی طرف سے۔"

قربانی کے جانور

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو دو بڑے بڑے، موٹے تازے، سینگوں والے، چتکبرے اور خصی مینڈھے خریدتے ایک اپنی امت کی طرف سے ذبح فرماتے، یعنی امت کے ہر اس فرد کی طرف سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول ہونے) کی گواہی دیتا ہو۔ اور دوسرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی طرف سے ذبح کرتے۔

فوائد و مسائل:

1۔ قربانی کے جانور عمدہ ہونے چاہئیں۔

2۔ جانور ظاہری شکل و صورت میں بھی اچھا ہونا چاہیے اور موٹا تازہ اور صحت مند بھی۔

3۔ خصی جانور کی قربانی درست ہے۔ اسے عیب شمار نہیں کیا جاتا۔

4۔ گھر کے تمام افراد کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔

5۔ کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔

6۔ میت کی طرف سے قربانی کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی عمل سے استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ بعض علماء کے نزدیک وہ آپ کا خاصہ ہے جس میں امت کے لیے آپ کی اقتدا جائز نہیں۔ دیکھیے: (ارواء الغلیل: ۳۵۴/۴) علاوہ ازیں خیر القرون (صحابہ و تابعین کے بہترین ادوار) میں بھی میت کی طرف سے قربانی کرنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ صرف ایک نقطہ نظر سے اس کا جواز ہو سکتا ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا جائز ہے، یعنی ایصال ثواب کے طور پر اس کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کے پاس (قربانی کرنے کی) گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اس حدیث سے بظاہر قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن دوسرے دلائل سے اس کا استحباب و استنان معلوم ہوتا ہے، اس لیے محدثین نے ان سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت موکدہ ہے، یعنی ایک اہم اور موکد حکم ہے، فرض نہیں، تاہم استطاعت کے باوجود اس سنت موکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

2۔ قربانی مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر ہے اور اس سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

3۔ قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقصد اسے تنبیہ کرنا ہے تاکہ وہ قربانی ترک نہ کرے۔

قربانی کا ثواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قربانی کے دن آدم کا بیٹا کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اللہ کو خون بہانے (جانور کی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو۔ وہ (جانور) قیامت کے دن اپنے سینگوں، کھروں اور بالوں سمیت آئے گا (اور نیکی کے پلڑے میں رکھا جائے گا۔ قربانی کے جانور کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں (قبولیت کا) مقام حاصل کر لیتا ہے، اس لیے خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔"

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے کہا:

"اے اللہ کے رسول! یہ قربانیاں کیا ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہیں۔"

انہوں نے کہا: "اس میں ہمارے لیے کیا (ثواب) ہے؟"

آپ نے فرمایا: "ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔"

انہوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! اور اون؟"

فرمایا: "اون کے بھی ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔"

کون سی قربانی مستحب ہے؟

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگوں والے نر مینڈھے کی قربانی دی۔ وہ سیاہی میں کھاتا، سیاہی میں چلتا اور سیاہی میں دیکھتا تھا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ قربانی کا جانور دیکھنے میں بھی خوب صورت ہونا چاہیے۔

2۔ "نر" (فحیل) سے مراد یہ ہے کہ وہ خصی نہ تھا۔

3۔ نر اور خصی دونوں قسم کا جانور قربانی میں دینا جائز ہے۔

pklibrary.com

4۔ سیاہی میں کھانے، چلنے اور دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا منہ بھی سیاہ تھا، اس کے پاؤں بھی کالے تھے، اور اس کی آنکھوں کے اردگرد کی جگہ بھی سیاہ تھی۔ اس طرح کا مینڈھا خوب صورت سمجھا جاتا ہے، نیز دیکھنے میں بھی خوب صورت اور بھلا لگتا ہے۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بہترین کفن وہ ہے جو ایک رنگ کی دو چادروں پر مشتمل ہو اور بہترین قربانی سینگوں والا مینڈھا ہے۔"

اونٹ اور گائے (کی قربانی) کتنے افراد کی طرف سے کفایت کر سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ عیدالاضحیٰ آ گئی، چنانچہ ہم نے دس دس آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ہم نے حدیبیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک اونٹ سات افراد کی طرف سے اور ایک گائے سات افراد کی طرف سے ذبح کی۔

فائدہ: پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں، اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ امام مسلم رحمتہ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے متعدد احادیث روایت کی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج میں بھی اور عمرے میں بھی سات آدمیوں کو ایک اونٹ میں شریک کیا۔ لیکن ان دونوں احادیث میں باہم کوئی تعارض نہیں کیونکہ اونٹ میں دس آدمیوں کی شراکت کا واقعہ عام قربانی کے موقع کا ہے جب کہ سات آدمیوں کی شرکت کا تعلق حج و عمرہ سے ہے۔ بنابریں حج و عمرہ میں گائے اور اونٹ دونوں میں صرف سات سات افراد ہی شریک ہوں گے، جب کہ عام قربانی میں گائے میں سات اور اونٹ میں دس افراد شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ فرق حدیث سے ثابت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں (ایک بار) اونٹوں کی قلت ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گایوں کو قربان کرنے کا حکم دے دیا۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور انہی کی رائے اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم، لہذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد کی بنا پر قابل عمل اور قابل حجت ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع میں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔

کس عمر کے جانور کی قربانی درست ہے؟

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کچھ بکریاں دیں جو انہوں نے قربانی کے لیے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے) صحابہ کرام میں تقسیم کر دیں۔ (ان کے پاس) بکری کا ایک سالہ بچہ (باقی) رہ گیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو آپ نے فرمایا:

"اس کی قربانی تم دے دو۔"

فائدہ:

1۔ حدیث میں عتود کا لفظ ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے۔ "جو بچہ خود چرنے چگنے کے قابل ہو جائے اور ماں کا محتاج نہ رہے۔"

2۔ نواب وحید الزمان خان رحمتہ اللہ نے عتود کے معنی ایک سال کا بکری کا بچہ کیے ہیں۔ (ترجمہ

pklibrary.com

حدیث زیر مطالعہ) ہم نے اپنے ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

حضرت ام بلال بنت ہلال رحمتہ اللہ نے اپنے والد سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بھیڑ کے جذعہ کی قربانی جائز ہے۔''

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آئندہ آنے والی حدیث اس سے کفایت کرتی ہے۔ دیکھیے تحقیق و تخریج حدیث ہذا۔ علاوہ ازیں دیگر محققین نے اسے حسن لغیرہ قرار دیا ہے، لہذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد اور متابعات کی بنا پر قابل حجت اور قابل عمل ہے۔

حضرت عاصم بن کلیب رحمتہ اللہ نے اپنے والد (حضرت کلیب بن شہاب رحمتہ اللہ) سے روایت کی، انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے ساتھ تھے جن کا نام حضرت مجاشع (بن مسعود) رضی اللہ عنہ تھا جو کہ قبیلہ بنو سلیم میں سے تھے۔ (قربانی کے لیے) بکریاں (تقسیم کی گئیں تو) کم پڑ گئیں، چنانچہ انہوں نے ایک شخص کو حکم دیا تو اس نے اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

''بلاشبہ ''جذعہ'' (ایک سالہ) ثنیہ (دو دانتے) کی جگہ کفایت کر جاتا ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ ثنیہ یا مُسنہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دانت ٹوٹ کر دو نئے دانت آ جائیں۔

2۔ جذعہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دانت نہ ٹوٹے ہوں۔

3۔ مذکورہ بالا حدیث اور ام بلال رحمتہ اللہ سے مروی حدیث: ''بھیڑ کے جذعے کی قربانی کرو، اس لیے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔'' (مسند احمد: ۶/۳۶۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں بھی بھیڑ کا جذعہ قربانی کیا جا سکتا ہے، البتہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت، جو کہ صحیح مسلم (۱۹۶۳ء) میں ہے، کی رو سے مسنہ (دو دانتا) جانور قربان کرنا افضل ہے۔ نیز راجح قول کے مطابق جذعہ صرف بھیڑ میں جائز ہے، یعنی دنبہ اور چھترا، دیگر جانوروں کے اس عمر کے بچوں کی قربانی کرنا جائز نہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دو دانتے کے سوا کوئی جانور (قربانی میں) ذبح نہ کرو، سوائے اس کے کہ تمہارے لیے (دو دانتا جانور تلاش کرنا) مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کر دو۔''

فائدہ: علامہ البانی رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جذعہ سے مراد بھیڑ کا جذعہ ہے، بکری کا جذعہ نہیں۔ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ گوشت کی بکری ہے۔ (قربانی کی نہیں۔)''

انہوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایک بکری کا جذعہ ہے۔ (کیا میں اس کی قربانی دے دوں؟)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قربان کر دو لیکن تمہارے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں۔''

علامہ البانی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی روشنی میں بکری کا جذعہ ذبح کرنے کی اجازت نہیں، البتہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روشنی میں بھیڑ کا جذعہ (ایک سال کا بچہ جس کے دانت نہ ٹوٹے ہوں) جائز ہے۔ اور یہ جواز اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں کہ دو دانتا (مسنہ) دستیاب نہ ہو، بلکہ مطلق جائز ہے۔ واللہ اعلم

جس جانور کی قربانی دینا مکروہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے جس کا کان آگے سے

کٹا ہوا ہو، یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو، یا جس کا کان چرا ہوا ہو، یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو، یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کے کان سلامت ہونے چاہئیں۔

2۔ آنکھ دیکھ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جانور کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں۔ جس کو ایک آنکھ سے نظر نہ آتا ہو، اس کی قربانی درست نہیں۔

3۔ قربانی کا اصل مقصد اللہ کے لیے اچھی چیز قربان کرنا ہے، اس لیے بے عیب جانور ذبح کرنا چاہیے۔ گوشت کھانا یا غریبوں کو کھلانا ایک اضافی فائدہ ہے، اصل مقصد نہیں۔ ورنہ آنکھ یا کان کا عیب گوشت کھانے کے مقصد میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

حضرت عبید بن فیروز رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کہا۔

"مجھے بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے کس جانور کو ناپسند کیا ہے یا اس سے منع فرمایا ہے؟"

انہوں نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا۔ اور میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے کوتاہ ہے۔ (اور فرمایا:) "قربانی میں چار جانور جائز نہیں: وہ کانا جانور جس کا کانا پن واضح ہو، بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو، لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور دبلا جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔"

عبید نے کہا: "میں تو پسند نہیں کرتا کہ اس کے کان میں نقص ہو۔"

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو چیز تمہیں پسند نہیں، اسے چھوڑ دو لیکن اسے کسی پر حرام نہ کرو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ معمولی عیب جو گہری نظر سے دیکھے بغیر محسوس نہ ہو، قربانی میں رکاوٹ نہیں۔

2۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی رائے میں کان کٹا یا پھٹا ہوا ہونا ایسا عیب نہیں جو قربانی سے مانع ہو۔

سینگ ٹوٹا، کان کٹا ہونا جائز نہیں

حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کی قربانی دینے سے منع فرمایا جس کا سینگ ٹوٹا ہوا یا کان کٹا ہوا ہو۔

اگر قربانی کا جانور صحیح سلامت خریدنے کے بعد اس میں عیب پیدا ہو جائے تو؟

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ہم نے قربانی کے لیے ایک مینڈھا خریدا۔ بھیڑیا اس کے سرینوں (کولہوں) اور کان سے کچھ حصہ کاٹ کر لے گیا۔ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (مسئلہ) دریافت کیا تو آپ نے ہمیں حکم دیا کہ اس کی قربانی کر دیں۔"

قربانی کی کھالیں

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ کے (قربانی کے) تمام اونٹوں کا گوشت، ان کی کھالیں اور جھولیں غریبوں میں تقسیم کر دیں۔

فائدہ: قربانی کا گوشت کھانا اور کھالیں اپنے استعمال میں لانا اگرچہ جائز ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ غریبوں اور مسکینوں کو دیا جائے۔

pklibrary.com

اس چھپی ہوئی کھڑکی میں جھانکو

مصنف: سوشیلا کمار اسنگھ
ترجمہ: اجمل کمال
تبصرہ: آمنہ زرین

pklibrary.com

جدید زمانے کی اپنی اپنی ندرت ہے..... الگ بات ہے کہ بعد میں آنے والے اسے پرانا کہہ کر اپنی ندرت کو نیا اور مختلف سمجھتے ہیں.....!

کہانی کہنے کا فن بھی زمانے کی جدت طرازی کے مطابق ڈھلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اول تو بیان کیے جانے والے واقعات کا تسلسل اور دوسرے دورانیہ.....

دورانیے کا اختصار، ہمارے پاس وقت کی کمی کے عالمی بحران کو مدنظر رکھ کر اختیار کیا جاتا ہے اور ہماری یہ کوشش خیال رکھنے کے زمرے میں آتی ہے کہ ہم کسی کا ضرورت سے زیادہ وقت نہ لے لیں۔ اختصار، اسی زمانے کا شاہکار ہے۔

کہانی ہر پڑھنے والے کا ونڈر لینڈ ہے..... اور حیرت، کسی بھی مسافر کا زادِ راہ۔

کہنے کا فن جب کہانی کی صورت گری میں ظاہر ہوتا ہے تو پڑھنے والا اپنی حیرت کو لیے..... خوشی خوشی اس ونڈر لینڈ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ہر زمانے کے انسان نے خود کو نیا سمجھا اور اس میں ہرج بھی کیا ہے؟ وہ اپنے عہد سے پیچھے اور آگے جانے پر تو قدرت رکھتے نہیں..... وہ اپنے آج کو نیا کیوں نا سمجھیں؟ لیکن وہ جب بھی، جتنے بھی جدید ہو جائیں..... اپنی جبلت میں قدیم ہی رہتے ہیں۔

ہر طرح کی بھوک پیاس، خواہشات اور ان کی منہ زوری کے نتائج بھگتنا..... رونا، ہنسنا..... تڑپنا..... دکھ اور سکھ کے اپنے اپنے قائدے پڑھنا۔ عزت اور بے عزتی کے اپنے اپنے معیار قائم کرنا..... پہنچ سے دور کی خواہشوں کے سمندر پار کرنا..... اور اس سفر میں کبھی لٹ جانا..... کبھی ڈوب جانا..... اور پھر سب سے بڑھ کر قدیم جبلت..... حملہ آور ہونا.....!

عزیزِ من! اگر تمہارا زیادہ وقت نہ خرچ ہو جائے تو..... حملہ آور ہونے کے انداز بھی جدید ہو چکے ہیں۔ مگر اپنے مرکز میں قدیم ہی ہیں!

تو..... جبلت کی یہی رنگا رنگی، کہانی کی روح ہے۔ ان ہی کے تال میل میں کمی بیشی زمانوں کے چلن کا تعلق کرتی ہے اور اسی زمانے کے چلن کے ساتھ نبٹتے افراد کی کہانی..... اس کھڑکی سے جھانک رہی ہے جو خود بھی چھپی ہوئی ہے!

سلیمانی ٹوپی پہن کر خود کو دوسروں کی نگاہ سے اوجھل کر دینے کا خیال ایک سہانے خواب جیسا ہے..... اور اسی قدیم خیال کی جدت طرازی کا نمونہ ہمیں کوشلیا کمار اسنگھے کے اس مختصر مگر پر اثر ناول میں ملتا ہے جس کا نام ہمیں دعوت دے رہا ہے۔

''اس چھپی ہوئی کھڑکی میں جھانکو''

فاضل مصنف کے مطابق ناول کا کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا بلکہ انسانی صورت حال، چند کردار اور ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی مدد سے کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور ان کا یہ خیال بیان کر دینے کے بعد حقیقت لگنے لگتا ہے!

معاشرے اور ان سے جڑے افراد اپنی انفرادی اور اجتماعی صورت حال کے مرحلوں سے ہی گزرتے رہتے ہیں۔ مگر ان کے قریب سے کوئی کہانی بننے والا بھی گزرے..... یہ ہر جگہ اور ہر وقت نہیں ہوتا!

ایک ہفتے کے دورانیے پر مشتمل اس کہانی میں تفصیل کو پھیلانے اور سمیٹنے..... کردار کے داخلی انتشار اور ظاہری وجود کے ساتھ نبرد آزمائی۔ طبقاتی اونچ نیچ کے مختلف اور جدید اظہاریے..... ماحولیاتی خطرات

میں گھری بستیاں، سرمایہ دار طبقے کی مخصوص استحصالی سوچ کے جدید پھندے..... خوابوں کی تتلیوں کے پیچھے بھاگتی ازلی سادگی..... اور چند روپوں کی خاطر زندگی کو گروی رکھ کر حساب چکاتے..... کہیں رنگین اوڑھنیوں کے فریب، کہیں پردیس کی مشقت باتشدد اور مسخ شدہ شناخت کے ساتھ واپسی.....

انقلاب کی دیوی کو طالب علموں کے آدرشوں کا لہو خوشی خوشی بلاتے..... بوڑھے ماں باپ کو غائب کی گئی اولاد کی گنتی کرتے اور انقلابیوں کو غائب ساتھیوں کے اہل خانہ کی بہبود کی خاطر چندہ جمع کرتے..... اور اس سے خود کو ایک عظیم مقصد کی خاطر خود قربان کر دینے کے الوہی پیامبر تصور کرتے.....

واللہ..... یہ سب کچھ اور اور ابھی اس کے علاوہ بھی..... کوشلیا کے قلم کی سیاہی سمندروں سے بھری ہوئی لگتی ہے!

اس کہانی میں ہمارے لیے جو نیا ہے، وہ سماج ہے۔

ہر گھر کی طرح..... ہر سماج کا رہن سہن، ریت رواج مختلف ہوتے ہیں اور اس مختلف کو قبول کر لینے سے پہلے، اس کی جانکاری کا مرحلہ آتا ہے..... جو ہمیں مختلف ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ذرائع..... سفر، خبر اور کہانی کے ہو سکتے ہیں۔ ان ذرائع کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر کم اہم سمجھنا، ہماری مشترکہ نالائقی کے سوا کچھ نہیں۔

سفر اور خبر کی نسبت کہانی ایک آسان ذریعہ ہو سکتی ہے۔ مشکل پسندوں کی ویسے اپنی مرضی۔

ہماری دنیا سے الگ ایک اور جہان ہے جو مختلف ہے۔ اس جہاں تک گھر بیٹھے رسائی حاصل کرنا جادوئی قالین پر سفر کرنے جیسا ہے۔

ترجمے کے ذریعے دیگر زبانوں میں لکھی گئی تحریروں کو قاری تک پہنچانا۔ ایک گراں قدر کاوش ہے اور کسی بھی کام کو تین دہائیوں کا تسلسل عطا ہو تو وہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے بن جاتا ہے! شوق، محنت، دلچسپی کا برقرار رہنا عام استعداد نہیں رہتا..... اور اسی انفرادیت کی بدولت اس چھپی ہوئی کھڑکی کا ظہور ہے۔ جس کا ذکر مترجم نے کتاب کے تعارف میں کیا ہے۔

بطور قاری ..... ایک ترجمہ کی گئی تحریر ہمیں دوہری سطح پر لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر سطح..... محض ایک سطح نہیں ہوتی..... بلکہ پرت در پرت بھی ہو سکتی ہے۔ ہر پڑھنے والا اپنے تخیل کی پرواز سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کم اونچی..... نیچی..... بہت اونچی..... ہموار..... بالکل زندگی کے تجربے کی طرح!

اپنا اپنا.....!

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

م۔ح

میں تقریباً بیس سال سے شعاع، خواتین کی خاموش قاری ہوں۔ میں نے ایک دو بار خط لکھا، لیکن آپ نے ردی کی نذر کر دیا۔ اس کے بعد دل ٹوٹ گیا اور پھر کبھی نہیں لکھا۔ کئی تحریریں ایسی بھی پڑھیں، دل چاہا فوراً تبصرہ کیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر نہ لکھا کہ ہمیں رسالہ لیٹ ملا ہے تو تبصرہ بھی لیٹ ہی ہو جائے گا۔ ہم ایک چک میں رہتے ہیں۔ آج شعاع پڑھتے ہوئے ایک سلسلہ نظروں سے گزرا تو فوراً قلم اٹھالیا۔ آپ نے پوچھا شادی سے پہلے اور شادی کے حالات۔ جس پر لکھنے بیٹھوں تو کئی صفحے کالے ہو جائیں۔

س: شادی کب ہوئی؟

ج: میری شادی 2007ء میں ہوئی۔ شادی سے پہلے ایک بے فکر زندگی تھی۔ لگتا تھا کہ شادی کے بعد بھی یوں ہی چلے گا۔ منگنی ایک ماہ رہی اور ان لوگوں نے زور ڈالنا شروع کر دیا کہ فوراً شادی کر دیں، ابا جان نے کہا کہ بیٹیاں جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں، اچھا ہوتا ہے سو ڈیٹ فکس ہو گئی۔

شادی سے پہلے میں نے سسرال والوں کے بارے میں یہ اندازہ لگایا کہ سیدھے سادے سے لوگ ہیں، چلے گا۔ امی نے بتایا تھا کہ یہ لوگ آبادی سے ہٹ کے ایک ڈیرے پر رہتے ہیں اور شہر میں بھی لڑکے کا گھر ہے۔ وہ تو بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ لڑکا نہیں مرد تھا اور وہ بھی گنجا۔ کیونکہ نکاح کے بعد جب دولہا اندر آیا تو لوگ کہہ رہے تھے، ہائے دولہا نے وگ لگا رکھی ہے۔'' شادی سے پہلے جب بھی امی لوگ گئے، اس نے کیپ پہن رکھی ہوتی تھی اور امی لوگوں کا دھیان بالوں کی طرف نہ گیا۔ اکثر عورتیں مجھے آ کر کہہ رہی تھیں کہ پورا مرد ہے، تم سے عمر میں کافی بڑا۔ اور لگتا ہے کہ جو وہ چوڑیاں لائے ہیں، وہ آرٹیفشل ہیں۔ کئی ایک کہتیں کہ پڑھی لکھی لڑکی اجڈوں میں دے دی۔

میں شادی سے پہلے ایک اسکول میں جاب کرتی تھی جو کہ شادی کے بعد میاں نے کرنے نہ دی۔ ان لوگوں نے اپنے مہمانوں کو بھی اس میرج ہال کا پتا دے رکھا تھا جو کہ ہم نے بارات کے لیے بک کروایا تھا۔ وہ تو بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے گھر میں کچھ نہیں پکایا تھا۔ یہ ہم سے پہلے بارات لے کر ہال پہنچے ہوئے تھے اور ہمارے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، لوگ تب ہم سے پوچھ رہے تھے کہ کھانا ان کی طرف سے ہے حالانکہ کھانا ہماری طرف سے تھا جو کہ اضافی بل کے ساتھ ہم نے کھلایا۔

بھائی میرے اس وقت چھوٹے تھے اور پڑھ رہے تھے۔ ہم بہنیں بڑی ہیں، ایک کی شادی لاہور میں ہوئی اور دوسری کی پنڈی رشتہ داروں میں اور میری ایک ڈیرہ پر۔ خیر رخصتی ہو گئی جب میں ڈیرہ پہنچی تو ان کے گھر میں شادی کے کوئی آثار نہ تھے۔ مجھے رسم کے لیے ایک جائے نماز پر بٹھایا گیا جو کہ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی پھر مجھے میرے کمرے میں لے گئے جو کہ کہیں سے بھی دلہن کا نہ لگ رہا تھا۔ ایک پرانا سائیڈ بیڈ اور دو پرانی سی کرسیاں البتہ بیڈ شیٹ نئی تھی جو کہ دوسرے دن میری نند نے یہ کہہ کر اتار لی کہ میرے جہیز کی ہے۔ میرا سامان جو جہیز کا تھا، وہ شہر والے گھر میں امی نے رکھوایا تھا کہ میری بیٹی جنگل میں نہیں رہ سکتی (امی نے یہ نہ سوچا کہ جنگلیوں میں رہ سکتی ہے)۔

ان کے گھر میں اتنی کھیاں تھیں، اللہ جانے کہاں سے آئیں۔ ابھی بھی ہیں۔ ہاں تو کمرے میں جا کر بیٹھ گئی اور کچھ دیر بعد میری نائن نے کہا کہ مجھے

pklibrary.com

چائے پینی ہے۔ (ہمارے ہاں رواج ہے کہ دلہن اگر اجنبی لوگوں میں جارہی ہو تو نائن کو ساتھ بھیجتے ہیں، اس کے لیے چائے آئی تو میرے لیے بھی آئی۔ ساتھ میں دولہا بھی آیا جو کہ میں نے پہلی بار دیکھا، کیپ پہن کے۔ شاید وگ اتار دی تھی، گرمی جو تھی۔ سلام کیا۔ بیٹھ کے چائے پی اور چلا گیا۔ ان کی کچھ رشتہ دار خواتین آئیں مجھے دیکھنے اور جاتے ہوئے آپس میں تبصرہ کیا کہ زیادہ دن نہیں رہنے والی، چلک کی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مجھے واش روم جانا ہے تو میری نند نے کہا، آ میں تجھے لے جاتی ہوں۔ میں نے کہا کہ کہاں۔ کہنے لگی کہ حویلی سے باہر نلکا ہے (ہینڈ پمپ) میں نے کہا کہ لیکن مجھے تو ٹوائلٹ جانا ہے۔ کہنے لگی کہ وہ ہے تو سہی لیکن ہم اس میں مرغیاں بند کرتے ہیں اور ابھی بھی اس میں مرغیاں ہیں۔ وہ مجھے لے کر چلی تو راستے میں پڑی ہوئی لکڑیاں بھی میرے لہنگے کے ساتھ اٹک گئیں جو کہ بڑی مشکل سے الگ کیں۔

واپس آ کر میں نے اپنا زیور اتارا اور پھر ڈریس بھی چینج کرلیا۔ میری جٹھانی کہنے لگی۔ ہائے، ابھی بھائی نے آنا ہے۔ میں نے سوچا کہ جو شخص چپ کر کے چائے پی کے جاچکا، یہ تک نہ پوچھا کہ تم کیوں نہیں پی رہیں، اس نے میری کیا تعریف کرنی۔ خواہ مخواہ گرمی میں بندہ ذلیل ہو۔ میں نے کہا کہ میرے سر میں درد ہے، مجھے سونا ہے۔ آپ لوگ جائیں، وہ چلی گئی ادھر وہ نکلی ادھر دولہا صاحب اندر آئے، نہ سلام نہ دعا۔ جارحانہ انداز میں اپنا حق وصول کیا اور مزے سے خراٹے لینے لگے۔

ہائے ایسی ہوتی ہے سہاگ رات، جس پر شاعروں اور ادیبوں نے پورے دیوان لکھ ڈالے۔ میں نے پوری رات اور اگلا دن رو کر گزارا۔ میرے خواب ہر کونے میں کھڑے سسک رہے تھے۔ میں نہانے کے لیے اسی نل پہ گئی تو سانپ کی پھنکار جیسی آواز آئی تو میں نے اپنی نائن سے پوچھا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ وہ کہنے لگی کہ بھینسوں کا باڑہ ہے، تم چپ کر کے نہاؤ اور آؤ، ابھی اندھیرا تھا۔

جب میں گھر واپس گئی تو بیس دن واپس نہ آئی۔ لوگ امی سے پوچھتے کہ یہ واپس کیوں نہیں جارہی۔ میں اپنے شوہر کو واپس بھیج دیتی، جب بھی وہ مجھے لینے آتے۔ آخر ایک دن امی نے مجھے واپس بھیج دیا، جب میں آئی تو میری ساسو ماں کہنے لگی کہ لو جی ہم نے خود جانا تھا تمہیں لینے اور تمہارے میکے والوں کے کپڑے لینے تھے، اب تم اپنے جہیز سے ہمیں کپڑے دینا جو کہ میں نے دیے۔

اس دن ہی میری نند نے مجھے کام پر لگا دیا، کہنے لگی یہ روٹیاں بنا۔ میں نے آگ جلا کر روٹیاں بنانا شروع کردیں۔ کھانے والے کہنے لگے کہ تیری روٹی کا ہمارا ایک نوالہ بنتا ہے، اتنی ہلکی روٹی، بڑا پیڑا بنا اور بڑی روٹی پکا۔ ایک نئی مشکل، پھر میں بڑی اور موٹی روٹیاں پکانے لگی۔ میں روز سبزی بناتی، جب پکانے لگتی تو اقبال کہتی (میری نند کا نام اقبال ہے) تم کبھی زیادہ ڈالتی ہو ہٹ کوٹی میں پکاتی ہوں کونی ہانڈی کو کہتے ہیں۔

ایک دن میری ساس کہنے لگیں کہ تم مولی کوٹ کے چٹنی بنالو، میں نے کہا کہ مولی کو ہم یا تو کاٹتے ہیں یا پراٹھے بناتے ہیں۔ یہ کوٹ کر کیسے بنتی ہے۔ وہ کہنے لگی ـــــ جا بل بٹا اٹھا لا اور کوٹ۔ جب میں کوٹنے لگی تو وہ بٹے کے نیچے سے اڑ گئی (ہاہاہا)۔ کیا مذاق بنا میرا۔

حویلی کے ایک کونے میں چولہا تھا مٹی کا اس میں ادھر اُدھر راکھ بکھری رہتی اور اقبال بی بی کام کیے جاتیں اور جہاں چوزے اور مرغیاں اور بڑے بڑے ٹوکرے جن کے نیچے میرے دیور کے لڑائی والے مرغے بند ہوتے، ایک دن میں نے جھاڑو لگا کر چولہا صاف کیا اور مرغیوں کو باہر نکال کر دروازہ بند کردیا تو اقبال نے کھول دیا کہ باہر مرغیوں کو گیدڑ کھا جاتے ہیں۔ نمک انہوں نے یوں ہی پتھر کی شکل میں رکھا ہوتا، جب ضرورت پڑتی، تھوڑا سا لے کر کوٹ لیتے

pklibrary.com

اور ہانڈی میں ڈال لیتے اور شاپر میں باقی مسالے رکھے ہوتے۔

جہاں میں سوتی تھی، ایک دن میں نے اوپر دیکھا تو چمگادڑ چمٹی ہوئی تھی۔ میں ڈر گئی تو میری نند کہنے لگی، سوجا کچھ نہیں کہتی۔ بعد میں ایک دن باتوں میں ذکر نکل آیا چمگادڑ کا تو میری پنڈی والی بہن کہنے لگی کہ اس میں برکت ہوتی ہے اور تیرے کمرے میں ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا دھاڑیاں بھی ہوئی ہیں۔ رات کو بھینس سینگ رگڑتی تو میں سمجھتی کہ کوئی چور ہے۔ ایک دن یہ گتھی بھی سلجھ گئی کہ وہ بھینس کے سینگ رگڑنے کی آواز ہے۔

لکڑیاں جلا کر کھانا پکانا اور جب میں اپنے طریقے سے پکاتی تو سو سو نام رکھے جاتے۔ آخر میں نے کہا کہ مجھے یہاں نہیں رہنا، نہ آپ لوگوں کا واش روم، نہ نماز، نہ روزہ، نہ پاکی کا پتا نہ ناپاکی کا۔ میں حافظوں کی بیٹی۔ تعلیم ہمارے گھر کی لونڈی۔

رمضان شریف میں جمعہ کے دن ہمارے گھر میں پورا محلہ جمع ہوتا ہے۔ شادی کے دس دن بعد رمضان شروع ہوگیا تھا، پورے ڈیرہ پر ایک میرا روزہ ہوتا۔ نماز پڑھتی۔ میری ساس کہتی کہ دکھاوے کی ہیں۔ جمعتہ الوداع آیا تو انہیں پتا ہی نہیں، مجھے اپنا گھر یاد آگیا کہ کیسے ہمارے گھر میں اہتمام ہوتا تھا جمعہ کا۔ میاں کا الگ منہ بنا رہتا، چھوٹی سی بات پر چار چار دن بولنا چھوڑ دیتے۔ سمجھ میں نہ آتا، بات کیا ہوئی۔ آخر ایک سال یوں ہی گزر گیا۔

پھر میاں جی اس شرط پر مجھے شہر لے آئے کہ میرے بھائیوں کے بچوں کو رکھنا ہے، پھر میں نے انہیں چار سال رکھا۔ ساتھ میں میرے بھی دو بچے ہوئے۔ ہر ایک کی پیدائش پر روٹھ کر ڈیرے چلا جاتا میرا میاں۔ وقت پر کھانا نہ ملے تو نہیں کھانا، کپڑے تیار نہ ہوں تو ناراضی، جوتا صاف نہ ہو تو ناراضی۔ ضدی اتنا کہ اپنی ہر بات پر اڑ جانا۔

شروع شروع میں چوری چھپے رسالے پڑھتی، میکے سے اٹھا لاتی۔ شعاع میں ایک بہن نے لکھا تھا کہ جب میرا میاں چلا جاتا ہے تو کھل کر سانس لیتی ہوں۔ وہ ہی حال میرا بھی تھا۔ زندگی میں کئی موقعے ایسے آئے کہ میرا بھائی مجھے لینے آیا لیکن شعاع میں پڑھی ہوئی اسٹوریز کی وجہ سے نہ گئی۔ میرے میاں بینک میں جاب کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہے ہیں۔ چھ ماہ سے رسالہ خود لا کر دیتے ہیں اور پیارے پیارے نئے نئے کی پیاری باتیں پڑھتے ہیں۔

دو ماہ پہلے ہم دونوں عمرہ کرکے آئے ہیں۔ میرے سسر کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ ہمارے شہر آنے کے بعد وہ بھی میرے ساتھ ہی آئے تھے، سال بعد اللہ کو پیارے ہوگئے اور ایک سال بعد ساس بھی اللہ کے پاس چلی گئیں۔ نند، دیور کی شادی ہوگئی۔ سکندر کے چکر ڈیرہ پر کم ہوگئے۔ میرے میاں کا نام سکندر ہے۔ میری دعائیں رنگ لائیں۔ اب نماز بھی پڑھتے ہیں جو بچے میرے پاس رہے، وہ اب روزے بھی رکھ رہے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔

ایک بات ہر ماں باپ کے لیے کہ ماحول ضرور دیکھیں۔ جب بھی بیٹی کا رشتہ کرنے لگیں اور یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتی ہوں کہ نصیب کا لکھا ایسا ہوتا یا کچھ ماں باپ کا بھی قصور ہوتا ہے؟ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا شعاع میں۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بچوں کے لیے خوب صورت ناول

فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

قیمت 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ح۔ع۔ص

س ''شادی کب ہوئی؟''

ج ''2000ء میں شادی ہوئی۔''

س ''شادی سے پہلے کے مشاغل؟''

ج ''دینی تعلیم حاصل کرتی تھی قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر پڑھتی تھی۔''

س ''رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی؟''

ج ''والدین کا فیصلہ تھا ہماری کوئی مرضی نہیں تھی۔''

س ''منگنی کتنا عرصہ رہی؟ فون پر بات چیت ہوتی تھی؟''

ج ''دو مہینے منگنی رہی۔ دینی ماحول تھا۔ بات چیت کی اجازت نہیں تھی۔''

س ''ذہن میں جیون ساتھی کے متعلق تصور میں کیا خوبیاں آپ دیکھنا چاہتی تھیں؟''

ج ''نیک ہوں، دین دار ہوں، دین سے ان کا تعلق ہو۔ کیونکہ میکے میں یہی ماحول تھا۔''

س ''شادی سے پہلے سسرال والوں کے متعلق کیا خیالات تھے؟''

ج ''شادی سے پہلے ہی سنا گیا تھا انتہائی مذہبی گھرانہ ہے سسر صاحب مولانا تھے۔''

س ''شادی کے لیے کن چیزوں کی قربانی دی؟''

ج ''والدین کی جدائی برداشت کی ملتان سے کراچی چلے گئے شادی کے ساتویں دن بعد۔''

س ''شادی خیریت سے انجام پائی، یا رسموں پر کوئی جھگڑا؟''

ج ''دینی ماحول تھا کوئی رسم ہوئی ہی نہیں۔ شادی گھر پر ہوئی۔ ولیمہ بھی گھر پر ہوا۔''

س ''شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟''

ج ''سب سے پہلے انہوں نے کہا مجھے قرآن سناؤ کیونکہ وہ خود مفتی صاحب ہیں۔''

س ''شادی سے زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟''

ج ''پردیس میں رہنا پڑا۔ چھوٹی عمر تھی۔ گھر داری کا تجربہ سیکھا۔''

س ''شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟''

ج ''شادی کے ساتویں دن کراچی شفٹ ہوئے ایک نند اور پھپھو ساس ساتھ گئیں مہینے کے بعد وہ واپس آ گئیں پھر گھر کا کام شروع کر دیا۔''

س ''میکے اور سسرال کے کھانوں اور پکانے کے انداز میں فرق محسوس ہوا؟''

ج ''چھوٹی عمر میں شادی ہوئی کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا۔ خود ہی پکانا سیکھا، سسرال میں رہی ہی نہیں فرق کا کیا پتا چلتا۔''

س ''سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی، کن پر تعریف؟''

ج ''ویسے سسرال میں رہی کم ہوں۔ ادب تہذیب بڑوں کی عزت کرنے پر تعریف ہوتی تھی۔ تنقید ہوتی تھی کہ بولتی کم ہے۔''

س ''سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟ خاندانی امور میں آپ کی رائے لی جاتی؟''

ج ''سسرال میں عزت مقام تو الحمدللہ ملا لیکن میں چھوٹی بہت تھی سولہ سال کی بچی سے کیا رائے لی جاتی؟''

س ''سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟''

ج ''بے شک توقعات پوری ہوئیں۔ اچھا گھرانہ تھا۔ سلجھے ہوئے لوگ تھے۔''

pklibrary.com

pklibrary.com

س ''بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑا امتحان ہوتا ہے خصوصاً پہلا بچہ۔ آپ کو کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑا؟''

ج ''سال بعد اللہ تعالیٰ نے چاندسی بیٹی دی میں ملتان اپنے سسرال میں آ گئی۔ ساس امی بہت اچھی تھیں۔ یکجی بنا کر دیتیں۔ دو دو نوکرانیاں انہوں نے میری خدمت کے لیے رکھیں۔ جٹھانیاں آ کر میری بچی کی مالش کرتیں اسے نہلاتیں، بہت بہناپے والا ماحول تھا۔''

س ''آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟''

ج ''جوائنٹ فیملی بے حد پسند ہے کسی کو کوئی مسئلہ ہو سب اکٹھے ہو جاتے ہیں، دکھ سکھ میں ساتھ دیتے ہیں۔''

س ''آپ نے سسرال کا ماحول بدلنے کی کوشش کی، بہتر بنانا چاہا؟''

ج ''کم عمری میں شادی ہوئی۔ سسرال کا ماحول انتہائی اچھا اور خوشگوار تھا بلکہ میں نے خود اس ماحول میں آ کر بہت کچھ سیکھا۔ سسر صاحب قاری، حافظ قرآن۔ امام مسجد اور نکاح خواں تھے، بہت نیک فطرت والے تھے، ساس بھی عادتاً بہت اچھی تھیں ان کی چھ بہوئیں تھیں انہیں بیٹیوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ بچوں کی لڑائی پر کوئی نہیں بولتا تھا بچے پھر خود ہی شیر و شکر ہو جاتے تھے۔''

☆

کوئی تہوار ہو، کوئی تفریح ہو یا مل بیٹھنے کا کوئی موقع، طرح طرح کے مزے دار کھانوں کے بغیر ہر خوشی ادھوری رہتی ہے۔ گھر کا کچن آباد ہو تو سب کے دل شاد ہوتے ہیں۔ کچن میں رونق ہو تو چہروں پر بھی رونق نظر آتی ہے۔

عید الاضحیٰ پر گھر میں گوشت وافر ہوتا ہے۔ اس لیے سب کو اپنا اپنا ہنر دکھانے، اپنی پسندیدہ چیزیں بنانے کا موقع ملتا ہے۔ گوشت پکانے کی نت نئی ترکیبیں آزمائی جاتی ہیں۔ کم یا زیادہ ہر گھر میں تہوار کے موقع پر خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

اس بار ہم نے اسی حوالے سے سروے کیا ہے۔

سوالات یہ ہیں:۔

(1) پچھلے سال عید الاضحیٰ کے موقع پر ملک کرونا کی زد میں تھا۔ آپ نے عید کیسے منائی؟ کیا روایتی دعوتیں اور اہتمام کیا تھا؟

(2) گوشت سے بنی آپ کی پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟ اپنی پسندیدہ ڈش خود بناتی ہیں یا گھر میں امی اور بہنوں سے فرمائش کر کے بنواتی ہیں؟

(3) اپنی پسندیدہ ڈش کی ترکیب لکھیں؟

آیئے دیکھتے ہیں، ہماری قارئین نے ان سوالوں کے کیا جواب دیے ہیں۔

عید قرباں اور آپ

ادارہ

تسنیم کوثر.....کراچی

(1) آپ کی یہ بات کہ کرونا کی موجودگی میں پچھلی دفعہ عید الاضحیٰ کیا روایتی انداز میں منائی تو جناب عرض ہے کہ ہم نے مکمل SOP کے ساتھ عید کی خوشیوں کو برقرار رکھا، وہ اس طرح کہ ہم نے سوچا ہمیشہ ہی عید پر مہمان آتے اور دعوتیں بھی ہوتی ہیں تو کیوں نہ کچھ نیا ہو جائے تو وہ اس طرح کیا کہ ہم نے بریانی، قورمہ، کیجی تیار کی جیسے ہر سال ہی خاص طور پر عید کی دعوتوں میں ہوتا ہے فرق صرف اتنا تھا کہ ہم نے مہمانوں کو بلانے کے بجائے گوشت کے پیکٹ کے ساتھ کھانے کے پیکٹ بھی بنا کر ان کے گھر ڈیلیور کروائے اور جناب کھانے کی محفل واٹس ایپ پر کال کے ساتھ سجی۔ کچھ وہ لوگ اچھی طرح سے تیار شیار ہو کر بیٹھے۔ کچھ ہم تیار ہوئے اور اس طرح سے واٹس ایپ کے ذریعے عید کی دعوت اور خوشیاں مکمل ایس او پی کے ساتھ منائیں۔ ان شاء اللہ اس بار بھی یہی ارادہ ہے اب آپ بتایئے کیسی لگی آپ کو ہماری عید کی دعوت۔

(2) دوسرے سوال کے جواب میں ہمیں گوشت سے بنی بھنی ہوئی کڑاہی بہت پسند ہے جو کہ میں خود گھر کے مسالوں سے بے حد لذیذ بناتی ہوں اور یہ کہ ہمارے گھر کی دعوتوں میں لازمی شامل ہوتی ہے۔

(3) تیسرے سوال کا جواب کچھ یوں ہے کہ ہم اپنی پسندیدہ ڈش کی کیا ترکیب لکھیں ہمیں تو اللہ کی نعمتیں سب ہی اچھی لگتی ہیں، ہاں مگر کبھی آپ ہمارے گھر تشریف لائیں تو آپ کو ہم اپنی پسندیدہ چیزیں بنا کر کھلائیں گے اور آپ کے پسند آنے پر ترکیب بھی لکھ دیں گے۔ تو پھر کیا خیال ہے آپ کا.....؟

(نیک خیال ہے تسنیم! اب آپ کے ہاتھ کی بنی کڑاہی کھا کر فیصلہ کریں گے کہ آپ کیسی بناتی ہیں)

pklibrary.com

سلمٰی مسرت.....راولپنڈی

(1) پچھلے سال بھی الحمدللہ قربانی کا اہتمام ہوا، کرونا کی وجہ سے منڈی جانے سے میرے شوہر اور بچے گھبرا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ایسا سبب بنایا کہ میرے چھوٹے بہنوئی امجد نے اپنے گاؤں سے بڑے خوب صورت بکرے خریدے ملکوال سے جو ایک دن پہلے ہمارے گھر آ گئے۔ البتہ اس سال قربانی میری بہن نے اپنے گھر میں اور ہم نے اپنے گھر میں کی۔ ایک دوسرے کی دعوت بھی نہیں کی۔ البتہ سکون سے گوشت کی تقسیم کی۔ گرمی کی وجہ سے حصے بنا کر فرج میں رکھ لیے تھے۔ دو تین دن لگا کر سب کے گھر پہنچا دیے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ البتہ تیسرے چوتھے دن کچھ دوستوں کی دعوت کا اہتمام کرنا ہے کیونکہ اس بار ہم میاں بیوی نے اور بچوں نے ویکسین بھی لگوائی ہے اور الحمدللہ حالات بھی کنٹرول میں ہیں۔

(2) میری پسندیدہ ڈش مٹن کا پلاؤ اور بیف کے چپلی کباب ہیں جو کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر تازہ گوشت کے بنتے ہیں۔ ہر سال پہلے روز امی کے ہاتھ کا پلاؤ کھانے کی عادت تھی، 22 جون کو میری والدہ کی برسی ہے۔ یہ تیسری عید ہے جو امی ابو کے بغیر آ رہی ہے۔ اب تو فرائض رہ گئے ہیں۔ پہلے دن اپنے بچوں کو کلیجی اور پلاؤ بنا کر کھلاؤں گی۔ دوسرے دن اپنی بہن اور بھانجوں کی دعوت کا ارادہ ہے۔ اس عید پر ان شاء اللہ اپنے اکلوتے داماد اس کے گھر والوں کی دعوت بھی کرنی ہے میری اکلوتی بیٹی آمنہ کی اس رمضان میں دعائے خیر ہو گئی ہے۔ ان شاء اللہ سال کے اختتام پر شادی بھی ہو جائے گی۔

(3) پسندیدہ ڈش مٹن پلاؤ ہے۔ بیف کا پلاؤ بھی بہت شان دار بنتا ہے، بیف کے پلاؤ میں آپ تمام ہڈیوں کی پہلے یخنی نکال لیں۔ ہلکی آنچ پر دیگچے میں تھوڑا سا نمک سفید زیرہ اور کالی مرچ ڈال کر ہڈیوں والا گوشت رکھ دیں ساتھ ساتھ گوشت کی تقسیم اور کچن کے کام کرتی جائیں۔ زیادہ یخنی ہو تو تھوڑی سی فریزر میں محفوظ کر لیں۔ باقی چاولوں کی وہی ترکیب ہے۔ پانی کی جگہ یخنی کو کاؤنٹ کر لیں۔ بہترین پلاؤ ہو گا اور بیف کے گوشت کو گلنے میں تھوڑا ٹائم لگتا ہے اس لیے اسے پہلے مسالے میں فرائی کر کے گلا لیں پھر چاولوں کا پانی ڈال کر چاول بنا لیں۔

ارم کمال.....فیصل آباد

(1) پچھلے سال تو ساری دنیا میں جیسے قیامت ہی آ گئی تھی۔ سب کی سانسیں گویا اٹک سی گئی تھیں۔ انسان ہنسنا، بولنا، سوچنا، یکدم بھول سا گیا تھا۔ ذہنوں پر، سوچوں پر ایک

خوف، دہشت سی طاری تھی کہ اب کیا ہوگا؟ اپنے پیاروں سے ہم ڈرنے لگے تھے۔ بچوں کو گود میں اٹھانے اور پیار کرنے سے کترانے لگے تھے کسی کو ہلکی سی کھانسی اور نزلہ ہو جاتا تو لگتا ملک الموت دستک دے رہا ہے۔

عیدالاضحیٰ بھی ان ہی دنوں آئی۔ روایتی جوش وخروش سب ختم تھا۔ خوشی کی کوئی امنگ، ترنگ نہیں تھی، ان ہی دنوں میرے چچا بھی کرونا کا شکار ہوئے بہت کوشش کی لیکن کچھ کارگر نہ ہوا اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

کرونا نے سب کے مالی معاملات کو بھی بے حد زک پہنچائی۔ اس لیے گائے میں حصہ ڈال لیا۔ چاند رات کو گھر صاف ستھرا کیا۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ تیار کر کے رکھا، مسالہ جات منگوا کر رکھے۔ عید کی صبح ناشتے میں لذیذ کھیر بنائی، کپڑے استری کیے اور ماسک، سینی ٹائزر منگوا کر رکھے۔ نماز فجر ادا کر کے دعا کی یا اللہ یہ کرونا کا عذاب جلد ختم کردے تاکہ زندگی کی خوب صورتیاں بحال ہوسکیں۔

اس کے بعد میاں صاحب اور بیٹے کو ناشتہ کروا کر عید کی نماز کے لیے بھیجا، ماسک پہنوائے، ہاتھ سینی ٹائز کروائے، بار بار تلقین کروائی کسی سے گلے نہ ملنا اور نہ ہی ہاتھ ملانا ہے۔"

"امی کسی نے ہاتھ آگے کیا تو میں کیا کروں گا۔" احمد نے الجھن سے کہا۔

"اول تو کوئی نہیں کرے گا۔ لیکن اگر کرے تو کہہ دینا کرونا ہے تو آپ بھی احتیاط کریں اور میں بھی کروں۔" نماز پڑھ کر جب میاں صاحب اور بیٹا واپس آئے تو فوراً پوچھا۔ کسی سے گلے تو نہیں ملے، ہاتھ تو نہیں ملایا نا۔

دونوں کو کہا فوراً باتھ روم جائیں نہائیں اور کپڑے بدلیں۔

دوپہر تک ہمارا حصہ جو گائے میں بنتا تھا آ گیا۔ ہاتھوں میں دستانے پہن کر میں نے ان رشتے داروں اور محلے والوں کے شاپر بنائے۔ جن کے گھروں میں قربانی نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب جا کر فٹافٹ دے آئے۔ سب کو دروازے سے ہی شاپر پکڑائے کسی کے گھر کے اندر نہیں گئے۔ واپس آئے تو دوبارہ ان کو کہا چلیں نہائیں اور کپڑے بدلیں۔

"یار میں تو صبح سے کپڑے بدل بدل کر تنگ آ گیا ہوں۔" میاں صاحب بے حد جھنجھلائے ہوئے تھے۔

"دیکھیں! احتیاط ہی کرونا کا واحد علاج ہے۔" اس وقت تو کرونا کی ویکسین بھی نہیں آئی تھی۔ "اب میں اور کہیں نہیں جاؤں گا۔ اچھا ٹھیک ہے آپ کپڑے چینج کر کے آرام کریں میں کھانا لگاتی ہوں۔"

دوپہر کو میں نے قیمے کی نکیاں اور چکن پلاؤ اور رائتہ بنایا، کھانا کھا کر سب ہی تھکے ہوئے تھے، سو گئے۔

شام کو باقی رشتے داروں کو فون کالز کیں، رات کو میں نے نہاری بنائی اور تھوڑا سا بوائل گوشت۔ نہ کسی کے گھر دعوت کا سوال تھا نہ کسی کو اپنے گھر بلانے کا یارا۔

"امی! یہ کیسی عید ہے؟" طیبہ (بیٹی) نے کہا۔

"بس بیٹا دعا کرو اللہ تعالیٰ جلد از جلد کرونا کا یہ عذاب ہم سب پر سے ٹال دے۔" رات گئے تک سب کو ڈیو کال کر کے تھوڑا فریش ہوئے اور تسلی دلاسے دیتے رہے۔ بچوں کے ساتھ فاصلے سے تصویریں کھنچوائیں۔ اپنی اپنی سیلفیاں لیں یوں یہ عید گو روایتی تو نہیں تھی مگر پھر بھی عید تو عید ہی ہوتی ہے۔

(2) مجھے تو گوشت پسند نہیں۔ لیکن میں قیمہ شوق سے کھاتی ہوں۔ قیمے کی نکیاں ہوں یا بھنا قیمہ بچوں کو قیمے کے سیخ کباب باربی کیو کر کے دیتی ہوں۔ شادی سے پہلے امی سے فرمائش کر کے پکواتی تھی لیکن اب اپنی فرمائش یاد ہی نہیں جو میاں صاحب اور بچوں کی فرمائش وہی میری، ویسے بھی دو، دو ہنڈیا پکانا اس گرمی میں بہت مشکل ہے۔

(3) پسندیدہ ڈش جو مجھ سے فرمائش کر کے پکوائی جاتی ہے۔ اس کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔

بادامی قورمہ

اشیاء:	
گوشت	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
ادرک	ایک چھوٹا ٹکڑا
سبز الائچی	چار عدد (پسی ہوئی)
بادام میٹھے	دس عدد
نمک مرچ	حسب ذائقہ
لہسن	آدھا جوا
تیل	آدھ پاؤ

گرم مسالا آدھا چمچ (پسا ہوا)
دہی ایک پیالی

ترکیب:

باداموں کی گریاں نکال کر انہیں پانی میں ملا کر پیس لیں۔ الائچی بھی پیس لیں، تیل میں پیاز سنہری کرنے کے بعد گوشت ڈال کر تل لیں۔ چند منٹ بعد لہسن کے جوئے اور ادرک باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ بھوننے کا عمل اس وقت تک جاری رکھیں جب تک ہنڈیا میں سے چکنائی کی خوشبو آنے لگے پھر نمک، مرچ اور مسالہ ڈال کر بھونیں اور دہی ڈال دیں دہی کا پانی خشک ہو جائے تو بقیہ پیاز ڈال دیں تھوڑا سا پانی ڈال کر پانچ منٹ مزید بھونیں پسی الائچی اور پسے بادام ڈال کر پانچ منٹ دم پر رکھ کر اتار لیں چاہیں تو ہرا دھنیا اور پودینے کے چند پتوں سے گارنشنگ کر لیں۔ بہت مزیدار بنے گا۔ آزمائش شرط ہے۔

زرینہ خانم لغاری..... مظفر گڑھ

(1) کرونا کی زد میں تو عید الفطر بھی تھی۔ ہم پاکستانی قوم بہت زندہ دل لوگ ہیں۔ 65ء کی جنگ میں جب گولہ باری ہو رہی ہوتی۔ فضا میں پاکستانی طیارے بھارتی طیاروں کی درگت بنا رہے ہوتے تھے۔ حکومت کا سخت حکم تھا کہ خندقوں میں چلے جائیں لیکن زندہ دلان لاہور اپنی چھتوں پر چڑھ کر فائٹنگ دیکھ رہے ہوتے تھے۔ کرونا کم بخت نے جو تباہی مچائی ہوئی تھی لیکن ہم لوگ ہار ماننے والے نہیں تھے۔ عید الفطر پر گھروں میں تو خوب ہلا گلا کیا لیکن پارکوں وغیرہ میں جانے پر پابندی تھی، اسی لیے گلی محلوں میں گہما گہمی نظر نہ آئی۔

عید الاضحیٰ کا آدھا دن تو ویسے ہی خاتون خانہ کا گوشت کے پیکٹ بنانے میں گزر جاتا ہے۔ عزیزوں، رشتہ داروں، غریب غربا کے علیحدہ علیحدہ حصے کیے جاتے ہیں۔ ہم نے بھی خوب قربانی کی۔ چار بکرے، قصائی صاحب صبح صبح آ کر ذبح کر گئے۔ ہم نے گوشت کی چھانٹی کی۔ اچھے سے کپڑے پہنے۔ خوب گوشت بھون کر کھائی۔ رشتہ داروں میں پیکٹ بھیجے۔ البتہ پچھلی عیدوں کی طرح سیر سپاٹے سے پرہیز کیا۔

(2) آہ، کیا یاد کروا دیا آپ نے۔ امی کے ہاتھوں کی ڈش تو مدتوں ہوئی ملک عدم سدھار گئیں۔ بہنیں آنگن کی چڑیاں اڑا اڑا کر اپنے سسرال جا بسیں۔ عید والے دن تو اچھا سا گوشت چھانٹ کا قورمہ بنا لیتی ہوں، البتہ عید کے دوسرے دن شامی کباب اور کوفتے بناتی ہوں۔

بکری کے سری پائے بنانے کی ترکیب حاضر ہے۔

بکری کے سری اور پائے کو آگ پر بھون کر بال اتار لیے جائیں، ویسے اس دن بھوننے والے کی عارضی دکان کھول کر سریاں پائے بھون رہے ہوتے ہیں، ان سے بھنوا لیا کریں۔ پھر ان کی بوٹیاں بنا کر، خوب دھو کر، پانی ڈال کر چڑھا دیں۔ خوب سارا لہسن اور خشک دھنیا، نمک، ہلدی، مرچ ڈال دیں، اسے گلا لیں۔ جب گل جائے تو فرائی پین میں پیاز بادامی کر کے ڈال دیں۔ یہ گوشت چونکہ پہلے ہی آگ پر بھونا جا چکا ہوتا ہے، اس لیے یہ بھنائی کا نخرہ نہیں مانگتا۔

افصیٰ ماہ نور ہراج..... داؤد والا، تلمبہ

(1) پچھلے سال ملک کرونا کی وبا کی زد میں تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن ہمارے گاؤں میں کرونا اللہ کا شکر ہے، کسی کو نہیں ہوا۔ اس دہلانے جہاں ہمیں شدید خوف اور وہم کا شکار کیا، وہیں پر کبھی کبھی ہمارے لبوں پر مسکراہٹ بھی بکھیری۔ کرونا کی وبا نے ہمارے بزرگ حضرات کا خوب امتحان لیا۔ کبھی کسی نئے شہر جانا ہوتا یا کہیں پر تو ماسک لگانے کی سختی کی وجہ سے وہ ہمیشہ ماسک کا نام بھول جاتے۔ کبھی کوئی مساگ کہتا اور کبھی کوئی مسواک اور کچھ تو حد کر دیتے، ماسک کو منہ والا بچہ کہتے ہیں اور کرونا کو کرینا۔ دیہاتوں میں کرونا کی وجہ سے کوئی خاص تبدیلی نہ تھی۔ عید ویسے ہی منائی گئی، جیسے پہلے مناتے تھے۔

عید والے دن ہمارے گھر میں کافی مہمان آتے ہیں۔ اس وجہ سے عید سارا دن کچن میں گزرتا ہے۔

دعوتوں کا اہتمام عید والے دن نہیں، عید کے دوسرے دن ننھیال میں دعوت ہوتی ہے سب کی۔ سب ماموں وغیرہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ بہت مزا آتا ہے۔ لاہور والے ماموں بھی، ملتان والے بھی۔ ساری کزنز ہم مل جاتی ہیں۔

(2) گوشت سے بنی ہوئی میری پسندیدہ ڈش بھنا ہوا گوشت ہے۔ لیکن عید والے دن میں اپنی بڑی بہن الفت

زہرہ ہراج سے فرمائش کر کے کلیجی بنواتی ہوں اور بہت شوق سے کھاتی ہوں اور بھنے گوشت کا سالن بھی بہن بناتی ہے، میں اس کی ہیلپ کرواتی ہوں۔ اپنی پسندیدہ ڈش خود نہیں بناتی کیونکہ اگر میں خود بناؤں تو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ اس لیے بہن سے بنواتی ہوں اور کلیجی بہت شوق سے کھاتی ہوں۔

میرے بھائی کہتے ہیں، جتنی تم کلیجی شوق سے کھاتی ہو، اتنی موٹی نہیں ہو، ہاہاہا۔ بھائی بھی بہت شوق سے کھاتے ہیں خاص کر بھابھی حسن ہراج۔

(3) ترکیب لکھ رہی ہوں، ویسے یہ سب کو آتی ہے پھر بھی لکھ رہی ہوں۔ پسند آئے نہ آئے آپ کی مرضی، ہاہاہا۔

بھنی کلیجی

کلیجی	ایک کلو
گھی	ڈیڑھ کپ
پیاز، ٹماٹر	کلیجی کی مقدار کے مطابق
سرکہ	تھوڑا سا
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
خشک دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
نمک، مرچ	حسب ذائقہ

ترکیب:۔

تیل یا گھی کو گرم کر کے اس میں لہسن، پیاز، نمک، مرچ ڈال دیں۔ جب وہ براؤن ہو جائیں تو اس میں کلیجی ڈال دیں اور تھوڑا سا بھونیں پھر اس میں سرکہ، لیموں کا رس، گرم مسالا، زیرہ، خشک دھنیا ڈال کر بھونتے رہیں پھر اس میں دہی ڈالیں اور تیز آنچ کر کے پھر بھونیں پھر ثابت مرچ اور سبز دھنیا ڈال کر ڈھانپ دیں اور پانچ منٹ کے بعد کھولیں۔ لو جی مزے دار کلیجی تیار ہے، پلیٹ بھر بھر کر کھائیں۔

صدف ناصر..... گوجرانوالہ

(1) جی بالکل۔ نئی نئی کرونا وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف پریشانی اور خوف کی فضا تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارے گھر صرف بچوں کی ضروری شاپنگ ہوئی۔ بچوں کے کپڑے اور جوتے خریدتے وقت بھی انتہائی سادگی اختیار کی تھی۔ گھر کی سجاوٹ، بیڈ شیٹس، کراکری کچھ بھی نہیں خریدا تھا۔ سوائے کچن کے مسالہ جات کے، کیونکہ بقرعید پر بے حد ضروری ہوتے ہیں۔

جی نہیں۔ ذرا بھی روایتی دعوتیں اور اہتمام نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ہمسایوں سے بھی مسجد میں ہی نماز پڑھنے کے بعد مل آئے اور سارے گھروں میں سویٹ ڈش بھیج دی۔

(2) اف۔ منہ میں پانی آ گیا اس سوال سے۔ عید الاضحیٰ ہو، گوشت ہو اور خالدہ جیلانی کی شان دار ریسپیز ہوں تو گوجرانوالہ کے باسیوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ایک نہیں سینکڑوں ٹپس انگلیوں پر ہوتی ہیں۔ مطلب جتنے منہ اتنی ڈشز۔ ہر کسی کی پسند الگ اور میری موسٹ فیورٹ ڈش بیف پلاؤ اور بیف بادامی گوشت۔ جو کہ شادی سے پہلے سہانے دنوں میں ویلے بیٹھ کر آرڈر کر کے کھاتے تھے امی اور بڑی بہنوں سے۔ پر اب نہ وہ دن رہے نہ ویلیاں کھانے کو ملتی ہیں، ہاہاہا۔

آہو جی، خود بنائیں خود کھائیں۔ بڑی موجیں کر لیں میکے میں۔ مگر تہ دل سے شکر گزار اور دعا گو ہیں، شعاع، خواتین اور خالدہ جیلانی کی جنہوں نے ہمیں سگھڑ بنا دیا۔

دو سال پہلے عید الاضحیٰ پر سسرالی رشتہ دار شام کے وقت گوشت دینے آئے، تھکن اور بھوک سے بے حال ہوئے تھے۔ فٹافٹ انہیں کڑاہی گوشت، نان، سلاد اور کولڈ ڈرنکس پیش کیں۔ بلا مبالغہ پہلا لقمہ کھاتے ہی انہوں نے کہا۔ ”صبح سے چھ سات گھروں میں گئے، گوشت کھایا مگر ہر جگہ ہی گوشت سخت اور بدمزا کھانے کو ملا۔ یہ پہلا گھر ہے جہاں گوشت بہت اچھا، نرم، گلا ہوا اور انتہائی لذیذ ہے۔“

یہ کریڈٹ مجھے نہیں ان ہی تین ہستیوں کو جاتا ہے۔

(3) پسندیدہ ڈش نہیں، بہت سی ڈشز ہیں۔ کوکنگ کرتے وقت موبائل اوون کے پاس لگے موبائل اسٹینڈ پر ہوتا ہے۔ نعت یا تلاوت لگی ہوتی ہے۔ تین چار ڈائجسٹ کھلے پڑے ہوتے ہیں۔ ”موسم کے پکوان“ کے صفحات سامنے ہوتے ہیں اور کوکنگ ہو جاتی ہے ہر طرح کی ایمرجنسی میں۔ ریشمی کباب فٹافٹ بنا کر بے صبروں کو پیش کرنے کے لیے۔

ریشمی کباب

اجزاء:۔

قیمہ	ایک کلو
پسی کالی مرچ	ایک چمچہ
نمک	حسب ضرورت
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	دو کھانے کے چمچے
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دہی	دو سے تین کھانے کے چمچے
آئل / گھی	حسب ضرورت

ترکیب:۔

قیمہ کو چوپ کرلیں۔ اس میں تمام مسالا جات ڈال کر اچھی طرح ملالیں۔ پھر اس کے چھوٹے چھوٹے بالز بنا لیں اور سیخ پر لگا کر کباب بنالیں۔ چاروں طرف سے اچھی طرح سینک کر برش سے تیل لگالیں۔ کباب تیار ہیں اور میں ریشمی کباب بغیر سیخوں کے بھی بہت اچھے بناتی ہوں الحمدللہ۔ آپ بھی آسانی توے یا پین میں بنا سکتی ہیں۔ چٹنی، مایونیز، رائتہ، سلاد کے ساتھ۔ ہر چھوٹا بڑا بخوشی کھا کر آپ کو دعائیں دے گا، ان شاءاللہ۔

مہوش خولہ.....ٹنڈوالہ یار

(1) پچھلی بقرعید کرونا وبا کی آزمائش کے علاوہ جوان بہن اور بیٹی کے دنیا سے جانے کے صدمے کے ساتھ گزری۔ یوں لگا کہ اب کوئی عید پہلے جیسی نہ ہوگی۔ وبا کی پریشانی کی وجہ سے کسی اور تیاری پر توجہ نہیں دی لیکن الحمدللہ قربانی کی گئی۔ میرا دوسرے نمبر کا بھائی جس کی عمر اٹھارہ سال ہے، ابو نے بکرا اس سے ذبح کروادیا۔ پہلا تجربہ تھا۔ بکرا ذبح ہونے میں وقت لگا، میری آنکھ میں آنسو آگئے اور اللہ سے کہا "اے اللہ! میری اپنی آزمائش، بہن بیٹی سے بچھڑنے کی کچھ نہ تھی۔ میں نے تو بیٹی کا سانس نکلتے نہ دیکھا اور تو نے ابراہیم علیہ السلام کو اتنے بڑے امتحان میں ڈالا اور وہ پورے اترے۔"

ہم اندرون سندھ کے رہنے والے تو ہمارے ہاں تو سب معمول کے مطابق تھا۔ ایس او پیز، پابندی درست تھیں یا غلط، یہ علیحدہ بحث۔ لیکن کسی نے خیال نہیں رکھا۔ دعوت اہتمام روایت سب پائندہ باد۔ ہمارے ہاں

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت -/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/180 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

pklibrary.com

(بہن) مرحومہ حدیقہ کی یاد میں امی سے کچھ پکایا نہ گیا۔

میرا ذاتی خیال ہے پچھلی عید پھر کچھ بہتر تھی، جمع جتھے سے بھرم رکھ لیا گیا تھا لیکن ان ڈیڑھ سال میں مختلف نوعیت کے لاک ڈاؤن نے معیشت کو جو جھٹکے دیے ہیں، بہت سے کاروبار تو ابھی بھی معطل ہیں۔ شاید اس بقرعید پر سفید پوش طبقہ اپنا بھرم نہ رکھ پائے۔

(2) گوشت غذاؤں میں اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ بدنصیب اور محروم ہی اسے ناپسند کرسکتے ہیں۔ میں بچپن میں نہیں کھاتی تھی۔ بڑے ہو کر شوق سے کھاتی ہوں۔ بقرعید پر گوشت زیادہ ہوتا ہے تو آزادی کے ساتھ کوئی بھی ڈش بن سکتی ہے تو میں اور میری چھوٹی بہن تو بقرعید کا دن آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت بھنا ہوا بھی کھایا اور شوربے والا بھی۔ ہم عام دنوں میں شوربا رکھ کر کھاتے ہیں، دعوت اور بقرعید پر بھنے ہوئے تکے کھاتے ہیں۔ ہر وہ ڈش جس میں گوشت ہے، وہ لذیذ ہے۔ بس پالک گوشت مجھے نہیں پسند۔

میں تکہ بریانی تہ والی اچھی بناتی ہوں۔ میرے تینوں بہنوئی تعریف کرتے ہیں خصوصاً عرفان تو کہتے ہیں، مہوش باجی لگتا ہے مشہور کراچی بریانی کھا رہا ہوں۔ میں سب بنا لیتی ہوں۔ ران بھی روسٹ کرلیتی ہوں الحمدللہ۔

چھوٹی بہن سدرہ کے ہاتھ کا گرین گوشت پسند ہے، مدیحہ تلا ہوا گوشت اور امی جیسے شامی کباب دنیا میں کوئی نہیں بنا سکتا ماشاءاللہ۔

زرین چچی اور سعدیہ ممانی سے گوشت ڈشز فرمائش کر کے بنواتے اور کھاتے ہیں۔

(3) پسندیدہ ڈش مٹن کریمی گرین۔

اجزاء:۔

بکرے کا گوشت	ایک کلو
پیاز	پانچ عدد
دہی	ایک پاؤ
پسا لہسن، ادرک	دو چمچے
ہری مرچیں	پانچ عدد
دھنیا	ایک گٹھی
بادام	دس عدد
کاجو	دس عدد
خشخاش	تین چائے کے چمچے
کریم	ایک پیکٹ
قصوری میتھی	ایک چائے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا ثابت	
ثابت دار چینی	ایک انچ
کالی مرچ	چھ دانے
لونگ	دو عدد
بڑی الائچی	ایک عدد
چھوٹی الائچی	ایک عدد
تیز پات	ایک عدد
پسا گرم مسالا	ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:۔

کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ پیاز، ادرک لہسن ایک ساتھ بالکل باریک پیس کر ڈالیں۔ ثابت گرم مسالا بھی ڈال دیں، خوب بھنائی کریں۔ پھینٹا ہوا دہی اور خشک مسالے، نمک، کالی مرچ، سفید مرچ اور پسا گرم مسالا آدھا چمچہ ڈال دیں، بقیہ رکھ لیں۔ پھر بھنائی کریں۔ دھنیا، مرچیں علیحدہ سے پیس کر کڑاہی میں شامل کریں۔ کچھ وقفے سے بادام، کاجو، خشخاش پیس کر شامل کریں، بھونتی جائیں۔ دوسرے برتن میں گوشت ابلنے کے لیے رکھ دیں۔ گل جائے تو تھوڑی یخنی کے ساتھ اسے کڑاہی مسالے میں شامل کریں۔ زبردست بھنائی کریں، تیل اوپر آجائے، بالکل آخر میں کریم ملائیں، قصوری میتھی ہاتھ سے مسل کر ڈالیں۔ کوئلے کا دم کریں، کریم ڈال کر زیادہ دیر چولہے پر نہ رکھیں۔ بقیہ پسا گرم مسالا، ادرک دھنیا ڈال کر پیش کریں۔ کھائیں اور یہ چھوٹی بہن سدرہ کی ڈش ہے، اسے بھی دعا دیں اور مجھے بھی جس نے گرین کریمی آپ تک پہنچایا۔

☆

pklibrary.com

معروف فنکار

وہاج علی سے مُلاقات

شمائلہ رشید

وہاج علی جس کے لیے اگر یہ کہیں کہ وہ پیدائشی فنکار ہے تو غلط نہ ہوگا۔ جس سیریل میں آیا کامیابی کے جھنڈے گاڑھ دیے۔ آج کل ان کے دو آن ایئر ہیں ''فتور'' اور ''دل ناامید تو نہیں'' باقی کیا کیا کر چکے ہیں۔ پوچھتے ہیں۔

''کیسے مزاج ہیں؟''

''الحمدللہ''

''کیا ہو رہا ہے آج کل؟''

''بس جی..... کام..... اور کام کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ مصروف رہنا پسند ہے۔ اس لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا مجھے پسند ہے..... تو آج کل اچھا خاصا کام ہے میرے پاس۔''

''کام لیتے وقت کیا ذہن میں ہوتا ہے کہ کس طرح کے کردار لینے ہیں؟''

''میرا دل چاہتا ہے کہ میرا کام بہت معیاری اور بہت مختلف قسم کا ہو۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرا کام عام روٹین کے کرداروں سے ذرا ہٹ کر ہوتا ہے۔ آنے والے ڈراموں میں بھی میرے کردار بہت مختلف ہیں۔''

''شوبز انڈسٹری کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''

''میں تو سمجھتا ہوں کہ شوبز انڈسٹری ایک ایسی انڈسٹری ہے جہاں ہر روز کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ تو بس میرا دل چاہتا ہے کہ جو کچھ میں نے سیکھا ہے اس کا اظہار اپنے ڈراموں کے کرداروں میں کروں..... اور میں کرتا بھی ہوں۔''

''دوران ریکارڈنگ ری ٹیکس کی تعداد کتنی ہوتی ہے؟''

''بہت کم..... اور اب ذرا کام کا انداز بھی مختلف ہو گیا ہے اور میں اگر اپنے کسی سین سے مطمئن نہیں ہوتا تو پھر میں خود ہی کہہ دیتا ہوں کہ یہ سین میں دوبارہ کروں گا..... اگرچہ کیمرے کے سامنے اداکاری کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر کیمرہ نہ ہو تو پھر اداکاری بھی نہ ہو.....'' ہنستے ہوئے۔

''آپ کا 'آئی ایس پی آر' کا ڈرامہ سیریل 'عہد وفا' بہت مقبول ہوا تھا۔ آپ کا انتخاب کیسے ہوا تھا؟''

''میرے لیے تو یہ بات کسی بھی اعزاز سے کم نہ تھی۔ انتخاب کچھ اس طرح ہوا کہ میرے پاس ایک کال آئی کہ ''میجر جنرل آصف غفور'' آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں..... اس وقت میں کراچی میں تھا۔ خیر جس دن انہوں نے بلایا، میں چلا گیا۔ وہاں

pklibrary.com

میرے علاوہ اور بھی کئی اداکار تھے۔ آصف غفور صاحب سے بہت خوش گوار ملاقات کے بعد انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ”ہم نے اس ڈرامے کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اس پروجیکٹ کا حصہ بنوں گا۔“

”پھر کیسا رہا سب کچھ؟“

”بہت اچھا..... بہت مزہ آیا..... پوری ٹیم کے ساتھ خوب دوستی رہی..... اور ہم نے صرف ڈرامے میں ہی نہیں بلکہ حقیقت میں بھی بہت شرارتیں کیں اور خوب انجوائے کیا۔“

”آپ اسی دور کے اداکار ہیں۔ گزرے دور کے بھی کچھ ڈرامے ضرور دیکھے ہوں گے کیا کہیں گے آج اور کل کے بارے میں؟“

”میرا تو یہی خیال ہے ڈراموں کا معیار بہتر ہوا ہے۔ ہر دور کا ڈرامہ اپنے دور کے حساب سے اچھا اور معیاری ہوتا ہے..... کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ ہمارا معیار خراب ہو..... اگر اس فیلڈ میں اچھے اور تجربہ کار ڈائریکٹر ہیں تو برا کام بھی اچھا ہو جائے گا۔ ورنہ اچھا کام بھی برا ہو جائے گا۔ مطلب اچھا اسکرپٹ بھی برا ہو جائے گا۔“

”لوگ اس بات کے بہت خلاف ہیں کہ غیر ملکی ڈرامے پاکستانی چینلز سے دکھائے جائیں..... آپ کیا کہیں گے؟“

”میں تو اس بات کے خلاف ہوں کہ لوگ غیر ملکی ڈراموں کے نشر ہونے پر ناراض کیوں ہوتے ہیں اور مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ غیر ملکی ڈرامے ڈرامے ضرور دکھانے چاہئیں اور جب تک ہم دوسروں کے ڈرامے اور تخلیقات نہیں دیکھیں گے، ہمیں کیسے اندازہ ہوگا کہ ہم معیاری چیز پیش کر رہے ہیں یا دوسرے معیاری چیز پیش کر رہے ہیں۔ لوگوں کی سوچ پر بہت حیرانی ہوتی ہے۔“

”سوشل میڈیا..... کتنا پاور فل ہے؟“

”کتنا پاور فل ہے؟ بہت زیادہ پاور فل ہے۔ اس کے ذریعے سے تو بہت کچھ بدلا جا سکتا ہے۔“

”اب تک کیا کیا کر چکے ہیں آپ اس فیلڈ میں؟“

”سب آپ کے سامنے ہے۔ کافی ڈرامے کر چکا ہوں۔ کافی کر رہا ہوں اور کافی کرنے ہیں۔ مثلاً جو ڈرامے بہت مشہور ہوئے ان میں ”عہد وفا، میرے دل میرے مسافر، احساس، میرا در نہ جانے کوئی، میرا دل میرا دشمن، دل نواز، ماہ تمام، حیوان، فتور، دل ناامید تو نہیں..... کھٹی پٹی محبت، بکھرے موتی، بھرم اور ہری ہری چوڑیاں“ یہ وہ سیریلز اور سوپ ہیں جو بہت مشہور ہوئے۔“

”فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی؟“

”میں نے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ”ملٹی میڈیا“ میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی ہے۔ ماسٹرز کرنے کے بعد ایک نجی پرائیویٹ چینل پر جاب کی اور دوران جاب ایک ڈرامے میں کام کرنے کی آفر آئی تو کام کیا۔ لوگوں کو پسند آیا بلکہ ڈائریکٹرز حضرات کو..... اور یوں راستے بنتے چلے گئے۔“

”کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں؟“

”بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ باقاعدہ طور پر تو میں 2018 میں آیا۔ دوران ملازمت کام کرتا رہا۔ لیکن جب آفرز زیادہ آنے لگیں تو میں نے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور اپنی ساری توجہ اس فیلڈ کی طرف کر دی۔ کیونکہ یہ بھی ایک فل ٹائم جاب ہے۔“

”لوگ تو سمجھتے ہیں کہ اداکار بہت خوش نصیب ہوتے ہیں کہ انہیں پیسہ، عزت اور شہرت سب کچھ مل رہا ہوتا ہے اور کام بھی مشکل نہیں ہوتا؟“

”نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا..... ہر کام محنت مانگتا ہے۔ جیسی زندگی آپ سب کو نظر آ رہی ہوتی ہے درحقیقت ایسی ہوتی نہیں ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور محنت کے بعد میں شہرت ملتی ہے۔ ہاں اس فیلڈ میں شہرت مل جاتی

pklibrary.com

ہے جو کہ بہت خوب صورت احساس ہے۔"

"گویا..... شہرت کا نشہ اس فیلڈ میں لے کر آیا ہے؟"

"شہرت کا نشہ بھی اور کچھ کر کے دکھانے کا عزم بھی..... ورنہ پیسہ تو آپ جہاں ملازمت کرو گے مل ہی جائے گا۔ ساری دنیا جاب بھی کر رہی ہے..... بزنس بھی کر رہی ہے، بہت کما بھی رہی ہے۔ میں تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور لوگ مجھے جانتے ہیں۔"

"اس فیلڈ میں آنے کا کب سوچا تھا؟"

"2009 میں ماسٹرز کرنے کے بعد ایک نجی چینل میں نے انٹرن شپ کی اور وہیں سے بہ حیثیت ریسرچ منیجر کے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اور اپنی محنت سے اسسٹنٹ پروڈیوسر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ اداکاری کی آفرز آتی رہتی تھیں مگر انکار کر دیتا تھا۔"

"کیوں..... جبکہ آپ کو تو تھیٹر میں بھی کام کرنے کا تجربہ تھا؟"

"ہاں تجربہ تھا مگر کسی بڑے تھیٹر کا نہیں بلکہ اسکول و کالج کے تھیٹر میں کام کرنے کا..... پھر دوسری بات یہ ہے کہ میں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس آفر پر دھیان بھی نہیں دیا تھا۔"

"ہوں..... پھر کب خیال آیا کہ اس جانب بھی توجہ دے کر دیکھا جائے؟"

"2015 میں۔ جب ایک سیریل "عشق عبادت" کی پیشکش ہوئی تو میں نے آڈیشن دے دیا..... اور میرا انتخاب ہو گیا۔ وہ ٹیلی کاسٹ ہوا تو ایک سیریل کی آفر آ گئی تو پھر جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ 2018 میں، میں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا اور باقاعدہ طور پر اس فیلڈ کو جوائن کر لیا۔"

"آپ بہترین پرفارمر ہیں..... فلموں سے آفر آئی؟"

"بالکل آئی..... اور مجھے تو کام کرنا ہے..... خواہ فلم ہو یا ٹی وی..... لیکن بڑی اسکرین کا اپنا ہی چارم ہے۔ کشش ہے۔ مجھے "اسماء نبیل" نے اپنی فلم "فلائی" میں بک کیا ہے۔ "بریسٹ کینسر" کے موضوع پر یہ فلم ہے دراس میں میرے ساتھ مرکزی رول ہاجرہ یامین کریں گی۔"

"کورونا نے پوری دنیا کو مفلوج کیا ہوا ہے۔ آپ کے ساتھ کچھ انہونی ہوئی؟"

"انہونی تو نہیں ہوئی..... کورونا کا شکار میں ہوا۔ شکر الحمدللہ فیملی محفوظ رہی۔ مجھے تو جیسے ہی علامات محسوس ہوئیں، میں نے ٹیسٹ کروالیا اور احتیاطاً اپنے آپ کو سب سے الگ کر لیا۔ ٹیسٹ پازیٹو آیا۔ تو اور بھی زیادہ احتیاط شروع کر دی اور وہ سب کچھ کیا جو ڈاکٹر نے کہا۔ الحمدللہ ٹھیک ہو گیا اور زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں یہ ضرور دیکھا کہ اس بیماری نے سب کی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس مرض نے یا اس وبا نے بہت کچھ سکھا بھی دیا..... اور لوگوں میں بہت تبدیلیاں دیکھیں۔"

"لاک ڈاؤن کی چھٹیاں کیسی گزریں؟"

pklibrary.com

''بہت اچھی..... کیونکہ واقعی کئی زمانے کے بعد ایک ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ تو بہت اچھا لگا۔ بس میری شرارتوں سے سب تھوڑے تنگ آ گئے تھے۔ مگر سب نے انجوائے بھی کیا۔''

''شرارتیں..... تو کیا اب بھی شرارتی ہیں آپ؟''

''انسان کے اندر کا بچہ کبھی بڑا نہیں ہوتا۔ تو میرے اندر بھی ایک بچہ ہے۔ جو کبھی کبھی شرارتیں کرتا ہے۔''

''ویسے بچپن کیسا گزرا؟''

''میرا بچپن ملتان اور بہاول پور میں کھیلتے کودتے گزرا..... اصل میں ملتان میں والد صاحب کی پوسٹنگ تھی اور بہاولپور میں میرا ننھیال تھا۔ چھٹیاں ہماری بہاولپور میں گزرتی تھیں، اپنی نانی کا بہت لاڈلا تھا۔ اور اسی لاڈ کی وجہ سے خوب شرارتیں کرتا تھا۔ نانی تو کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن امی سے ضرور مار پڑتی تھی کہ یہ کیا کر رہے ہو..... پھر جب ہم 1998ء میں لاہور شفٹ ہو گئے تو پھر شرارتیں بھی ذرا کم ہو گئیں۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟''

''میں لاہور میں 1988 میں پیدا ہوا۔ والدین دونوں ہی سرکاری جاب کرتے تھے۔ والد صاحب انتقال فرما چکے ہیں جبکہ والدہ صاحبہ حیات ہیں۔ لاہور میں ہی مٹی میڈیا میں ماسٹرز کیا۔ والد صاحب تھوڑے سخت مزاج تھے۔ اس لیے تعلیم و تربیت کافی سختی کے ساتھ ہوئی۔ مگر میری ہر فرمائش پوری کرتے تھے شاید میں اکلوتا تھا اس لیے۔''

''شادی؟''

''جی..... ہو گئی ہے اور ہماری چار سال کی ایک بیٹی ہے۔ بیٹی کا نام ''امیرہ'' ہے جبکہ بیگم کا نام ''شافاروق'' ہے۔ اس نے جینڈر اسٹڈی میں ''ایم فل'' کیا ہے..... اور ہاؤس وائف ہے۔ اور ''ہماری لو میرج ہے۔''

''شوبز میں آنے کا شوق ہے یا آپ منع کرتے ہیں؟''

''نہیں نہیں..... میں تو کبھی منع نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ شوبز میں آئے گی۔ کیونکہ میری جو لائن ہے اس میں گھر میں رہنے کا وقت کم ہی ملتا ہے۔ تو جب دونوں ہی گھر سے باہر ہوں گے تو پھر گھر میں بیٹی کو کون دیکھے گا۔''

''سینئر فنکاروں میں کوئی ہے کہ جن کے ساتھ آپ نے ابھی تک کام نہ کیا ہو؟''

''مجھے سب ہی سینئرز کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے اور بار بار کرنے کی خواہش ہے۔ کیونکہ وہ اداکاری کی ایسی ایسی باریکیاں سمجھاتے ہیں کہ بندے کی عقل حیران رہ جاتی ہے۔''

''آج کل..... بلکہ انٹرویو آنے تک پی ایس ایل ختم ہو چکا ہوگا۔ بتائیں کہ کرکٹ سے دلچسپی ہے؟''

''بہت دلچسپی ہے۔ دیکھا بھی ہے ٹورنامنٹ۔ کرکٹ اور ٹیبل ٹینس شوق سے کھیلتا ہوں۔''

''اور کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''نہیں..... بہت کچھ آپ نے پوچھ لیا۔ بہت کچھ میں نے کہہ دیا۔''

اس کے ساتھ ہی ہم نے اجازت چاہی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز
بساطِ دل
بھی جیت جائے
افشاں آفریدی
قیمت 400/- روپے

انعمتہ قریشی

''کیسے مزاج ہیں؟''

''الحمدللہ..... بالکل ٹھیک۔''

''کیا مصروفیات ہیں؟''

''آج کل تو کوئی خاص نہیں، گزشتہ ماہ تو رمضان، عبادت، شاپنگ، اور کام میں ہی نکل گیا۔''

''رمضان کیسا گزرا؟''

''الحمدللہ..... بہت اچھا۔''

''آج کل کیا مصروفیات ہیں؟''

''کچھ انڈر پروڈکشن ہیں اور کچھ مکمل اور کچھ آن ایئر چل رہا ہے۔''

''کچھ بتانا پسند کروگی؟''

''سوری..... ابھی تو میری شوٹ کا ٹائم ہے۔

ان شاء اللہ پھر کبھی..... مطلب تفصیل نہیں بتا سکتی جو آپ پوچھ رہی ہیں اور کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لیں..... ویسے مجھے خوشی ہوگی کہ میں آپ کو انٹرویو دوں.....''

''اتنی اچھی بات کرنے کے بعد کچھ سوالات کے جوابات دیے، باقی کے لیے ٹائم مانگا، جو کہ آج تک نہیں ملا، سچ تو یہ ہے۔

آج کل کی نسل کو چونکہ مطالعہ کی عادت نہیں ہے۔ اس لیے انہیں پرنٹ میڈیا کی اہمیت کا بھی اندازہ نہیں ہے۔ اور کچھ بلکہ اکثریت نئے فنکاروں کی ایسی ہے کہ جب ان سے انٹرویو کی بات کرو تو ان کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ آپ ہمیں انٹرویو دینے کے کتنے پیسے دیں گی۔ ایک صاحبہ سے جب ہم نے کہا کہ آپ کتنے لیں گی۔ آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے تو

دستک، دستک، دستک

شاہین رشید

جواب آیا کہ مجھے 15 ہزار دیں گی تو میں آپ کو انٹرویو دوں گی، ورنہ نہیں۔ ماں کے رول کرنے والی ایک خاتون سے جب انٹرویو کی بات ہوئی تو یہی بات کہ کتنے دیں گی۔ پھر دو دن بعد فون کرکے کہہ رہی ہیں چلیں پیسے نہ دیں۔ لیکن آپ ٹائٹل پر میری تصویر لگوا دیں۔ فوٹو سیشن میں اپنی مرضی سے کرواؤں گی۔ تو جناب پرانے قصے ہیں اس فیلڈ کے..... اس وقت بات ہو رہی تھی انعمتہ کے انٹرویو کی..... جن سوالوں کے انہوں نے جواب دیے وہ حاضر خدمت ہیں۔

''کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟''

''جی..... میرا نام انعمتہ قریشی ہے اور انعمتہ کا مطلب خدا کا تحفہ ہے۔ اور یہ نام میرے والدین نے

pklibrary.com

ہی رکھا ہوگا۔ اس کا بیک گراؤنڈ مجھے نہیں معلوم..... خیر.....“

”اسی نام سے بلاتے ہیں۔ نام بگڑا تو نہیں۔“

”زیادہ تر لوگ تو مجھے اسی نام سے یعنی میرے اپنے نام سے ہی بلاتے ہیں۔ مگر جو بہت قریبی لوگ ہیں پیار محبت کرنے والے وہ مجھے ”سارنگ قاضی“ کہتے ہیں۔ اور کیوں کہتے ہیں یہ بھی کسی نے وضاحت نہیں کی۔

میں 14 مارچ 1997ء میں پیدا ہوئی۔ اور میرا ستارہ (حوت) ہے اور ہائٹ پانچ فٹ تین انچ ہے۔ اور میرے خیال میں لڑکیوں کے لیے یہ بہترین ہائٹ ہے۔ زیادہ ہو جائے تو اچھی بات ہے ورنہ ایشو نہیں ہے۔“

”زبان و بیان سے لگتا ہے کہ آپ کی زبان اردو ہے۔ ایسا ہی ہے نا۔ اور فیملی۔“

”ہاں جی..... بالکل..... ہماری مادری زبان اردو ہے۔ ویسے میں سندھی اور اردو دونوں ہی بہت اچھی بول لیتی ہوں، یوں سمجھیں کہ میری دو مادری زبانیں ہیں۔ ایک اردو اور دوسری سندھی۔ میری دو بہنیں ہیں اور میں درمیان کی ہوں۔“

”درمیان والوں کے لیے تو سنا ہے کہ بے چارا پستا بہت ہے۔“

”قہقہہ..... ہاں جی سنا ہے کہ درمیان والے کی بڑی کھنچائی ہوتی ہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ ہم بہنوں میں بہت پیار محبت اور اتفاق ہے۔“

”تعلیم جاری ہے؟ اور شادی؟“

”جی..... تعلیم جاری ہے۔ اور حال ہی میں میری شادی بھی ہوئی ہے۔“

”اچھا گڈ..... شوبز میں آمد کیسے ہوئی اور شادی کے بعد جاری رکھو گی؟“

”ان شاء اللہ ضرور جاری رکھوں گی اور جاری ہے بھی۔ دراصل شوبز میں آنے میں میری بہنوں اور میری ماں کی خواہش شامل ہے۔ انہوں نے ہی مجھے فورس کیا کہ چونکہ تم میں ٹیلنٹ ہے اس لیے تم اس فیلڈ کو جوائن کرو..... چنانچہ گھر والوں کے کہنے پر میں نے آڈیشن دیا اور کامیاب بھی ہوگئی۔

”آج کل کون سا ڈراما سیریل آن ایئر ہے؟“

”ایکسپریس ٹی وی سے میرا ڈراما سیریل ”گھمنڈی“ آن ایئر ہے۔

”بہت شکریہ انعمتہ صاحبہ کہ آپ نے اتنی بھی بات کرلی۔“

نازش جہانگیر

نازش جہانگیر شوبز کا نیا چہرہ، مگر کم مدت میں اپنی جگہ بنانے والی یہ فنکارہ بات چیت تو اچھی طرح کرتی ہیں مگر انٹرویو کے لیے وقت نہیں ہے۔ آج کل ان کے دو تین ڈرامے آن ایئر ہیں مختلف چینلز سے۔

”کیا حال ہیں؟“

بقیہ صفحہ نمبر 250

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/80 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/960 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 00100000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA00100000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/20,500 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

pklibrary.com

رخسانہ نگار عدنان

شاخِ گل کی چوڑیاں

pklibrary.com

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

Monthly Sitara July 2024

pklibrary.com

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر و اسے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ فلیٹ میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ کیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بہتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آئی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔
کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔
زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔
ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔
سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔
آزر جہان سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرنے پر ردا سے باہر نکل جاتی ہے۔
کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔
ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔
میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔
کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔
کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جکڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔
کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آ جاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔
حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آ جائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔
ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔
موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آ جائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آ جاتی ہے۔
موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ دیتی اپنے بچے کے ساتھ جورات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔
آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئر پورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی

پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماسی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسٹورنٹ پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہو جاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔

سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر وجیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرلے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مر جائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوتی ہے۔

موحد کو ایمان کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کر دی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آذر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروالیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر بچھتاتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہو جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ شاپنگ کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔

ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔

کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔

کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔

فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔

فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔

کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

اکتیسویں قسط

وہ منظر تھا یا کوئی خواب تھا۔

pklibrary.com

وہ پلکیں جھپکائے بغیر سامنے دیکھے جا رہی تھی۔
موحد کسی ملازم کے ساتھ مل کر گاڑی سے سامان اتروا رہا تھا۔ وہ اسی طرح سیٹ پر ساکت بیٹھی تھی۔
ڈھلتی شام کا سہانا منظر، جگہ جگہ آسمان پر، پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے کالے سرمئی بادل ٹولیوں کی شکل میں منڈلا رہے تھے۔
اور نیچے پیالے کی شکل کی وادی سبزے میں اٹی جیسے ان بادلوں کو چیلنج کر رہی تھی ''ہمت ہے تو نیچے آؤ''۔
اس کے چیلنج کو سر بہ فلک چوٹیوں نے بڑی نخوت سے دیکھا اور مزید سر اٹھا کر ہنس پڑیں۔
کشف کی نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں اس خوب صورت منظر سے۔ وہ مکمل طور پر اس میں ڈوب چکی تھی۔
''کشف! کیا بات ہے، تم ٹھیک ہو؟'' اس کے یوں بے حس و حرکت بیٹھے رہنے پر موحد کو تشویش سی ہوئی۔
اسی وقت یخ بستہ سرد ہوا کا جھونکا دونوں کے چہروں سے ٹکرایا اور میدانی علاقے کے پہنے ہوئے عام کاٹن کے سوٹ میں کشف کو جھرجھری سی آ گئی مگر یہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔
''بہت سردی ہے یہاں، چلو اندر..... کہیں تمہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔''
اس کو ہلکی سی کپکپی آئی تو موحد بے ساختہ بے چین سا ہو کر بولا۔
کشف بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
موحد نے شدید حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔
ابھی وہ کسی مردے کی طرح سرد و بے جان تھی اور اب کسی پھلجڑی کی طرح چھوٹ پڑی تھی۔
''کیا ہوا..... میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا۔ تم ہنسیں کیوں؟''
وہ سخت حیران تھا۔
ملازم سارا سامان اٹھا کر اندر لے جا چکا تھا اور اب ایک طرف ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا تھا۔
''مجھے بتائیں یہاں اس سہانے، پاگل کر دینے والے مناظر کے بیچ ایسے موسم میں کوئی بیمار پڑ سکتا ہے اور اگر بیمار ہو گا بھی تو وہ ذہنی بیمار ہو گا۔ اف موحد! کیا موسم ہے، مائی گاڈ آئی کانٹ بلیو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا میں یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں اور اتنا خوب صورت، اتنا دل فریب نظارہ بھی دنیا میں کہیں ہو سکتا ہے کیا؟''
وہ ہاتھ پھیلائے آنکھیں پوری طرح کھولے مبہوت سی گاڑی سے اتر کر آگے کی طرف یوں بڑھ رہی تھی جیسے اس خواب جیسے منظر کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے گی۔
''اے..... ہے..... ہے..... کیا کر رہی ہو اس طرف۔ اتنی گہری کھائی ہے کہ ایک قدم مزید بڑھایا تو بس تم تو گئیں۔'' موحد نے بے اختیار اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا کہ وہ اس سے بے اختیار آ لگی۔
دوسرے لمحے اس نے قدموں کی طرف جھک کر سنہرے میں چھپے اس دور تک جاتے سیاہ اندھیرے کو دیکھا۔ جو کہیں اتھاہ گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔
وہ دہشت زدہ ہو کر موحد کے مزید قریب ہو گئی۔
''مائی گاڈ..... یہ تو.....'' وہ ابھی بھی خوف زدہ تھی۔
''خوب صورتی کے ساتھ موت کی خود فریبی ہے یہاں۔'' وہ بڑبڑائی۔
''یہ تو قانون قدرت ہے۔ جہاں بھی انتہا سے زیادہ فسوں ہو گا، خوب صورتی ہو گی، وہیں کہیں خوف کے سناٹے بھی منڈلاتے ہوں گے۔ وہ خوف موت کا ہو یا کسی اور دہشت کا۔'' وہ اسی طرح اس کا بازو تھامے ہوئے تھی۔
ہوا کے چلنے میں شدت آ چکی تھی اور اس میں گیلی دھند کی باس تھی۔ پہاڑوں پر چھائے سرمئی بادل گہرے

ہوتے جارہے تھے۔

جب ان کے پاس ہی بکریوں کی میں میں سنائی دی۔ تیرہ چودہ سال کی پہاڑی لڑکی روایتی سرخ رنگ کا کڑھائی والا فراک پہنے، سر پر پھولوں والی ٹوپی لیے بے فکرے پن سے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے بکریوں کے غول کو ہانکتی خوش باش اپنے راستے پر گامزن تھی۔

وہ ان کے پاس آکر لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔

کشف نے اسے مسکرا کر دیکھا تو وہ بے اختیار جھینپ گئی اور زور سے کھلکھلا کر ہنستی اپنی بکریوں کے غول میں بھاگ کر جیسے چھپ گئی۔

کشف بھی اس کے ساتھ مل کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''یار! مجھے پتا ہوتا یہاں آکر تم اس طرح کھلکھلاتی رہو گی تو بائے گاڈ میں بہت پہلے تمہیں یہاں لا چکا ہوتا۔'' موحد اس کی ہنسی پر بے خود سا ہو کر رہ گیا۔

''آپ دیکھیں تو وہ کیسے ہنسی۔ اس کی ہنسی کتنی شفاف تھی، جیسے شیشے ٹکرائے ہوں اور اس کی کانچ جیسی آنکھیں..... موحد! وہ کتنی خوب صورت تھی ہے نا۔'' وہ موحد کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔

''مگر اس کو اپنی خوب صورتی کا احساس کہاں ہوگا۔'' موحد نے سر ہلا کر اور بکریوں کے گلے میں ترنگ میں چھڑی ہلاتی، اونچا اونچا کچھ بولتی اس لڑکی کو دیکھا۔

''اسے کہتے ہیں نا سلیپنگ بیوٹی۔'' وہ بھی اس طرف دیکھ رہی تھی جدھر وہ لڑکی جارہی تھی۔

موحد نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ یہ کشف کیا واقعی اتنی حسین ہے۔

''ہاں اسے کہتے سلیپنگ بیوٹی۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بولا تھا۔

''ہائے، مجھے پتا ہوتا آپ مجھے اتنی حسین جگہ پر لے کر آرہے ہیں، سچی میں تو بہت پہلے آچکی ہوتی۔ یہ سب کتنا دل فریب ہے موحد!'' وہ آنکھیں بند کیے بازو پھیلائے، آسمان کی طرف منہ اٹھائے بے خودی سی کہہ رہی تھی۔ اور موحد اس کو دیکھے جارہا تھا جب بارش کے موٹے موٹے قطرے ان کے چہروں پر آگرے اور پھر تڑتڑ بارش جیسے اولوں کی طرح برسنے لگی۔

موحد نے بے اختیار اس کا بازو کھینچا اور سڑک کے دوسری طرف ذرا چڑھائی میں جاتی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔

بارش ذرا سی دیر میں تیز تر ہوتی چلی گئی۔

جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آئے، دونوں پوری طرح سے بھیگ چکے تھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بے اختیار ہنس پڑے۔

اور بارش ان کو یوں ہنستے دیکھ کر کچھ اور بھی ترنگ میں آکر برسنے لگی۔ ہر طرف گھنگھور کالی گھٹائیں تھیں، یہ برسنے والی بارش اب رات بھر برسے گی۔

موحد اندر جاچکا تھا اور وہ شدید سرد ہواؤں میں کپکپاتی، دونوں بازو اپنے سینے کے گرد لپیٹے، اس ہوشربا منظر کو دیکھے جارہی تھی۔ جس میں بارش مستانی لہروں کی طرح ہر طرف سے گھر گھر کر آرہی تھی۔ موحد نے اس کو پیچھے سے گرم شال اوڑھائی۔

''پلیز، اب اندر جا کر چینج کرلو۔ تم بھیگی ہوئی ہو۔ یہ نہ ہو بیمار پڑ جاؤ۔ یہاں موسم میدانی علاقوں سے بہت مختلف ہے۔'' وہ اس کے ساتھ کھڑا اسے سنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''مختلف..... بہت زیادہ مختلف..... بہت حسین۔ پاگل کردینے والا۔ وہ دیکھیں پہاڑ..... وہ سارے دھند

میں چھپے جا رہے ہیں اور سبزہ بارش میں جیسے دھند میں لپٹتا جا رہا ہے۔ مائی گاڈ! یہ سب بہت خوب صورت ہے۔''
وہ اندر جانے کے موڈ میں بالکل بھی نہیں تھی۔ موحد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

زینب نے اپنے سامنے رکھے گملوں میں نیم مرجھائے پیلے پڑتے پودوں کو دیکھا۔
کشف چلی گئی۔ اس کے لگائے پودے موجود تھے۔
زینب چند لمحے انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔
پھر موڑھا گھسیٹ کر گملوں کے قریب کیا اور ہاتھ میں پکڑی کھرپی سے ہلکے ہاتھوں سے گوڈی کرنے لگی۔
مٹی الٹ پلٹ کر ان میں کھاد ڈالی۔
اتنے سے کام میں اس کا سانس جیسے پھول گیا تھا۔
سینے میں ہلکا ہلکا درد جیسے لہروں میں آ رہا تھا۔
اس نے بمشکل پودوں کو پانی دیا۔ رات کی رانی اور موتیا تو بالکل مرجھا گئے تھے۔
اتنے دن کیا کشف نے ان کا خیال نہیں رکھا۔
''ہاں جب وہ ضد میں آ جائے تو جس چیز سے عشق ہو اس سے بھی منہ پھیر لیتی ہے، پرانی عادت ہے اس کی۔'' خود سے باتیں کرتے وہ کشف کو یاد کر کے خود ہی مسکرائی۔ اس وقت میز پر پڑا اس کا فون بجنے لگا۔
اس نے بمشکل اٹھ کر فون اٹھایا۔
خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ موحد کی کال تھی۔
''ہم بخیریت پہنچ گئے ہیں آنی! یہاں موسم بہت خراب ہے، سگنل بھی ٹھیک سے نہیں آ رہے۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا، میں آپ کو بعد میں کال کرتا ہوں۔''
اس نے چند سیکنڈوں میں بات کی اور فون بے جان ہو گیا۔
''کیا تھا اگر کشف چند سیکنڈ کے لیے مجھ سے بات کر لیتی۔''
اس کے دل نے شکوہ کیا۔
''ابھی تک ناراض ہے مجھ سے۔ اس نے کبھی اتنی لمبی ناراضی نہیں پالی۔ شاید وقت کے ساتھ عادتیں بدلتی کم ہیں، پختہ زیادہ ہوتی ہیں۔'' اس نے خود کو سمجھایا۔
باہر دروازہ بج رہا تھا۔ اسے دروازے تک جانا محال لگ رہا تھا۔
''اب اور کوئی نہیں ہے، اس گھر میں دروازہ کھولنے والا۔ مجھے خود ہی ہمت کرنا ہوگی۔'' اس نے خود کو ہمت دینے کے لیے سمجھایا۔
اس کے دروازے تک پہنچنے میں دو بار دستک ہو چکی تھی۔
باہر خالہ بتول کھڑی تھیں۔ ہاتھ میں دسترخوان سے ڈھکی ٹرے تھی۔
''میرا تو دل بیٹھنے کو تھا کہ تم دروازہ کھول کیوں نہیں رہی ہو۔ اتنی دیر تو کبھی نہیں لگاتیں، اب کیا حال ہے تمہارا؟'' وہ تیز تیز بولتی زینب کے اندر پہنچنے سے پہلے اندر جا چکی تھیں۔
''بس خالہ! ہمت نہیں ہو رہی تھی بالکل بھی۔'' وہ اتنا سا چل کر نڈھال ہو گئی تھی۔ پھر سے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔
''کمزور بھی تو اتنی ہو گئی ہو۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور کون ہے خیال رکھنے والا۔ تم نے بتایا تھا نا کہ کشف کو بھی نکاح کر کے رخصت کر دیا ہے۔ سارا محلہ گلہ کر رہا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ ایسی بھی کیا بے

مروتی۔"

وہ حسب عادت بغیر رکے بولتی جارہی تھیں۔ جواب میں زینب صرف مسکرا رہ گئی۔ وہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھیں۔

وہ گلہ کرنے کے ساتھ محبت بھی جتاتی جارہی تھیں۔

وہ یوں بیٹھی لگاتار بولے جارہی تھیں۔ زینب کو بہت اچھا لگا کسی طرح اس گھر کی خاموشی تو ٹوٹی جو صبح سے چھائی ہوئی تھی۔

☆☆☆☆

"تم باپ ہو اس کے، کیسے باپ ہو جسے اس کے نوچ کی، اس کے آنے والے اچھے دنوں کی خوشی نہیں۔ تم سمجھاؤ اس کو۔" ثمینہ غصے میں بولتی کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک آجارہی تھی۔

حیدر کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پنڈولم دائیں بائیں حرکت کرتا جارہا ہے۔ اس کی آواز کم ہی حیدر کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

"حیدر! تم سن رہے ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں تم سے۔" آخر میں وہ چلا کر بول اٹھی۔

"ہوں!" اس نے فقط ہنکارا بھرا۔

"کب آئے گا یہ بلال واپس۔ تم نے اسے کیوں بھیجا۔ جان بوجھ کر بھیجا ہے نا تم نے اسے حیدر آباد۔" وہ پھر اس کے سر پر آکر چلائی۔

"خود گیا ہے۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔

"تم کیوں نہیں چاہتے اس کا مستقبل اچھا ہو۔ وہ کینیڈا جائے، وہاں سیٹل ہو جائے گا تو اس کا فائدہ ہے اس میں۔" وہ پھر سے نکتے پر آگئی جس پر وہ پچھلے پندرہ منٹ سے بولے جارہی تھی۔

"اور تمہارا کیا فائدہ ہے اس میں؟" حیدر اس پر نظریں جما کر کھردرے لہجے میں بولا۔ وہ بے اختیار چونکی۔

"میرا..... میرا کیا فائدہ ہوگا اس میں۔ صرف یہ ہی کہ اسے برائٹ فیوچر مل جائے گا۔"

وہ ذرا سی دیر کو ہکلائی پھر فوراً ہی سنبھل گئی تھی۔

حیدر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"شیرازی کون ہے؟" اس نے گویا ثمینہ کے سر پر بم پھوڑا۔

وہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔ فوری طور پر کوئی جواب نہیں سوجھا۔

"مم..... میں نہیں جانتی..... تم کس شیرازی کی بات کر رہے ہو..... مجھے نہیں معلوم۔" وہ نظریں چراتی اٹکتی کہہ رہی تھی۔

"جس کے ساتھ کل تم اس فائیو اسٹار ہوٹل میں، شام تک بیٹھی خوش گوار وقت گزارتی رہیں۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

ثمینہ کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

"جھوٹ..... جھوٹ مت بولو۔" وہ غصے بولی۔

"جھوٹ تو اتنے سال سے تم مجھ سے بولتی رہیں۔ میں سمجھتا تھا تمہیں مجھ سے شکایتیں ہیں، میں تمہیں وہ لائف اسٹائل نہیں دے سکا جس کی تم خواہش مند تھیں۔ ایک بڑا گھر، شان دار گاڑیاں، نوکر چاکر، کھلا پیسہ کچھ بھی تو تمہیں نہیں دے سکا۔ ہاں مگر اس کے باوجود تم مجھ سے مخلص ہو، جیسے بھی ہے تم میرے ساتھ ایک پاکیزہ،

باکردار زندگی گزار رہی ہو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ اس سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

''اور کل میرا یہ پندار بھی ٹوٹ گیا۔''

''ایسا کچھ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ وہ میری دوست کا شوہر ہے۔ ان میں کچھ چپقلش چل رہی ہے۔''

''ہاں ہے وہ تمہاری سہیلی کا شوہر اور ان میں چپقلش بھی چل رہی ہے بلکہ ان میں سیپریشن ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ صرف تم ہو۔''

''حیدر!'' وہ چلائی

''چلاؤ مت..... تم نے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کی اپنی دوست کے گھر پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے کیونکہ تمہیں تو ہر حال میں وہ ساری آسائشیں، ساری لگژریز چاہئیں جو میں تمہیں نہیں دے سکا۔''

''تم اب خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہے ہو۔ میں صرف اس کی دوست.....''

''اس بار میں بات کو بڑھا نہیں رہا، بات کو سمیٹ رہا ہوں۔ تم نے جس طرح ان کے گھر میں گھس کر ان کے گھر کو تباہ کیا، وہ سب بیان کرتے ہوئے بھی مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ مگر تم..... بہر حال اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔''

ثمینہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بری طرح سے انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

''یہ غلط ہے حیدر! وہ دونوں پہلے ہی ایک دوسرے سے فیڈ اپ ہو چکے تھے۔'' اس نے پہلی بار کمزور لہجے میں بات کی۔

''جیسے تم مجھ سے فیڈ اپ ہو چکی ہو۔ شیرازی بزنس سمیت کینیڈا موو کر رہا ہے اور تمہیں اس کے ساتھ جانا ہے۔ فی الحال بلال کا سہارا لے کر۔''

''جھوٹ ہے، بکواس..... یہ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔'' وہ غصے میں چلائی۔

حیدر کے چہرے پر گہرا سا اطمینان تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں۔ اس بار کوئی کسی پر غلط الزام نہیں لگائے گا کہ یہ کھیل بس آخری مراحل میں ہے۔ تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تم صرف مجھ سے یہ کہتیں کہ تمہیں مجھ سے چھٹکارا چاہیے تو میں تمہیں خاموشی سے اجازت دے دیتا۔''

وہ اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

''تمہیں بلال کی زندگی سے کھیلنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' اس نے کہہ کر ٹیبل کی دراز کھولی۔

ثمینہ کے چہرے پر الجھن تھی۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔ اب بلال والا پلان خراب ہونے کے بعد اسے حیدر سے بات تو کرنی تھی مگر بات کرنے کے لیے معقول جواز نہیں مل رہا تھا۔

حیدر نے ایک خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ تمہاری آزادی کا پروانہ، تم اب جہاں چاہو، جس کے ساتھ چاہو جا کر باقی کی زندگی گزار سکتی ہو۔ میں تمہارے راستے میں مزید رکاوٹ نہیں بنوں گا۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''یہ..... یہ.....'' وہ اٹک گئی۔

''طلاق نامہ ہے۔ آج سے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔''

ثمینہ شاکڈ سی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

وہ اسے آخری نظر دیکھ کر رکا نہیں، تیزی سے باہر نکل گیا۔

اور ثمینہ کو یہ آخری بازی جیتنے کے بعد بھی لگ رہا تھا، حیدر نے اسے بری طرح سے مات دی ہے۔ وہ ساری بازی ہار گئی ہے، اسے حیدر نے شہ مات دے دی ہے۔

وہ لفافہ ہاتھ میں لیے صوفے پر گر گئی۔

☆☆☆

وہ رات اس کی زندگی کی عجیب ترین راتوں میں سے ایک تھی۔

اس چھوٹے سے گھر کی چھت ٹین کی تھی جس پر رات بھر بارش کے موٹے قطرے پتھروں کی طرح گرتے رہے۔

وہ پوری رات ایک پل بھی سو نہیں سکی تھی۔

موحد تھکا ہوا تھا، وہ تو بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا تھا۔

اس چھوٹے سے کمرے میں دو الگ الگ پلنگ تھے۔ اسے دوسری خوشی الگ پلنگ دیکھ کر ہوئی۔

اس نے اپنا پلنگ موحد کے باہر جاتے ہی گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس کر لیا تھا۔ دونوں پلنگوں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔

موحد کمرے میں آیا تو یہ نمایاں فاصلہ دیکھ کر مسکرایا تھا اور وہ انجان بن کر کھڑکی سے باہر دیکھے گئی تھی۔

کمرے میں دو کرسیاں اور ایک میز تھی۔ ایک طرف بڑی سی لوہے کی الماری تھی۔ ایک کونے میں مصنوعی پھولوں والا گملا تھا۔

"پتا نہیں آنی نے میرے پودوں کو پانی دیا ہوگا یا نہیں۔" ان مصنوعی پھولوں کو دیکھ کر اسے پہلا خیال یہی آیا تھا۔

"یہاں ڈاکٹرز کے لیے ایک ریسٹ ہاؤس زیر تعمیر ہے۔ فی الحال ہمیں اس میں گزارا کرنا پڑے گا۔"

موحد نے اس کے سامنے ٹرے میں پڑے کھانے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جس میں شاید قیمہ مٹر اور روٹیاں رومال میں لپٹی تھیں، ساتھ میں سادہ چاول تھے۔

"یہاں ہماری ہیلپ..... آئی مین تمہاری ہیلپ کے لیے فرزند علی اور اس کی گھر والی موجود ہیں۔ وہ یہاں کی صفائی بھی کریں گے اور کھانا بھی پکایا کریں گے، ڈسپنسری کے لیے بھی مجھے یہی دونوں دستیاب ہیں۔"

موحد کھانا کھاتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔

"تمہیں کوئی گرم سویٹر نکال کر پہن لینا چاہیے۔" اسے فقط گرم شال اوڑھے دیکھ کر موحد نے پھر فکرمندی سے کہا۔

"میں چھوٹی بچی نہیں ہوں جس کی آپ اس طرح فکر کر رہے ہیں اور مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی بلکہ بہت مزا آ رہا ہے۔" وہ آخر میں تو چڑ کر ہی رہ گئی۔

"حد ہے بھئی، ہر بات میں مجھے چھوٹی بچی کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔" وہ مزید کلس گئی۔

اور موحد حسب عادت مسکرا کر رہ گیا۔

"اب ہنس کیوں رہے ہیں؟"

وہ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر جھلائی۔

"میں کب ہنس رہا ہوں؟" وہ کچھ گھبرا کر بولا۔

"تمہارا موڈ ابھی بھی خراب ہے۔ اتنے اچھے موسم میں بھی۔" اس نے پھر کشف کو چھیڑا۔

"میرا موڈ بالکل خراب نہیں ہے۔ آپ کو عادت ہے مجھے آبزرو کرنے کی۔" وہ جھلا کر بولی۔

''ہوسکتا ہے۔'' موحد نے جلدی سے ہتھیار ڈال دیے۔
''کل مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے، باہر موسم خراب ہے۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ واک کی عادت ہے۔'' وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔
اور کشف کا تو جی چاہ رہا تھا۔ موسم کی خرابی کی بھی پروا نہ کرے اور باہر نکل جائے۔
''ذرا باہر دیکھیں۔'' وہ لجائے ہوئے انداز میں بولی۔
اس نے مسکرا کر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔
شدید سرد ہوا کا جھکڑ اڑا دینے والا جھونکا ایک دم سے کھلے دروازے سے اندر آیا تھا۔
باہر برستی بارش کا شور تھا۔ شدید سردی تھی اور نیالا سا اندھیرا اور اجالا سا تھا۔
دور سر اٹھائے کھڑے پہاڑ بڑے بڑے بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے۔ آسمان بارش کی شدت میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔
موحد نے سردی کی شدت سے گھبرا کر دروازہ بند کر دیا۔
کشف اس کے پیچھے کھڑی تھی۔
وہ اس سے ٹکرایا۔ وہ گھبرا کر الٹے قدم پیچھے ہو گئی۔
موحد نے مڑ کر اسے گہری نظر سے دیکھا۔
کمرے میں باہر برستی بارش کی آواز تھی یا تیز چلتی ہوا کا شور تھا۔ دونوں بالکل ساکت تھے۔
وہ رخ پھیر کر کھڑکی کی طرف چلی گئی۔
''میں نے آنی کو کال کر دی تھی کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت سگنل بالکل نہیں آ رہے تھے۔ زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ تم بھی کل ان سے بات کر لینا۔'' وہ کہہ کر الماری کی طرف بڑھا۔ ابھی کپڑے یوں ہی الماری میں رکھے گئے تھے۔
وہ نائٹ سوٹ نکال کر واش روم میں چلا گیا۔
وہ کھڑکی کے پاس خاموش کھڑی رہ گئی۔
''آنی اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔ وہ کتنی اکیلی ہوں گی اگر بلال، صالحہ نانو کو نہیں لے کر آیا تو وہ اکیلی کیسے رہیں گی۔ مجھے آنے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' پتا نہیں کیوں زینب کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ وہ بے آواز آنسوؤں سے رونے لگی۔
''کیا میں انہیں مس کر رہی ہوں۔'' اس نے چہرہ صاف کیا جو چند لمحوں میں پھر آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

☆☆☆

سلیمان اور رمشا ویزے کے لیے ایمبیسی گئے تھے۔ حمزہ بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔
ان کی واپسی رات سے پہلے ممکن نہیں تھی۔
اور آذر تو اب آتا ہی رات تک تھا آفس سے۔
سونیا کا دل گھبرا رہا تھا۔
اس دن کی بحث کے بعد اس نے منصور سے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ زینب کی طرف جانا چاہ رہی تھی۔
''اماں جان! کچن کا کافی سامان ختم ہے۔ مجھے ذرا مارکیٹ تک جانا ہے۔ کچھ اور بھی چیزیں لینی ہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے لگ جائیں گے۔ آپ نے کچھ منگوانا ہے۔'' طاہرہ بیگم لاؤنج میں بیٹھی کسی سے فون پر بات کر رہی

تھیں۔
جب سے سونیا سے آزر کا جھگڑا ہوا تھا۔ آزر نے ماں کو سونیا کی اصلیت بتائی تھی۔ طاہرہ سونیا سے بات نہیں کرتی تھیں۔
اب بھی سونیا کی بات سن کر طاہرہ نے نخوت سے رخ پھیر لیا۔
سونیا چند لمحے کھڑی رہی پھر گہرا سانس لے کر کندھے پر پڑا بیگ ٹھیک کرتی باہر نکل گئی۔
اب ان دو ڈھائی گھنٹوں میں اسے زینب سے بھی ملنا تھا اور سودا سلف کے نام پر کچھ نہ کچھ سامان بھی خریدنا تھا۔
وہ راستہ بھر یہی سوچتی رہی اگر آزر کا اس کے ساتھ یہی توہین آمیز رویہ رہا تو وہ خود اسے چھوڑ دے گی رمشا کے جانے کے بعد۔

☆☆☆

ایما بلال سے آخری بار ملنے آئی تھی، شاید اس کا دل پسیج جائے۔
وہ ابھی صالحہ بیگم کو حیدر آباد سے لے کر زینب کی طرف چھوڑتا ہوا گھر آیا تھا۔
دروازہ اس نے ہی کھولا تھا۔
ایما کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر حیران ہوا پھر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔
''تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا؟'' وہ اس کے تاثرات پڑھتے ہوئے کچھ دل گرفتی سے بولی۔
''ٹھیک ہے۔'' وہ یوں ہی کندھے اچکا کر بولا۔
''اندر آنے کو نہیں کہو گے؟'' وہ اس کے یونہی کھڑے رہنے پر جتا کر بولی۔ اس نے ایما کو اندر آنے کا راستہ ذرا سا ہٹ کر دے دیا۔
وہ اندر چلی گئی۔ بلال دروازہ بند کرتا اس کے پیچھے آ گیا۔
''آنٹی گھر میں نہیں ہیں کیا؟'' وہ گھر میں چھائی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔
''نہیں۔'' بلال نے مختصراً کہا۔
ایما کو دیکھ کر اس کے جذبات جیسے مزید سرد سے ہو گئے تھے۔ یوں جیسے ان کے بیچ کبھی کوئی تعلق رہا ہی نہیں تھا۔
''کہاں گئی ہیں؟'' وہ متجسس تھی کہ کوئی تو اس کی حمایت میں بولنے والا موجود ہو۔
''آئی ڈونٹ نو۔'' وہ اسی ٹون میں بولا۔ ایما اسے دیکھ کر رہ گئی۔
اس کا دل بلال کو دیکھ کر ابھی بھی بہت سی دھڑکنیں مس کر جاتا تھا۔
''ناراض ہو مجھ سے؟'' وہ شاید تعلقات کو بحال کرنا چاہتی تھی۔
''نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ تم بیٹھو، کیا لوگی چائے یا کافی یا کچھ ٹھنڈا لے کر آؤں تمہارے لیے؟'' وہ اسے دیکھ کر میزبانی نبھانے کے سے انداز میں کہتا اندر کی طرف جانے لگا۔
''پلیز بلال! مجھ سے یوں فارمل ہو کر بات نہیں کرو، میں اپنے دل میں بہت امیدیں لے کر آئی ہوں۔ میں نے دل سے تمہیں چاہا ہے، صرف اور صرف تم سے محبت کی ہے۔ تم اگر چاہو گے تو میں کچھ عرصہ تمہارے ساتھ یہاں بھی رہ سکتی ہوں۔ پلیز، مجھے یوں ریجیکٹ نہیں کرو۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامے منتی لہجے میں کہتی بے اختیار رونے لگی۔
وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

pklibrary.com
Monthly Shuaa July 2021

پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھا کر اس کے قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آئی ایم سوری ایما! جو فیلنگز تمہارے دل میں میرے لیے ہیں، میرے دل میں تمہارے لیے وہ ایموشنز نہیں ہیں۔ اب اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ تم یہاں رہو یا نہیں رہو۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو، تمہاری جس سے بھی شادی ہوگی، وہ بہت خوش نصیب ہوگا لیکن سوری، وہ میں نہیں ہوں۔ تم میری باتوں کو دل پر نہیں لینا۔ میں واقعی تمہارے لائق نہیں ہوں۔ میں وہ شخص نہیں ہوں جو دل سے تمہیں چاہے۔'' وہ اسے رسان سے سمجھا رہا تھا۔

''کیوں..... کیوں نہیں ہو تم وہ شخص؟ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ تم ہی وہ شخص ہو جو میرے لیے لکی ثابت ہوگا۔'' وہ بکھرے ٹوٹے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''بے شک تمہارا دل گواہی دیتا ہوگا کہ محبت میں دل کی گواہی سے زیادہ اور کسی کی گواہی کی ضرورت ہوتی بھی نہیں۔ میرا بھی یہی حال ہے۔''

وہ گہرا سانس لے کر چپ ہو گیا۔

''کیا مطلب، اگر تم بھی مجھے ایسے چاہتے ہو تو پھر انکار کیوں؟'' وہ بے ساختہ آنسو صاف کرتی ہوئی بولی۔

''وہ تم نہیں ہو ایما! آئی ایم رئیلی سوری۔ وہ جو ہے میرے دل کے پاس ہے، مگر میرے مقدر میں نہیں۔ میرے نصیب سے بہت دور ہے اور کوئی چاہ کر بھی اپنا نصیب نہیں بدل سکتا۔ جیسے تم چاہو بھی تو مجھے اپنی قسمت میں نہیں لکھ سکتیں۔'' وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

''یہ سب وقتی ہوتا ہے بلال! جب ہم ایک بہت اچھی لائف گزاریں گے تو تمہیں یہ باتیں مذاق لگیں گی۔'' وہ بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''یہی تو میں تم سے کہہ رہا ہوں، یہ سب وقتی ہے۔ تمہیں لگ رہا ہے میں تمہارے لیے ضروری ہوں۔ تم میرے بغیر رہ نہیں سکو گی مگر کچھ عرصے بعد تمہیں خود اپنی اس کیفیت پر ہنسی آئے گی، جب تم اپنی نئی لائف میں سیٹل ہو جاؤ گی۔ میری نیک تمنائیں، دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ایما!''

وہ نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''پلیز بلال! یوں میرا دل مت توڑو۔ میں تمہارے علاوہ اور کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔'' وہ پھر نئی آس کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

بلال اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''دیکھو، یوں گڑگڑانے سے، منت سماجت کرنے سے تقدیر بدلی جا سکتی ہے تو میں بہت پہلے اپنی قسمت میں نہ لکھی ہوئی خوشی کو حاصل کر چکا ہوتا۔'' اس نے نرمی سے سمجھایا۔

''صرف اس لیے کہ تمہیں اپنے دل کی خوشی نہیں ملی، تم مجھے منع کر رہے ہو۔ کیا پتا تمہیں وہ خوشی مجھ سے ملنی ہو۔'' وہ ابھی بھی ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''دیکھو، یہ میرے ہاتھ کی لکیریں..... ان میں کہیں بھی خوشی نہیں ہے۔ وہ خوشی نہیں ہے جو مجھے محبت پانے سے ملے گی۔'' وہ اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر بولا۔

''میں ان جھوٹی لکیروں کو نہیں مانتی۔'' پامسٹری کی ماہر ایما اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی۔

بلال پھیکی سی ہنسی ہنس پڑا۔

ایما کا فون بج رہا تھا۔ بلال اٹھ کر چائے بنانے چلا گیا۔

وہ تھوڑی دیر میں ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے واپس آیا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ جا چکی تھی شاید اسے وہ

pklibrary.com
Monthly Shuaa July 2021

بات سمجھ میں آ گئی تھی، جو بلال اسے سمجھانا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

اسے ذرا سا بھی گمان نہیں تھا کہ یہاں کی صبح اتنی حسین، اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے۔

وہ کھڑکی کھول کر رات کی سیاہیوں کو آسمان کی نیلاہٹوں میں گھلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

موحد ابھی گہری نیند میں تھا۔ اسے تو رات بھر نیند آ ہی نہیں سکی تھی۔ کبھی زینب کا خیال آتا اور کبھی عجیب سی بے چینی محسوس ہوتی۔ باہر دور کہیں پہاڑوں یا جنگلی جھاڑیوں میں بولتے خوش آواز پرندوں نے اس کے کانوں کو عجیب موسیقی سنائی تھی۔

اس نے جلدی سے الماری کھول کر اپنا لانگ کارڈیگن نکالا اور شال لپیٹتی آہستگی سے دروازہ کھولتے باہر نکل آئی۔

رات کی بارش سے سارا منظر جیسے دھل کر نہائی ہوئی دلہن کی طرح لش لش کر رہا تھا۔

سبزے میں کہیں کہیں پھیلے سرخ اور ہرے، نیلے پیلے، جامنی اور خدا جانے کون کون سے رنگوں کے پھول تھے جو اس نے کل شام نہیں دیکھے تھے۔ سر بلند اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں کچھ اور بھی شان دار لگ رہی تھیں، جب ان کے پیچھے سے شفق رنگ کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

فضا میں شدید خنکی تھی مگر مدھم خوش گوار ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ٹکراتی خنک ہوا اس کو جیسے تازہ دم کر رہی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ باقی کی تمام عمر اس خوب صورت منظر کو دیکھتے یہیں گزار سکتی ہے۔

''تم پھر اتنی سردی میں باہر نکل آئیں۔'' موحد جانے کب اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس نے گردن موڑی۔

''صبح بخیر۔'' اس نے مسکراتے لبوں کے ساتھ اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کشف نے کچھ جھینپ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

''تم رات بھر سو نہیں سکیں۔'' تو گویا اسے معلوم تھا وہ نہیں سوئی۔

''مجھے نئی جگہ پر نیند نہیں آتی۔'' اس نے توجیہہ پیش کی۔

''آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی۔'' موحد نے گویا اسے تسلی دی۔

دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔

''پتا نہیں صالحہ نانو رات میں آنی کے پاس آئی یا نہیں۔'' بے خیالی میں ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔

''تمہیں رات ہی فون کر کے معلوم کر لینا چاہیے تھا۔'' موحد نے مشورہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔

''چلو آ جاؤ جلدی سے، فرزند علی کی بیوی کچن میں ہے۔ تم جا کر اسے سمجھا دو جو بھی ناشتے میں لینا ہے، میں آملیٹ کے ساتھ پراٹھا لوں گا۔'' وہ پوری اس کی طرف گھوم گئی۔

''پراٹھا کھائیں گے آپ؟'' وہ حیران تھی۔

''بھئی اتنے شدید موسم میں اسی طرح کی ڈائٹ چلے گی۔ تم بھی اپنے لیے یہی بنوا لو کیونکہ تم نے رات بھی نہ ہونے کے برابر کھایا تھا۔''

''نیند پر اثر نہ آنے کی ایک یہ بھی وجہ تھی۔'' وہ جاتے جاتے کہہ گیا۔

''اس شخص کو جانے کون سے الہام ہوتے ہیں۔'' وہ سوچ سوچ کر رہ گئی۔

اور یہ سچ بھی تھا۔ رات جب بھی اسے گہری نیند آنے لگتی تو پیٹ کے خالی ہونے کا احساس جگا دیتا حالانکہ وہ بھوک کی کچی نہیں تھی مگر شاید یہاں کے شدید موسم کا اثر تھا یہ۔

وہ کندھے اچکا کر سوچتی اندر کی طرف مڑ گئی۔
یہاں کی آب و ہوا کے لیے یہ سویٹرز اور شال ناکافی ہوں گے، اسے مزید کچھ گرم کپڑے لانے چاہیے تھے۔
وہ سوچتی ہوئی اندر آ گئی۔

☆☆☆

زینب کے سامنے صالحہ کو بیٹھے دیکھ کر سونیا لمحے بھر کو ٹھٹکی تھی۔ پھر سلام کرتی ان کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی۔
''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری زینب!'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ جواب شکل سے بھی اندر سے بہتر لگ رہی تھی۔
''بہتر ہوں سونیا! اللہ کا شکر ہے۔ تم سناؤ، کیسی ہو؟ اتنے دنوں بعد چکر لگا تمہارا۔'' زینب نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔
''تم نے کون سا کال کر کے پوچھ لیا کہ میں کس حال میں ہوں۔''
نا چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے شکوہ پھسلا۔
جواب میں زینب کچھ شرمندہ سی خاموش ہو گئی۔
''صالحہ خالہ! آپ کب آئیں؟'' وہ زینب کی خاموشی پر صالحہ کی طرف متوجہ ہوئی۔
''ابھی صبح ہی آئی ہوں۔ تم سناؤ، بچے کیسے ہیں، ٹھیک ہیں بیٹا بیٹی؟'' وہ اس کا احوال پوچھنے لگیں۔
''جی، سب ٹھیک ہیں، اللہ کا شکر ہے۔'' وہ تو زینب کو اپنی رمشا کے ساتھ ہونے والے ''ظلم'' کا بتانے کے لیے آئی تھی اب یہاں صالحہ جمی بیٹھی ہیں، کیسے بتائے گی۔
''میں تم دونوں کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔'' صالحہ شاید سونیا کے انداز سے بھانپ گئی تھیں، اٹھ کر جانے لگیں۔
''خالہ! آپ رہنے دیں، میں بنا لاتی ہوں۔ آپ بیٹھیں یہاں۔''
زینب انہیں روکتے ہوئے بولی۔
''میری بچی ابھی تم خود کون سا اچھی ہو۔ حالت دیکھو اپنی۔ پہچانی نہیں جا رہیں، جیسے نچڑ کر رہ گئی ہو۔ ایک ذرا سی بیماری ہے، اللہ تمہیں جلدی اچھا کرے۔ میں تو تمہیں دیکھ کر مانو پریشان سی ہو کر رہ گئی۔ ایسا تو تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی تھی۔ یہیں بیٹھو تم آرام سے، میں لے آتی ہوں۔ چائے بنانا کون سا مشکل کام ہے۔'' وہ بولتے ہوئے چلی گئیں۔
''کشف کہاں ہے؟'' صالحہ کے جانے کے بعد زینب نے تجسس لہجے میں پوچھا۔
زینب لمحہ بھر کو خاموش سی رہ گئی۔
''چلی گئی موحد کے ساتھ۔'' وہ آہستگی سے بولی۔
اور سونیا لمحہ بھر کو گم صم رہ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔
زینب سے ملنے کا تو بہانہ تھا وہ اس وقت کشف سے ملنے کے لیے آئی تھی، شاید اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہو۔
شاید وہ اس کی مجبوری کو سمجھ گئی ہو شاید کشف سونیا کو معاف کر دے۔
''کہاں..... کہاں چلی گئی۔'' وہ بوکھلا گئی۔
''شاید میں نے تمہیں بتایا تھا یا نہیں موحد کو جانا پڑا تھا۔ تبدیل ہو کر کسی دور دراز پہاڑی علاقے کی طرف تو ظاہر ہے کشف نے اس کے ساتھ ہی جانا تھا۔'' وہ رک کر بے تاثر لہجے میں کہہ گئی۔
''تم نے اسے کیوں جانے دیا اتنی دور؟'' سونیا بے چینی سے بولی۔
''میرا کیا اختیار رہ گیا تھا اس پہ۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''اس نے جب اتنا بڑا قدم خود سے اٹھا لیا تو پھر

میں اسے اپنے شوہر کے ساتھ جانے سے روک تو نہیں سکتی تھی نا۔'' وہ بے بسی سے بولی۔
''کیا قسمت ہے میری بھی تین بیٹیاں اور کسی کی بھی خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی مجھے۔'' سونیا دل گرفتی سے بڑبڑائی۔
زینب نے چونک کر اسے دیکھا۔
''تین بیٹیاں کیا مطلب۔'' زینب خود کو بولنے سے روک نہ سکی۔
''آزر نے سلیمان کے ساتھ رمشا کا نکاح کر دیا جب میں یہاں سے گئی گھر تو اس کا نکاح ہو رہا تھا۔ کسی نے مجھ سے ماں ہونے کی حیثیت سے پوچھنا تو درکنار بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔''
وہ بہت رنجیدہ تھی ردا کی موت نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ ذرا سی بات پر اس کے آنسو نکل آتے تھے۔
زینب نے آس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔
''کیا کیا جا سکتا ہے۔ تم رمشا کے اچھے نصیب کی دعا کرو سلیمان برا لڑکا نہیں ہے۔'' زینب نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔
''اس کی ماں کتنی بڑی ڈائن ہے تمہیں اندازہ نہیں میری ردا کی موت کی سراسر وہی ذمہ دار ہے اور آزر نے اٹھا کر میری رمشا بھی اس ڈائن کی جھولی میں ڈال دی زینب! جب میں یہ سب سوچتی ہوں تو مجھے نہ دن میں چین ملتا ہے نہ رات میں سکون۔'' وہ بہت آزردہ و بے چین تھی۔
زینب بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''رمشا خوش ہے؟'' کچھ دیر بعد زینب نے پوچھا۔
''اس نے میری خاطر سمجھوتا کر لیا ہے آزر نے رمشا کو نکاح پر مجبور کرنے کے لیے مجھے طلاق دینے کی دھمکی دی تھی جس کی وجہ سے میری بچی نے زندگی داؤ پر لگا دی۔''
کہہ کر جیسے اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زینب اسے ساتھ لگا کر تھپکنے لگی۔
''نا معلوم خدا نے مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے زینب آزر جس نفرت سے مجھے دیکھتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں زمین میں گڑ جاؤں۔ وہ میری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ آدھی رات کو گھر آتا ہے اور صبح سویرے آفس چلا جاتا ہے میرے ہاتھ سے اسے کھانا پینا، کچھ بھی لینا انتہائی ناگوار لگتا ہے وہ چیز ہی اٹھا کر مجھ پر چینتا ہے چلاتا ہے۔ میں اس کے سامنے نہیں جاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں جی چاہتا ہے اپنی جان لے لوں۔''
وہ بری طرح سے ٹوٹی ہوئی تھی۔
''ایسا نہ سوچو اچھی باتیں سوچو۔'' زینب اسے سمجھانے لگی۔
''رمشا نے یہی تو اسے دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے مجھے طلاق دی تو اسے اسی روز رمشا کی خودکشی کی خبر مل جائے گی جس پر وہ کچھ رکا ہے ورنہ شاید وہ اسی دن مجھے طلاق دے دیتا۔ زینب میں کیا کروں کس کے پاس جاؤں۔ منصور کہتا ہے تمہاری غلطی ہے۔ تمہارا گناہ ہے۔ تمہیں آزر کے پاؤں پکڑ کر بھی معافی مانگنی پڑے تو مانگ لو لیکن میں جانتی ہوں میں ایسا کچھ کر بھی لوں گی تو بھی وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔''
صالحہ چائے لے کر آ رہی تھیں۔ سونیا اپنے آنسو پونچھنے لگی۔
''میں کشف سے ملنے آئی تھی شاید وہ مجھے معاف کر دے شاید مجھے کچھ سکون مل جائے۔''
وہ بہت ڈسٹرب تھی۔
صالحہ چائے ان کے آگے رکھ کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔
''تم سنبھالو خود کو سونیا! آزر بھائی تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں کریں گے ابھی نیا نیا صدمہ ہے آہستہ آہستہ

وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' زینب اسے یہی دلاسا دے سکتی تھی سو نیا بولی۔

''میں جانتی ہوں اسے، وہ کتنا کم ظرف اور تنگ دل ہے، وہ کبھی بھی مجھے معاف کرے گا نہ اپنی زندگی میں جگہ دے گا۔ اماں جان کی پوری شہ حاصل ہے اسے۔ انہوں نے اس دن سے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ ابھی آتے ہوئے بتا کر آئی ہوں تو مجھے دیکھ کر اماں نے منہ پھیر لیا اتنی نفرت ہے دونوں کے دلوں میں کہ مجھے خود سے گھن آنے لگی ہے زینب۔'' وہ پھر رونے لگی تھی۔

اور زینب کو لگا جیسے اس کے پاس تسلی کے لیے الفاظ بھی ختم ہو گئے ہیں وہ خاموش اسے روتا دیکھتی رہی جس طرح سالوں پہلے سونیا اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ قدرت کے حساب رکھتی ہے۔ اسے سوچنے پر شدید حیرت ہو رہی تھی۔

وہ بس آہستگی سے اس کا ہاتھ تھپکتی رہی۔

☆☆☆

''بابا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' بلال باپ کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔

''بلال میری یہیں تک برداشت تھی شاید میں مزید کچھ سال اور یہ سب برداشت کر لیتا مگر شاید اس کی نوبت نہ آتی تمہاری ماں خود مجھ سے آزادی مانگ لیتی۔''

بلال باپ کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

''وہ چلی گئیں۔'' وہ شدید صدمے میں تھا۔

حیدر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ مجھ سے ملی بھی نہیں اور.....'' وہ بے یقین سا ہو رہا تھا۔

''اپنی کسی دوست کی طرف اپنا سامان اٹھا کر چلی گئی ہے حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ عدت کے دن یہاں گزارے۔ میں آفس کے ریٹائرنگ روم میں اتنا عرصہ رہ لوں گا مگر اس نے کہا اسے اب اس گھر میں ایک منٹ بھی نہیں گزارنا۔'' حیدر ہولے سے بولا۔

اس کی طرف ایک کاغذ بڑھا کر دیکھنے لگا۔

''یہ ایڈریس ہے اس گھر کا، جہاں وہ آج کل ہے اس نے کہا تھا اگر بلال مجھ سے ملنے کے لیے آنا چاہے تو یہاں آ سکتا ہے۔''

بلال اس کاغذ پر لکھے پتے کو گھورتا رہ گیا۔

ایسا تو اس نے کبھی نہیں سوچا تھا —— ان دنوں میں بھی نہیں جب اس کے ماں باپ کے درمیان زیادہ لڑائی جھگڑے ہوتے تھے اور اب اس عمر میں آ کر.....''

وہ گنگ سا کاغذ پر لکھی تحریر کو گھورتا رہا حیدر اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''ایما! اب اس رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں، کل رات کی تمہارے بابا نے نکاس کنفرم کروا لی ہیں۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔'' ان تینوں میں سے زریں سب سے زیادہ خوش تھی واپسی پر، ایما نے گہرا سانس لے کر آنکھیں مسل ڈالیں۔

''اس نے ٹھیک کہا تھا ماما! جو محبت ہماری قسمت میں نہیں ہے وہ ہمیں یوں رونے دھونے پر بھی مل نہیں سکتی۔'' وہ بے حد رنجیدہ تھی۔

''لعنت بھیجو اس پر وہ تمہیں ڈیزرو ہی نہیں کرتا تھا تمہارے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ اس سے بہتر رشتے

مل جائیں گے جو صرف تمہیں چاہیں گے تمہاری چاہت کریں گے۔ یوں سائے کے پیچھے بھاگنے سے کیا فائدہ۔'' زریں اس کے بال سنوارتے ہوئے تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

''بھائی بھی جانے سے پہلے ہم سے مل کر نہیں گئے۔'' ایما کو خیال آیا زریں ایک دم سے چپ ہوگئی۔

''وہ تو بہت پہلے ہم سے بہت دور جا چکا ہے۔ اس کا ملنے کے لیے آنا یا نہ آنا ایک سی بات ہے۔'' یہ زریں کہہ رہی تھی ایما نے حیرت سے دیکھا۔ جس دن سے زریں کو پتا چلا تھا۔ موحد نے کشف سے شادی کر لی ہے زریں کو لگا جیسے موحد اب کبھی اس کو نہیں مل سکے گا وہ اس سے بہت دور چلا گیا ہے۔

وہ اٹھ کر بچی کھچی پیکنگ کرنے لگی۔ ایما اسی طرح گہری سوچ میں گم بیٹھی رہی۔

☆☆☆

آج کلینک میں موحد کا دوسرا دن تھا۔

پہلے دن تو اس گاؤں کے لوگ آتے رہے تھے اور حیران ہو کر موحد کو دیکھتے تھے کہ اتنے دور دراز کے علاقے میں بھی کوئی ڈاکٹر آ سکتا ہے جہاں کی ڈسپنسری میں ایک ہفتہ پہلے تک خچر باندھے جاتے رہے تھے۔

آج وہ کشادہ ڈسپنسری ڈاکٹر اور ضروری سامان کے ساتھ کچھ اور ہی منظر پیش کر رہی تھی۔

فرزند علی اور اس کی بیوی نے پچھلے پورے ہفتے کام کر کے اس کلینک کو چمکا دیا تھا جس طرح انہوں نے رہائش میں ملنے والے کوارٹر کو رہائش کے قابل بنا ڈالا تھا۔

چھوٹے بچے تھے خوب صورت چمکیلی آنکھوں اور خشک جلد والے چہروں کے ساتھ دروازوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر اس نئے ڈاکٹر کو دیکھتے تھے اور کبھی شرما کر اپنے میلے سویٹروں میں منہ چھپا لیتے۔ جہاں دیدہ بوڑھے تھے جو موحد کو جانچتی نظروں سے دیکھتے اور دل میں سوچتے یہ یہاں کتنے دن مزید ٹکے گا۔

خوب صورت چہروں والی، مکھن سے بنی دوشیزائیں تھیں جو موحد کو رستے میں دیکھ کر اپنی رنگین اوڑھنیوں کو دانت میں دبا کر آدھے چہرے کو چھپا کر شرماتیں۔

کشف بھول چکی تھی کہ اس کا موحد کے ساتھ کوئی مجبوری کا ساتھ تھا یا اس نے یہ رشتہ کسی ضد میں آ کر جوڑا تھا وہ تو اس حسین وادی اور اس کے خوب صورت باسیوں کو دیکھ دیکھ کر جیسے اپنی بصارتوں کو تر و تازہ کرتی رہتی۔

اس نے فرزند علی کی بیوی صومیہ گل کے ساتھ مل کر اس چھوٹے سے کوارٹر کو گھر بنا ڈالا تھا۔

کلینک کے لیے موحد کو بہت سی ضروری دوائیں خریدنا تھیں اور کشف کو گھر کے کچن کے لیے ضروری سامان اور اپنے لیے گرم کوٹ ٹوپی مفلر وغیرہ وہ دونوں وادی سے نکل کر پچھلے قصبے کے بازار میں آئے تھے جہاں بھوک لگنے پر موحد نے گرم گرم چپلی کباب کے ساتھ پودینے اور املی کی چٹنی لی تھی اور تیز مرچوں کی وجہ سے کشف نے وہ کباب سوں سوں کرتے کھائے۔

وہ جس دن سے آئی تھی۔ اسے فلو اور زکام سا ہو گیا تھا جو یقیناً اس سخت موسم کی وجہ سے تھا۔

لیکن اسے یہ زکام اور فلو بھی اچھا لگ رہا تھا۔

''ہم آنی کو یہاں بلا لیں موحد!'' اس نے ٹھنڈی سیون اپ کا بڑا گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے اچانک کہا۔

موحد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

یہ دھوپ چھاؤں سی لڑکی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

''آنی کے ساتھ لڑائی ختم ہوگئی۔'' اس نے چھیڑا۔

''لڑائی تو نہیں تھی کوئی۔'' وہ صاف مکر گئی۔

''مگر دشمنی تو تم نے خوب نبھائی۔ان کے ساتھ انہیں بیماری کی حالت میں وہاں چھوڑ کر خود مزے کرنے یہاں آ گئیں۔'' موحد کی بات پر وہ جیسے اچھل ہی پڑی۔

''مزے کرنے میں یہاں مزے کر رہی ہوں برف جیسے پانی میں ہاتھ ڈالیں تو لگتا ہے انگلیاں ہی ساتھ نہیں رہیں ہاتھ کے۔اتنی سخت سردی میں گھر کا سارا کام کرتی ہوں آپ کے نزدیک یہ مزے ہیں۔'' وہ غرائی تو موحد ہنس پڑا۔

''اب مجھ میں آیا تم آنی کو کیوں یہاں بلانا چاہتی ہو۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔

''کیا مطلب؟'' کشف چونکی۔

''تاکہ تمہیں جو یہ گھر کے کام کرنے پڑتے ہیں ان سے تو جان چھوٹ جائے گی۔'' موحد شاید آج اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

''یعنی آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں ہڈ حرام ہوں۔'' وہ لال پیلی ہوئی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' اس کے تیور پر موحد کچھ گھبرایا۔

وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔بیگ کندھے پر ڈالے چلنے کے لیے تیار۔

''یار! کھانا تو کھالو پلیز کشف! میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' وہ اب کے کچھ شرمندہ سا ہو کر بولا۔

''آپ کھائیں پیٹ بھر کر ٹھونسیں۔سارا کھانا میں کھا چکی اور باہر گاڑی میں ہوں۔آنا ہو تو آ جایئے گا۔''

اس کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا اور اب وہ کسی طرح دوبارہ کھانا کھانے نہیں بیٹھے گی۔موحد سمجھ چکا تھا۔

بل ادا کر کے وہ بھی تیزی سے باہر نکل آیا جہاں وہ گاڑی میں بیٹھی تھی اور باہر ہر طرف سیاہ بادل چھا چکے تھے۔

''یا اللہ خیر اب راستے میں تو بارش نہیں ہو۔اتنی پھسلن ہو جاتی ہے سڑکوں پر۔'' موحد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہے اس بہانے جان چھوٹ جائے گی آپ کی مجھ سے۔'' وہ ناراضی سے منہ پھیر کر بولی۔

''بی بی! یہاں جو جان چھٹتی ہے۔اکیلے کی نہیں چھٹتی دونوں ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے والا معاملہ ہوتا ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

کشف نے گھور کر اسے دیکھا،اسے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی بے ساختہ مسکرا دی۔

☆☆☆

انہیں یہاں آئے ایک مہینہ ہونے والا تھا۔

حسین نظاروں سے کشف کا عشق کم نہیں ہوا تھا بلکہ بڑھ گیا تھا۔

موحد کے ساتھ اس کی اچھی انڈر سٹینڈنگ ہو چلی تھی پیچھے کی یادیں اسے بہت کم آتیں۔آتیں بھی تو وہ سر جھٹک دیتی۔

اس روز بھی سر شام بارش شروع ہو گئی تھی اور بادلوں کے تیوروں سے لگ رہا تھا۔یہ بارش رات بھر برسے گی کشف تو سر شام ہی بستر میں گھس گئی۔

موحد ابھی کلینک سے نہیں آیا تھا جب باہر دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔وہ کسلمندی سے اٹھتی دروازہ کھولنے گئی اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر بے یقین سی دیکھے گئی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مونا شاہ قریشی

پیارا عید

pklibrary.com

''تائی اماں اور تایا ابا پھر سے ناراض ہیں۔'' سفید اور کالے بکرے کو آپس میں سینگ مارتے ہوئے دیکھ کر وہاج نے منہ لٹکا کر کہا۔

''بالکل ایسے ہی لڑتے ہیں جیسے یہ دونوں جھگڑا کر رہے ہیں۔'' دائم نے غور سے بکروں کی گھمسان کی جنگ

دیکھ کر تجزیہ پیش کیا۔ عمائلہ نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔

''سارے کے سارے اندھے بنے بیٹھے ہیں۔'' لاریب ان کے سر پہ آ کر چیخی تھی۔

''کیا مصیبت ہے، کبھی تمیز سے بھی واسطہ رکھا ہے تم نے۔'' اس کے اچانک چیخنے پر ہڑبڑاتے ہوئے وہاج بھنایا۔

''تم نے جو تمیز سے دوستی رکھی ہوئی ہے، وہ بہت ہے، سامنے قربانی کے جانور لڑ رہے ہیں اور تم لوگ سر جوڑ کر تماشا دیکھ رہے ہو۔'' وہاج کے بھنانے پر وہ پھر سے چیخی۔ دائم نے منہ بگاڑ کر گھاس پر سے اٹھتے ہوئے ہاتھ جھاڑے تھے۔

کمر پر ہاتھ رکھے وہ غضب ناک نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''اب کھاؤ گی کیا؟'' اس کے گھورنے پر پاس سے گزرتے ہوئے وہاج نے آنکھیں نکالیں۔

''یہ دیکھو، بخش دو مجھے، ایسا سڑا ہوا گوشت کھانے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔'' دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ بے زاری سے بولی۔

''ہونہہ۔'' ہنکارا بھرتے ہوئے وہاج نے سر جھٹکا اور وہ دونوں بکروں میں صلح کروانے چل پڑے۔

گھاس پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے لاریب نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

''تمہارے اماں ابا پھر سے مشرق مغرب بنے ہوئے ہیں۔''

عمائلہ نے اسے گرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''ہیں۔'' وہ نیچے پسر کر گرتے ہوئے ایک دم سیدھی ہوئی تھی۔

''یہ افواہ کس نے اڑائی ہے اب؟'' اسے اچنبھا ہوا۔

''لو بھلا! جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے۔'' عمائلہ نے اس کی بے خبری پر چوٹ کی تھی۔

''صبح تایا ابا ناشتہ کیے بنا گئے ہیں پلازے پر اور تائی اماں نے پوچھا تک نہیں۔'' وہ طبیعت خرابی کے باعث آج ناشتے کی میز پر موجود نہ تھی تب ہی لاعلم تھی۔

''اوہ!'' اس کی بات پر لاریب نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ہر ماہ وہ دونوں پورے زور و شور سے جھگڑتے تھے۔ پوری زندگی انہوں نے اسی چوہے بلی کے کھیل میں گزار دی تھی۔ پیار اتنا کہ دو گھڑی کا ہجر برداشت نہ ہو اور اگر لڑنے پر آئیں تو پیٹھ کیے بیٹھے رہیں چونکہ ان کا جھگڑنا اب عام بات ہو چکی تھی تو کسی نے بھی خاص توجہ نہیں دی تھی کیونکہ ہمیشہ ان کی لڑائی کسی فضول بات یا بحث پر ہوتی تھی اور پھر خود ہی جانے کب مان بھی جاتے تھے۔ گھر والے ان روز روز کے جھگڑوں سے عاجز آ چکے تھے اس لیے اب پوچھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''ویسے اس عمر میں فساد جچتا نہیں ہے، نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کی طرح منہ بنا کر ایک دوسرے سے روٹھے رہتے ہیں پھر صلح کی خبر بھی نہیں ہونے دیتے۔''

دائم نے بکروں کو صلح کی جھنڈی تھما کر چارہ ڈالا اور ان کے پاس چلا آیا۔

''تمہیں کیا مسئلہ ہے، جب وہ کسی کو کچھ کہہ نہیں رہے تو تم کیوں تبصرے کر کے خون جلا رہے ہو۔'' لاریب کو ان کا یوں موضوع گفتگو بننا برا لگا تھا۔

''او بھائی! رہنے دو تم۔'' لاریب کا بگڑتا موڈ دیکھ کر وہاج نے دائم کے آگے ہاتھ جوڑے تھے جس پر وہ خاموشی سے اپنا موبائل نکال کر اس میں غرق ہو گیا تھا۔

''میں پھپھو کی طرف جا رہا ہوں۔'' وہاج نے جاتے ہوئے اطلاع دی۔ عمائلہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جاؤ بھئی! جب تک دیدار محبوب نہیں ہوگا،

تمہاری روٹی کیسے ہضم ہوگی۔"

لاریب نے اس کے صبح شام پھپھو کے گھر جانے پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

لاریب کی بھی ہنسی چھوٹ گئی جسے چھپانے کی اس نے قطعی زحمت نہیں کی۔ اپنا مذاق بنتا دیکھ کر وہ جل کر وہاں سے پیر پٹختا ہوا نکل گیا تھا۔

☆☆☆

آج ان کی ناراضی کو پانچواں دن ہونے کو آیا تھا۔ بشریٰ نے تشویش سے ان دونوں کے روٹھے انداز کو دیکھا تھا۔ لاریب خود بھی پریشان ہو چکی تھی۔ پہلے کبھی ان کی ناراضی اتنی طویل نہ ہوئی تھی جتنی اب کی بار ہو چکی تھی۔

"ہاں بھئی! جانور ذبح کرنے کے لیے قصائی کا پتا کیا ہے کسی نے؟"

بڑے ابا ناشتے سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے اپنے دونوں بیٹوں سے مخاطب ہوئے۔ جلیل اور خلیل نے بیک وقت ایک دوسرے کی شکل دیکھی تھی۔ جلیل تو اپنی لڑائی میں اس بات کو یکسر فراموش کر چکے تھے اور خلیل بھی کام کے سلسلے میں الجھ کر بھول گئے تھے۔

"نہیں بڑے ابا! اب کی بار وہاج اور دائم نے قصائی بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں بہت اچھی طرح ذبح کریں گے یہ دونوں۔"

عمائلہ نے فوراً جوش سے کہا جس پر وہاج کو چائے پیتے ہوئے زور کا اچھو لگا اور وہ گلا پکڑ کر کھانسنے لگا۔

بشریٰ نے جھٹ سے اس کی پشت کو سہلایا تھا۔ قربانی میں محض تین دن بچے تھے، اتنی جلدی تو قصائی کا انتظام ہو نہیں سکتا تھا۔ عمائلہ کی بات سن کر دونوں بھائیوں نے سکون کی سانس لی تھی کہ بچے اس ذمہ داری کو نبھانے کو تیار تھے تو انہیں کیا اعتراض تھا جبکہ بڑے ابا تشویش سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

"برخوردار! بیٹی کیا کہہ رہی ہے؟"

بڑے ابا کی عادت تھی وہ گھر کی سب بیٹیوں کو بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ دائم نے ان کی بات پر جھٹ سے سر ہلایا تھا۔

"جی بڑے ابا! ہم کر لیں گے دونوں مل کر۔"

مری ہوئی آواز میں کہتے ہوئے دائم کا دل چاہ رہا تھا کہ عمائلہ کا گلا دبا دے جو پراٹھے کے نوالے اسے چڑا چڑا کر فخر محسوس کر رہی تھی۔

انہوں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا تھا اور اخبار اٹھا کر ناشتے کی میز سے اٹھ گئے تھے۔

جلیل اور خلیل بھی ناشتہ ختم کر کے اٹھ چکے تھے۔ بشریٰ خلیل کے پیچھے انہیں دروازے تک چھوڑنے گئی تھیں جبکہ نبیلہ سوجا ہوا منہ لے کر باورچی خانے کی جانب چلی گئی تھیں۔

میدان صاف ہوتے ہی وہاج تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور جوس کا گلاس اٹھا کر عمائلہ کے سر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

پرانڈیل دیا تھا۔

''پہلے اس بکری کو حلال کر لیتے ہیں، ان بکروں کو تو بعد میں دیکھیں گے۔''

دانت پیستے ہوئے وہاج نے جوس کا دوسرا گلاس بھرا تھا۔ دائم بھی اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

''ہاں! ہاں! ہم تو پیشہ ور قصائی ہیں۔ اچھے سے ذبح کریں گے۔''

اس کی پونی کھینچ کر دائم نے بھی دانت کچکچائے تھے۔ ان دونوں کو دائیں بائیں دیکھ کر عمائلہ بوکھلا گئی تھی۔

''ہاں تو ٹیڈی بکری! کہیے کس چیز سے حلال ہونا پسند فرمائیں گی آپ.....؟'' وہاج نے اس کی حالت کا مزا لیتے ہوئے کہا۔ لاریب کو ان کی حرکتیں دیکھ کر غصہ آ گیا۔

''چاچی! چاچی!''

حلق پھاڑ کر چلاتے ہوئے اس نے بشریٰ کو پکارا تھا۔ جو اگلے ہی لمحے گھبرائی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھیں۔

''کم بخت! منحوس مارو! بہن کی جان نکالو گے کیا۔'' اندر داخل ہوتے ہی وہ سیدھی ان کی جانب آئی تھیں اور دو دو ہتڑ دونوں کی کمر پر جڑ کر انہیں عمائلہ سے دور کیا تھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ مصنوعی آنسو بہاتی ہوئی فٹ سے ان کے سینے سے لگی تھی۔

''اس نے جو ہماری عزت کا جنازہ نکالنے کا سوچا ہے اس کا کیا کریں۔ ہم نے قصائی بننے کی کلاسیں لی ہوئی ہیں جو ہم بکرے حلال کریں گے، اب بڑے ابا کو انکار کون کرے گا۔''

وہاج کی تو جان نکل گئی تھی اس بات پر.....

''کیا غلط کہا ہے اس نے، بڑی سستی عزت ہے تمہاری جو کام کرنے پر موت آ جاتی ہے اسے۔ تمہارا اچار ڈالوں گی میں۔ منحوس شکلیں لیے سارا دن پڑے رہتے ہو یا تھوتھنے رہتے ہو۔ میں پوچھتی ہوں تم لوگ بھی اس گھر کے کاموں میں کوئی حصہ لو گے یا چوڑیاں پہنا کر بنو بنا کر بٹھا دوں تمہیں میں۔''

ٹکا کر لتے لیتے ہوئے وہ مسلسل عمائلہ کی پیٹھ سہلا رہی تھیں۔

لاریب نے ان کی درگت پر قہقہے کا گلا گھونٹا تھا۔

''چلو جاؤ شاباش! کپڑے بدلو۔''

عمائلہ کو پچکار کر انہوں نے اندر بھیجا اور انہیں بری طرح گھورتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی لاریب کا بلند قہقہہ در و دیوار سے ٹکرایا تھا۔

''یار! تم دونوں بنو بن کر کیسے لگو گے پیلا جوڑا ابٹن، تیل اور مہندی۔''

ہنس ہنس کر دوہرا ہوتے ہوئے وہ انہیں تصور میں بنڑی بنے دیکھ کر اچھی طرح لطف اندوز ہوئی تھی۔ تلملا کر باہر نکلتے ہوئے دائم نے بچا ہوا جوس اس کے منہ پر پھینک کر دے مارا تھا۔

اور پھر دونوں دوڑتے ہوئے وہاں سے رفو چکر ہو گئے تھے۔

''ذلیل انسان.....'' چیخ کر انہیں پکارتے وہ ان کے پیچھے دوڑی تھی مگر تب تک وہ چھوٹا سا لان عبور کر کے داخلی دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ غصے سے کمرے میں جاتے ہوئے وہ مسلسل انہیں کوسنے دے رہی تھی۔

☆☆☆

بشریٰ نے باورچی خانے کا کام سمیٹ کر نبیلہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ابھی وہ اس کے کمرے کی طرف جا ہی رہی تھیں کہ ثمینہ کی آمد ہو گئی۔ سلام دعا کے بعد وہ ان کے ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی تھیں۔

''جلیل بھائی اور نبیلہ بھابھی سے بات کرنے آئی ہوں، مجھے فون آیا تھا جلیل کا۔ خاصے غصے میں تھے اور نبیلہ پر بھڑک رہے تھے۔''

ان کے انداز میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔

بشریٰ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ ثمینہ نے فون کر کے جلیل کو گھر پر بلا لیا تھا، بڑے ابا سے چھپ کر

وہ پہلے خود بھائی کی خبر لینا چاہتی تھیں کیونکہ جو بات انہیں جلیل نے بتائی تھی اس پر وہ خود بھی خاصا پریشان ہوگئی تھیں۔

جلیل اور خلیل دو ہی بھائی تھے۔ بڑی بہن ثمینہ بیاہ کر چچا کے گھر گئی تھیں جو برابر والے گھر میں قیام پذیر تھے۔ ان کی دو ہی اولادیں تھیں ثقلین اور عینا.....

شادی کے کئی سال بعد بھی جلیل کو اللہ نے اولاد کی نعمت سے نہ نوازا تو نبیلہ کی بہن نے اپنی پانچ سالہ بیٹی لاریب ان کی جھولی میں ڈال دی اور یوں لاریب جلیل اور نبیلہ کی بیٹی بن کر اس گھر میں رہنے لگی جبکہ خلیل کے تین بچے تھے۔

وہاج، دائم اور عمائلہ..... بڑی اماں کی وفات کو آٹھ سال ہو چکے تھے۔

گھر کے بزرگ رحیم صاحب بڑے ابا تھے جو سارا دن اخبار، ٹی وی پر خبروں اور مسجد میں دوستوں کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ نبیلہ کے کمرے میں ثمینہ، بشریٰ اور جلیل موجود تھے۔ لاریب نے بڑوں کو مذاکرات کے لیے کمرے میں جاتا دیکھ کر سب کو اکٹھا کرلیا تھا۔

عمائلہ، عینا اور لاریب دروازے کے دائیں طرف کان لگائے اوپر نیچے کھڑی تھیں جبکہ دائم، وہاج اور ثقلین بائیں طرف کان دھرے دروازے میں گھسنے کو ہو رہے تھے۔ اندر سے باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں ـــــ آرہی تھیں جو سب سننے کی بھرپور کوشش میں تھے۔

''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لاریب کی شادی ثقلین سے ہوگی تو پھر یہ ضد کیوں لگا رہی ہے کہ لاریب کے لیے وہاج کا انتخاب کروں۔''

جلیل صاحب کی دبی دبی غصے میں بھری آواز ابھری تو اوپر تلے کھڑے سب نفوس دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ ان کے ہونق چہروں پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔

''یار امیرا تو اس میں کوئی قصور نہیں، مجھے تو اس ملبے تلے سے نکالو۔''

سب سے نیچے دبے دائم نے کراہ کر دہائی دی تھی۔ وہاج نے اٹھتے ہوئے خون خوار نظروں سے لاریب کو دیکھا تھا۔ وہ بھی خون پی جانے والی نظروں سے وہاج اور ثقلین کو گھور رہی تھی۔

''دیکھیں آپا! برا مت مانیے گا ثقلین بھی بہت اچھا بچہ ہے مگر میرا اپنا دل وہاج کے لیے ہے۔''

نبیلہ نے معذرت خواہانہ انداز میں ثمینہ سے کہا تھا۔ بشریٰ اور ثمینہ تو بالا ہی بالا ان کے رشتہ طے کرنے پر حق دق بیٹھی تھیں۔

''میں نے آپ سے ایک بار بات کی تھی آپا! آپ کو لاریب بہت پسند ہے اور اسے بہو بنانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے آپ کو۔ یہی کہا تھا نا آپ نے؟''

جلیل نے بہت دنوں پہلے کہی بات یاد دلائی۔ ثمینہ نے میکانکی انداز میں سر ہلا دیا۔ انہیں یہ بات اچھی طرح سے یاد تھی۔

''بات تو میں نے بھی کی تھی بشریٰ سے۔ بشریٰ یاد ہے نا! میں نے وہاج کے لیے لاریب کا پوچھا تھا اور تم نے مسکرا کر رضامندی ظاہر کی تھی۔''

نبیلہ کی یاددہانی پر بشریٰ کا سر بھی اثبات میں ہلا تھا۔ یونہی سرسری سے تذکرے پر دونوں میاں بیوی رشتہ پکا کر کے بیٹھ گئے تھے۔ ان دونوں کو لاریب کو بہو بنانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ دیکھی بھالی، سلجھی ہوئی، تمیز دار بچی تھی مگر وہ ایک پر راضی ہوں تو تب نا! دونوں اپنی اپنی مرضی کر رہے تھے اور اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

''لو بھئی، گئی بھینس پانی میں۔''

دائم نے دروازے سے چپک کر سنتے ہوئے گہرا سانس لے کر کہا۔ باقی سب پہلے ہی بات سن کر ذرا فاصلے پر ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''کیا بنا؟'' عمائلہ نے اشارے سے دائم سے پوچھا۔

''لاریب بی بی کا فٹ بال بننے کا وقت ہوا

چاہتا ہے۔ تائی اماں ہماری طرف لڑھکائیں گی اور تایا ابا پھپھو کی طرف....." دائم نے کندھے اچکا کر تاسف کا اظہار کیا۔

لاریب تو گم صم ہو کر ناخن چبانے لگی تھی۔

وہاج کن انکھیوں سے عینا کو دیکھ رہا تھا جو کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔

"یہاں سے چلو اب، مل کر کچھ سوچتے ہیں۔" ثقلین نے وہاں سے چلنے کو کہا جس پر سب وہاج اور دائم کے کمرے میں چلے گئے۔ تینوں لڑکیاں بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں اور لڑکے صوفے پر براجمان ہو گئے تھے۔

"ہاں بھئی، کیا کرنا ہے اب۔" دائم نے بیٹھتے ہی ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

"کل سنگاپور کی میٹنگ رکھ لیتے ہیں میری فلائٹ بک کروا دو اور ہاں آج دوپہر میں سائیٹ پر غیر ملکی وفد کے ساتھ میٹنگ کا انتظام کرنا ہے ٹھیک ہے۔"

اس کے انداز پر وہاج نے خالصتاً پروفیشنل انداز میں طنزیہ کہا جس پر سب مسکرا اٹھے تھے ماسوائے لاریب.....

اپنی بے عزتی پر دائم نے کڑوا سا منہ بنایا تھا۔

"محترم! مل کر سوچنا ہے، سب اپنی اپنی آرا پیش کریں گے اور پھر حل نکالیں گے۔ ہم یہاں بزنس نہیں چلا رہے جو دو منٹ میں پلان بنا کر مکمل کر لیں۔" وہاج نے ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی اس کی۔

"بڑے ابا کو بتا دیتے ہیں، وہ خود ہی معاملہ سنبھال لیں گے۔" لاریب نے تجویز پیش کی۔

"نہیں! میرا خیال ہے ہمیں انتظار کرنا چاہیے ہو سکتا ہے، امی اور مامی بشریٰ ان میں سے کسی کو قائل کر لیں۔"

ثقلین کی بات کی سب نے سر ہلا کر تائید کی تھی۔ پھر سب نشست برخاست ہونے کا انتظار کرنے لگے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد سب باہر آئے تھے۔

"میں پوچھتی ہوں جا کر پھپھو سے۔"

لاریب اٹھتے ہوئے بولی اور چپل پیروں میں اڑس کر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں کوئی موجود نہ تھا۔ اس نے حیرانی سے آگے بڑھ کر دیکھا تھا۔

جلیل صاحب بھی پلازے پر واپس جا چکے تھے جبکہ نبیلہ کمرے میں ہی موجود تھیں۔ وہ سیدھی بشریٰ چاچی کے کمرے کی جانب چلی آئی۔ پھپھو اور وہ وہیں موجود تھیں۔

"السلام علیکم پھپھو۔" وہیں ان کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" ثمینہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بشریٰ کی جانب دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلا تذبذب انہیں بھی الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

"پھپھو! وہ دراصل مجھے اماں اور ابا کے بارے میں پوچھنا تھا۔" وہ رک رک کر بولتے ہوئے ہچکچائی۔ اس کی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے ثمینہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"صلح ہو گئی ہے یا....." اس کے ادھورے سوال پر ان کا سر نفی میں ہلا تھا۔

"دونوں بہت ضدی ہیں اور اس بار تو اتنی بڑی اور پیچیدہ ضد لگا لی ہے کہ ہماری تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ انہیں کیسے سمجھائیں۔ ساری زندگی ایک دوسرے کی بات سے اختلاف میں گزار دی۔" وہ ان کے بچپنے پر شدید نالاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"چلو، باقی باتیں تو دیکھی جاتی ہیں مگر اتنے حساس معاملے پر دونوں بچوں کی طرح کھینچا تانی کر رہے ہیں۔" بشریٰ کے لہجے سے افسوس چھلک رہا تھا۔

"تم پریشان نہ ہو بیٹا! ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔" اسے افسردہ دیکھ کر پھپھو نے جھٹ سے دلاسا دیا تھا۔ جس پر وہاں سے مرے مرے قدم اٹھاتی وہ باہر نکل آئی تھی۔

"کیا ہوا؟"

اسے اندر آتا دیکھ کر عینا نے بے تابی سے پوچھا جس کا لٹکا منہ ساری کہانی بتا رہا تھا۔

"وہی ڈھاک کے تین پات ہیں۔" ڈھیلے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے اطلاع دی۔ سب تاسف سے سر ہلا کر رہ گئے۔

"میرے ذہن میں ایک بہترین تجویز آئی ہے۔" بہت دیر سے ہونٹ کاٹ کر سوچتی ہوئی عائلہ نے مجسس پھیلایا سب یک لخت ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ دھیرے دھیرے اپنی تجویز بتانے لگی۔ بات کے اختتام پر ثقلین اور وہاج دونوں اچھل پڑے تھے۔

"میں ہرگز یہ نہیں کروں گا۔" وہاج نے سرے سے ہی انکار کر دیا۔ عینا نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ البتہ ثقلین نے ہچکچاتے ہوئے ہاں کر دی تھی۔

"اگر تم محبت جیتنا چاہتے ہو تو یہ کرنا پڑا گا ورنہ ثقلین یہ کر لے گا اور تایا ابا تمہیں لاریب سے بیاہ دیں گے۔"

عائلہ نے اس کے انکار پر مستقبل کی پیش گوئی کی جسے سن کر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کسی کے لیے یہ کرنا تو پڑے گا۔"

کن انکھیوں سے عینا کو دیکھتے ہوئے عائلہ نے معنی خیزی سے کہا۔ لاریب نے عائلہ کی چلتی زبان کی وجہ سے اس کی پیٹھ پر چٹکی بھری تھی۔ جس پر وہ تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا بکواس کیے جا رہی ہو، ثقلین بھی بیٹھا ہے یہاں....." اسے کھینچ کر بستر پر بٹھاتے ہوئے لاریب نے سرگوشی کی جس پر وہ منہ بنا کر رہ گئی۔

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔"

سرد آہ خارج کر کے وہاج نے ہامی بھری تھی۔ اس کی رضامندی پر ان کا اجلاس بھی برخاست ہوا تھا۔ اب یہ ثقلین اور وہاج کی ذمہ داری تھی کہ انہیں اس تجویز کو عملی جامہ کب اور کیسے پہنانا تھا۔

☆☆☆

وقت کم تھا عید آنے میں محض چند روز باقی تھے اور وہ چاہتے تھے کہ عید سے پہلے صلح صفائی ہو جائے۔ گھر کی فضا میں ناراضی کی باس انہیں ہمیشہ کی طرح الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ اگلے روز صبح کے وقت ثقلین کو موقع مل گیا تھا۔ جلیل صاحب ناشتہ کرنے کے بعد پلازے پر جانے کے لیے داخلی دروازے کی سمت بڑھ رہے تھے۔

وہ سویرے ہی یہاں وارد ہو چکا تھا اور آرام سے ناشتہ کر کے لان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے جلدی سے رخ پھیر کر فون کان کے ساتھ لگایا تھا۔

"ہاں یار علی! شادی میں کیا رکھا ہے، زندگی کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے، ایک ہی کھونٹے سے بندھ جاؤ، سارا سکون غارت..... اب تو آزادی کی فضا ہے دوست، یار، گرل فرینڈ لطف ہی لطف ہے۔"

پھکو پن سے ہنستے ہوئے اس نے ٹیڑھی نظروں سے اپنے ماموں کی طرف دیکھا تھا جو اس کی بات سن کر ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"اچھا چل! فون رکھ، پھر ملتے ہیں دوپہر میں....."

کمال اداکاری سے اس نے پہلے سے بند فون کو کان سے ہٹایا تھا۔ جلیل صاحب غصے بھری نظروں سے اسے گھورتے وہاں سے چلے گئے تھے۔ شکر کا سانس لیتے ہوئے ثقلین نے مسکرا کر ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے حظ اٹھایا تھا اور داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

"یہ بائی اماں تو حجرہ نشین ہو گئی ہیں۔"

لاؤنج میں یہاں وہاں چکر کاٹتے ہوئے وہاج ان کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔

"تمہارے برے دن چل رہے ہیں، استغفار کا ورد کر لو یا صدقہ دے دو۔"

صوفے پر پسرے دائم نے گیم کھیلتے ہوئے

اسے مشورہ دیا۔ وہاج نے تیز نظروں سے اس کے بے فکرے وجود کو دیکھا تھا۔

"میں نہیں کر رہا یہ سب....."

جھنجھلا کر پیر پٹختے ہوئے وہاج نے غصے سے کہا۔

"دیکھ بھائی! ٹھکین اپنا کردار ادا کر چکا ہے، اب خدانخواستہ تو ناکام ہو گیا تو پھر بھگتنا تیرے بچوں کی پھوپھو بن کر ان کے لاڈ اٹھائے گی۔" دائم کی پیش گوئی پر اس نے ایک ہی جست میں اس کی گردن دبوچی تھی۔

"کمینے! تو جب بھی بولے گا، کن پھاڑ کر بولے گا۔" دائم نے زور لگا کر خود کو چھڑایا تھا۔

"تیری حرکتیں تیری محبت کی قبر بنا دیں گی۔" گردن مسلتے ہوئے وہ بھی دوبدو بولا تھا۔

"میں تائی اماں کو باہر بھیجتی ہوں کسی طرح، تم لوگ کتے بلی کا کھیل بند کرو۔"

عمائلہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے انہیں دیکھ کر کہا جو ایک دوسرے کو دبوچے کھڑے تھے۔ دائم اپنا کالر درست کرتے ہوئے باہر نکل گیا تھا جبکہ وہ وہیں صوفے پر گر گیا تھا۔

عمائلہ کے جانے کے کچھ دیر بعد نبیلہ باہر آئی تھیں۔ عمائلہ نے ان سے چائنیز کھانے کی فرمائش کی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہاج نے مستعدی سے فون کان پر لگایا تھا۔

"یار! میں تو خاندان میں شادی کسی صورت نہیں کروں گا، ساری زندگی وہی شکلیں دیکھتے رہو بھلا کس بات کی سزا ہے یہ اور ویسے بھی ابھی فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے اس نے کمال اداکاری سے کہا۔ نبیلہ کے قدم تو وہیں جم گئے تھے۔ وہاج نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا تو ایک دم سٹپٹا گیا۔ وہ خون خوار نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں یار میں بس نکلتا ہوں، تم شہریار کی طرف آجاؤ۔" تیزی سے لاؤنج کے داخلی دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے پہلے سے بند فون جیب میں ڈالا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پیچھے کھڑی نبیلہ اس کی بات سن کر فکر مند ہو گئی تھیں۔

شام کو جب جلیل گھر آئے تو ساری ناراضی بالائے طاق رکھے وہ ان کے لیے چائے بنا لائیں۔ وہ تو پہلے ہی بات کرنے کا بہانا ڈھونڈ رہے تھے۔ نبیلہ چائے لاتا دیکھ کر۔ کھل اٹھے تھے۔ نبیلہ نے بھی سکرا کر صلح کا جھنڈا لہرایا تھا۔ جواباً جلیل نے بھی مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا۔

"میں معذرت کرنا چاہ رہی تھی آپ سے، آپ ٹھیک کہہ رہے تھے، ہماری لاریب کے لیے ٹھکین ہی بہتر ہے۔"

ان کے قریب بیٹھتے ہوئے نبیلہ نے ذرا رک کر کہا۔ جلیل نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"معذرت تو میں بھی تم سے کرنا چاہ رہا تھا بیگم! میرا خیال ہے کہ ٹھکین کے بجائے وہاج لاریب کے لیے ٹھیک رہے گا۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے انہوں نے بھی معذرت نامہ پیش کیا۔

"نہیں، نہیں۔ وہاج بالکل نہیں..... آج کل کے بچے اپنی مرضی کے مالک ہیں ہم اپنی بیٹی کسی پر کیوں مسلط کریں۔" تھوڑا ٹھکین ہوتے ہوئے انہوں نے جھٹ انکار کیا۔

"یہی تو بات ہے بیگم! بس اسی لیے میرا دل بھی انکاری ہو گیا ہے ٹھکین کے لیے....."

دونوں ایک دوسرے کی پرزور تائید کر رہے تھے اور پھر اگلے روز صبح سب کو ان کی صلح کی خبر مل گئی تھی۔ عمائلہ تو فخر سے اکڑائے پھر رہی تھی۔ اس کا بنایا منصوبہ کامیاب ہو گیا تھا۔

"زیادہ فخر الزمان بننے کی ضرورت نہیں ہے، تمہارے تھکے ہوئے ڈرامائی منصوبے میں ہماری اداکاری نے جان ڈالی ہے۔" وہاج نے فوراً اس کا فخر خاک میں ملانا چاہا تھا۔

"منصوبہ نہ ہوتا تو کر لیتے اداکاریاں، ناگن ڈانس کرتے رہ جاتے مگر کامیابی نہ ملتی۔ یہ سب میرے منصوبے کا کمال ہے۔" وہ اس کی بات کو خاطر میں لائے بغیر ہاتھ سے ناگن بننے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"ہونہہ!" منہ کے زاویے بگاڑتے اس نے ہنکارا بھرا۔

"تم لوگ کب سے یہاں ڈیرا ڈالے ہوئے ہو، دوپہر ہونے کو آگئی مگر اپنے گھر کی راہ ہی نہیں لے رہے۔" عمائلہ نے ثقلین اور عینا کو صبح سے ادھر ہی براجمان دیکھ کر کہا۔ وہاج کو ایک دم غصہ آگیا۔

"تمہیں کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں؟"

"وہ تو تمہیں اٹھ رہے ہیں۔" وہ دوبدو بولی تو ثقلین نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تم لوگ لڑنا بند کرو، امی ـــــ چچی کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ شام تک آئیں گی تو ہم موقع کا فائدہ اٹھا کر ادھر ہی براجمان ہیں۔"

اس کی اطلاع پر لاریب سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر شام کو پھپھو کا اپنی دیورانی کے ہاں جانے کا عقدہ بھی کھلا تھا۔ پھپھو مٹھائی کا ڈبہ لیے بڑے ابا کے پاس تشریف لائی تھیں۔ جلیل..... خلیل..... بشریٰ اور نبیلہ بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ بڑے ابا کے کمرے میں بڑوں کی محفل جم چکی تھی۔ پھپھو کے شوہر بھی موجود تھے۔ وہ سب نیم وا دروازے سے کان لگائے کھڑے تھے۔ اندر سے باتوں کی صاف آواز آرہی تھی۔ پھپھو اور ان کی دیورانی کی پچھلے سال سے جائیداد کے مسئلہ پر لڑائی چل رہی تھی جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ترک کیا ہوا تھا۔

چھوٹی عید پر ثمینہ نے کوشش کی تھی کہ رابطہ ہو جائے مگر نہ ہو سکا تھا۔ اب خود انہوں نے فون کر کے سارے گلے شکوے ختم کیے تھے تو ثمینہ جھٹ ان سے ملنے چلی گئی تھیں۔ واپسی پر وہ بے انتہا خوش تھیں۔

"عیدیں تو ہوتی اس لیے ہیں کہ جہاں رنجشیں اور گلے ہوں، انہیں مٹا لیا جائے انا بچا کر رشتے کھونا اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ رشتوں پر انائیں قربان کر دینی چاہئیں۔ یہی اصل ایثار ہوتا ہے۔ جہاں ہم اپنا تعلق بچانے کے لیے چھوٹی چھوٹی قربانیاں دیتے ہیں۔"

بڑے ابا بھی بیٹی کی خوشی میں مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی بات پر سب نے سر ہلا کر تائید کی تھی۔ نبیلہ اور جلیل نے شرمندگی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ باہر کھڑی نئی نسل نے بھی بڑے ابا کی بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"آپ کے لیے ایک پیغام بھیجا ہے عتیقہ نے....." ثمینہ پھپھو کی بات پر سب ہمہ تن گوش ہوئے تھے۔

"وہ اپنے بیٹے لئیق کے لیے لاریب کا ہاتھ مانگنا چاہ رہی ہے، ماشاء اللہ سلجھا ہوا بچہ ہے، تعلیم یافتہ اور برسر روزگار ہے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں انہیں بلا لیتی ہوں۔ بھائی اور بھابھی آپ بھی اپنی رائے دے دیں۔"

انہوں نے مسکرا کر جلیل اور نبیلہ کو مخاطب کیا۔ نبیلہ نے اشارے سے شوہر سے رائے مانگی تھی۔ انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔

"ابا! آپ بتائیں۔" جلیل نے باپ سے پوچھا۔

"بھئی! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، اپنوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ تعلقات مزید مضبوط ہوں گے۔ ثمینہ بیٹی! بسم اللہ کرو۔ کل عید ہے انہیں کل دوپہر کے کھانے پر بلا لو، بات پکی کر کے تاریخ رکھ دیں گے۔" بڑے ابا نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی تھی۔ باہر کھڑی عمائلہ کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔

"آہا..... کتنا مزا آئے گا۔" لاریب کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے زور سے بھینچ کر وہ

جوش سے بولی۔ وہاج نے تو سر اٹھا کر شکر ادا کیا تھا۔ لاریب شرماتے ہوئے عمائلہ کو خود سے چپکائے کھڑی تھی۔

''آپا! مجھے بھی آپ سے ایک بات کرنی تھی، ابا! یہ بات اور اجازت آپ سے بھی مشروط ہے۔'' لاریب کی بات کے بعد بشریٰ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں بیٹی کہو۔'' انہوں نے اجازت دی۔

''میں اپنے وہاج کے لیے عینا کا ہاتھ مانگنا چاہتی ہوں۔'' جملہ مکمل کر کے وہ امید بھری نظروں سے ثمینہ کی جانب دیکھنے لگیں۔

''عینا آپ کی ہی بیٹی ہے، آپ جب چاہیں اسے لے جائیں۔'' ثمینہ کے شوہر نے خوش دلی سے کہا۔ باہر کھڑی عینا نے شرما کر اپنے آگے کھڑی عمائلہ کے کاندھے میں سر گھسایا تھا۔ دائم تو وہیں پر بھنگڑا ڈالنے لگ گیا تھا۔

''بھئی بہو! تم نے میرا دل خوش کر دیا ہے یہ بات کہہ کر، اپنی لاریب کے ساتھ کل ان دونوں کی بات بھی پکی کر دیتے ہیں۔'' بڑے ابا بھی دل سے اس رشتے کے لیے خوش تھے۔

ثمینہ اپنے ساتھ لائی مٹھائی کا ڈبہ کھول کر سب کا منہ میٹھا کروا رہی تھیں کہ اچانک نبیلہ پریشانی سے بول اٹھیں۔

''آپ لوگوں کو شاید یہ بات بری لگے مگر یہ سچ ہے، میں نے خود سنا ہے وہاج اپنے دوست سے بات کر رہا تھا کہ اسے خاندان میں شادی نہیں کرنی، وہی گھسے پٹے چہرے دیکھ دیکھ کر انسان بیزار ہو جاتا ہے۔'' ان کی بات پر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ باہر کھڑے وہاج نے بے بسی سے اپنے بال نوچے تھے۔

''یا اللہ کچھ تو کبھی سیدھا ہو۔''

اس کی حالت دیکھ کر بھنگڑا ڈالتے دائم نے قہقہہ لگایا تھا۔ عمائلہ نے پھرتی سے بھاگ کر اس کا منہ بند کرنا چاہا تھا مگر تب تک وہ بے ڈھنگا قہقہہ فضا کے سپرد ہو چکا تھا۔ اندر بیٹھے نفوس نے گونگوں کی طرح ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر اشارہ کیا تھا۔

''نبیلہ ٹھیک کہہ رہی ہے ابا جی! میں نے بھی ثقلین کو بات کرتے سنا تھا، اسے بھی شادی جیسے عذاب میں بالکل دلچسپی نہیں ہے۔ آج کے بچے اپنی مرضی کو ترجیح دیتے ہیں تو بہتر ہے کہ ہم سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔''

خلیل نے بھی ان کی تائید کی تو بڑے ابا غضب ناک ہو گئے۔

''اندر تشریف لاؤ صاحبزادو!''

ان کی پکار پر وہاج نے اچھل کر ثقلین کی طرف دیکھا تھا۔ یعنی انہیں علم تھا کہ وہ باہر کھڑے ہو کر کن سوئیاں لے رہے ہیں۔ لاریب منہ پر ہاتھ رکھے کھی کھی کرتے ہوئے ان کی درگت بنتے سوچ کر خوش ہو رہی تھی جبکہ عینا کا رنگ فق ہوا پڑا تھا۔

ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے وہ مرے مرے قدموں سے اندر داخل ہوئے تھے۔ خلیل، بشریٰ اور ثمینہ نے گھور کر اپنی اولادوں کو دیکھا تھا۔

''ہماری شکلیں دیکھ کر بھی بے زار ہو گئے ہو گے، ایسا کرو پتر ہمیں بیچ کر نئے اماں ابا لے آؤ، وہی گھسے پٹے چہرے دیکھ دیکھ کر زندگی کیسے گزرے گی ہیں۔ الو کے پٹھے! بے زاری ہو رہی ہے انہیں اپنوں کے چہرے سے.....''

دلار سے میٹھا طنز کرتے ہوئے وہ آخر میں کچی مروڑنے والے تاثرات لے آئے ان دونوں نے تھوک نگل کر ان کے طیش بھرے چہرے کو دیکھا تھا۔

''آج تو عید سے پہلے عید ہو گئی ہماری۔'' عمائلہ نے خوشی سے اچھل کر دائم کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔ ان کی بے عزتی اس کے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال رہی تھی۔ عینا نے پیچھے سے زوردار چٹکی بھر کر اس کا مزا غارت کیا۔ شانہ سہلاتے ہوئے اس نے پیچھے سے ٹانگ مار کر بدلہ لیا تھا۔

pklibrary.com

''اندر والے ڈرامے کا مزا لو، یہاں ڈرامہ نہ شروع کرو۔'' لاریب نے ان کے بیچ آ کر پنگے ختم کروائے تھے۔

''وہ بڑے ابا.....''

ثقلین نے رک رک کر کہتے ہوئے وہاج کو دیکھا تھا۔

''جی جی ارشاد!'' خلیل نے دانت پہ دانت جما کر طنزاً کہا۔

''تایا ابا اور تائی اماں کے بیچ لاریب کے رشتے کے لیے لڑائی چل رہی تھی، تائی اماں مجھ سے کرنا چاہتی تھیں اور تایا ابا ثقلین سے، امی اور پھپھو نے بات کرنے کی کوشش کی مگر دونوں اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ اس لیے ہم نے مل کر منصوبہ بنایا اور جھوٹ موٹ کا ڈرامہ کر کے ان کا دل اپنی طرف سے خراب کر کے ان کی جھوٹی انا ختم کی اور یوں ان میں صلح ہوگئی مگر ہمارا کردار مشکوک ہوگیا جو کہ بالکل غلط ہے۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ عید ملنے کا تہوار ہوتا ہے تو اس جھگڑے میں عید منانا کتنا برا لگتا۔'' وہاج نے تیزی سے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی تھی۔ نبیلہ اور جلیل سمیت سب کے منہ کھل گئے تھے۔ بڑے ابا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''کاش! میرے ہاتھ میں لاٹھی ہوتی اور میں اس کا بے دریغ استعمال کرتا۔'' جلیل کی طرف دیکھ کر وہ سیخ پا ہوئے۔ نبیلہ کا تو شرم کے مارے سر جھکا ہوا تھا۔ جو بات انہیں خود سمجھنا چاہیے تھی، وہ بچے سمجھا رہے تھے۔

''نافرمان! بے حیا اولاد، شرم بیچ کر چھولے کھا لیے ہیں تم لوگوں نے، بیٹی کو کھلونا بنایا ہوا تھا۔'' جلیل صاحب دم سادھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ ماحول میں سوئی گرنے سے بھی آواز پیدا ہونے والا سناٹا تھا۔

''ادھر آؤ اوئے! دل خوش کر دیا میرے قصائیو!'' بانہیں کھول کر انہیں اپنی طرف بلاتے ہوئے بڑے ابا خوشی سے بولے۔ بنا قصائی والے لقب کا برا مانے وہ باچھیں چیر کر ان کے دائیں بائیں کندھے سے لگے تھے۔

''چل بی بی! اب تیری باری ہے دھمال ڈال.....'' دائم نے شرارت سے عینا کو چھیڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں فخر سے سینہ اکڑائے باہر آئے تھے۔ اندر جلیل اور نبیلہ ابا سے معافی مانگ کر انہیں منا رہے تھے۔

''مبارک ہو..... مبارک ہو۔'' دائم نے گلے لگاتے ہوئے وہاج کو مبارک دی تھی۔

''پردہ شروع ہے ابھی سے، کل بات پکی ہوگی پھر دیکھ لینا لیکن وہ بھی صرف نکاح کے ارادے سے۔''

وہاج نے عینا کو دیکھنا چاہا تو عمائلہ تیزی سے اس کے آگے آ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا تھا۔

''چھریاں وغیرہ تیز کروائی ہیں تم لوگوں نے۔'' اچانک بڑے ابا عجلت میں باہر نکلے تھے۔ کل عید تھی اور انہیں بہت سارے کام یاد آ گئے تھے۔

''نہیں بڑے ابا! انہیں تو یہی نہیں پتا کہ چھریاں رکھی کہاں ہیں۔'' ان کے جی جی کر کے جھوٹ بولنے سے پہلے ہی عمائلہ فٹ سے بول پڑی۔

''نانجار! نکمی! ست اولاد..... چلو نکلو یہاں سے۔ سارے کام نمٹاؤ۔'' ان کی ستھری بے عزتی کر کے وہ وہاں سے باہر نکل گئے تھے۔ عمائلہ اور لاریب ہاتھ پہ ہاتھ مار کر زور سے ہنسی تھیں۔

''عید ہوگئی میری!
مجھے چاند نظر آ گیا
مبارکاں! مبارکاں!''

گھوم گھوم کر اشارے کرتے ہوئے عمائلہ نے جی بھر انہیں چڑایا۔ وہ تینوں پیر پٹختے ہوئے وہاں سے نکل گئے تھے۔

pklibrary.com

Monthly Shuaa July 2021

☆☆☆

اگلے روز عید تھی۔ نماز عید کے بعد باہر لان میں بکروں کے ساتھ دنگل شروع تھا۔

"یار! یہ کون سا تیل لگا کر آئے ہیں۔" بار بار ہاتھوں سے انہیں پھسلتے دیکھ کر دائم جھنجھلایا۔

پورے لان میں خوب بھاگنے کے بعد پسینے سے شرابور ہو کر وہ بمشکل انہیں قابو کر پائے تھے۔ لڑکیاں تیار ہو کر میز پر مٹھائی سجا رہی تھیں۔ جبکہ شرمی اور نبیلہ باورچی خانے میں مسالہ بنانے میں مصروف تھیں۔ دوپہر تک سارے کام نپٹ چکے تھے۔ لاریب سوٹ بدل کر دوبارہ تیار ہو گئی تھی۔

مہمان آ چکے تھے۔ ثمینہ پھپھو کی طرف سے بھی سب تشریف لا چکے تھے۔ لاؤنج میں خوب چہل پہل تھی۔ لڑکیاں کمرے میں خوش گوار ماحول بنائے بیٹھی تھیں اور لڑکے باہر لان میں درخت تلے کرسی بچھائے گپیں ہانک رہے تھے۔ ہلکے بادلوں کی وجہ سے موسم میں دھوپ کی تمازت قدرے کم تھی اور سبک رو ہوا چل رہی تھی۔

وہاج کی نظریں بار بار اوپر والے کمروں کے باہر بنی بالکونی پر جا رہی تھیں۔ وہ عینا کو ایک نظر بھی نہیں دیکھ پایا تھا، اس کے لیے لیا بریسلٹ جیب میں منہ بسورے پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میسج پر لاریب اور عمائلہ کی منت کرنے کے بعد وہ دس منٹ کے لیے عینا سے ملنے گھر کے پچھلے حصے کی جانب آیا تھا۔ دھانی رنگ کے سوٹ میں شرماتی وہ کھلی جا رہی تھی۔ قریب آ کر وہاج نے دھیرے سے عید مبارک کہہ کر کلائی تھامی تھی۔

"نہیں..... نہیں..... بات کرنے کے لیے بھیجا تھا، ہاتھ پکڑنے کے لیے نہیں....."

عمائلہ جانے کہاں چھپی تھی، فوراً نکل کر سامنے آئی تھی۔ وہاج نے بدمزا ہو کر پیر پٹخے تھے۔

"یہ اپنے ہاتھ میں پہن لوں۔"

جیب سے بریسلٹ نکال کر وہ جل بھن کر بولا۔

"لاؤ دکھاؤ، میں پہنا دوں گی۔" اس نے جھپٹ کر بریسلٹ چھینا۔

"ایسی کی تیسی! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس کے ہاتھ سے بریسلٹ لیتے ہوئے وہ بھڑکا۔

"یہ کون سی فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے۔" بڑے ابا کی کرخت آواز پر بریسلٹ زمین بوس ہو گیا تھا۔ وہاج نے اڑی رنگت سے ٹھوکر لگ کر انہیں دیکھا تھا۔ عینا اور عمائلہ دوپٹہ سر پر دھرے دوڑ لگا گئی تھیں۔

"اندر آؤ۔" گھوریاں ڈالتے وہ حکم دے کر چلے گئے۔ وہاج نے حسرت سے نیچے گرے بریسلٹ کو دیکھا تھا اور پھر جھک کر اٹھا لیا تھا۔

"مسٹر قصائی! چلیں قربان ہونے کے لیے اپنی عینا کی خاطر۔"

دیوار کی اوٹ سے جھانک کر عمائلہ نے ہانک لگائی تھی۔ پیچھے عینا نے بھی ذرا سا چہرہ نکال کر اسے دیکھا تھا۔

"یہ لو۔"

پھرتی سے بریسلٹ اس کی جانب پھینکتے وہ چلایا۔ عمائلہ نے کیچ کر کے ابرو اچکائے تھے اتنے میں بڑے ابا نے پھر سے پکارا تھا، ان کی آواز پر وہ سر پٹ وہاں سے بھاگا تھا مگر بھاگنے سے پہلے عینا کو مسکرا کر دیکھنا نہیں بھولا تھا جو بریسلٹ پہنتے ہوئے اشارے سے عید مبارک کہہ رہی تھی۔

کھل کر مسکراتے ہوئے اس نے بھی اشارتاً خیر مبارک کہا تھا اور اندر داخل ہو گیا تھا جہاں سب رسم کرنے کے لیے منتظر تھے۔ رشتے ایثار سے بنتے ہیں اور انہیں نبھانے کے لیے تہوار آتے ہیں۔

آج کا تہوار بھی چھوٹی چھوٹی کدورتوں کو دور کر کے ان کے لیے خوشیوں کا پیام لایا تھا۔

Monthly Shuaa July 2021

فرح بخاری

کرپال سنگھ کی ڈائری

pklibrary.com

"اور لطیف قریشی بھی "مرحوم" بن چکے۔" قریشی کی کچھ پرانی یادگار تصویریں اور یادیں شیئر کرتے فیس بک پر پوسٹ کر دی۔

نیاز محمد نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اپنی پوسٹ کا تاثر دیا اور اپنے دیرینہ دوست لطیف قریشی کے ساتھ فیصل آباد زرعی یونیورسٹی میں دونوں کا چار

سال کا بہت اچھا بہت قریبی ساتھ رہا تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد نیاز محمد زراعت کے محکمے میں آفیسر لگ گئے۔ لطیف قریشی چار پانچ سال کی تگ ودو کے بعد بالآخر اُسی کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ دونوں کا تعلق ایک ہی شہر سے تھا اس لیے ملنا جلنا روز کے معمولات میں شامل تھا۔ لیکن چار روز پہلے اس باون سالہ دوستی کا باب لطیف قریشی کی وفات کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔

نیاز محمد نے چشمہ اُتار کر رپوالونگ چیئر پہ دھیرے دھیرے جھولتے ہوئے پیشانی کو سہلانا شروع کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مطالعہ، ٹی وی، دوستوں سے میل ملاقات کے علاوہ فرصت کا ایک مشغلہ فیس بک کا استعمال بھی تھا۔ پرانے دوست احباب، کولیگز سے رابطے کا سہل ذریعہ، اُن کی زوجہ محترمہ کا ماننا تھا کہ نیاز محمد اگر سرکاری ملازم نہ ہوتے تو ضرور ایک لکھاری یا کالم نگار ہوتے۔ اور نیاز محمد لکھاری یا کالم نگار تو نہ بن سکے البتہ اپنے ادبی ذوق کے لیے انہیں ایک بہت اچھا میڈیم فیس بک کی صورت میں ضرور ملا تھا۔

یہاں وہ مختلف موضوعات پر کچھ نہ کچھ لکھ کر پوسٹ بناتے، خود بھی مصروف رہتے اور یار دوستوں کو بھی مصروف رکھتے۔

کچھ دنوں سے البتہ موبائل کے استعمال سے آنکھوں پر خوب دباؤ پڑ رہا تھا۔ اسکرین کی روشنی چبھن کا باعث بنتی اور کام مکمل ہوتے ہوتے ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔

اور آج تو دل بھی بہت اُداس تھا۔ لطیف قریشی کی وفات فیس بک کے حلقے میں موجود کئی پرانے دوستوں کے لیے افسوس کی خبر تھی۔

''ابا جی چائے۔'' بہو راحت نے چائے کا کپ سامنے میز پر رکھا اور بکھرے البمز اور کتابیں سمیٹنے لگی۔

''کامران آ گیا؟''

''ابھی نہیں آئے ابا جی۔'' وہ بک شیلف میں کتابیں سیٹ کرنے لگی۔

''کیوں؟ کہیں اور بھی کام تھا کیا؟'' نیاز محمد نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ ڈیوٹی ٹائم سے ڈیڑھ دو گھنٹہ اوپر کا وقت ہو چکا تھا۔

''جی، وہ احمد بھائی کے ساتھ کہیں جانا تھا۔'' راحت نے جھجک کر بتایا۔

''ہوں، پھر کوئی نئی کالونی، نئے بنگلے کی تلاش کا کام۔'' نیاز محمد نے ناگواری سے ہنکارا بھرتے ہوئے جھٹک کر اخبار سیدھا کیا اور راحت اپنا احتجاجی جواب منہ میں لیے ہی باہر نکل آئی۔

ابا جی کا پھر کوئی نئی کالونی، پھر کوئی نیا بنگلہ کہنا اسے بولنے پر مجبور کر رہا تھا، کون سا وہ لوگ روز گھر تبدیل کرتے تھے۔ کوئی غیر سن لے تو سمجھے شاید ایک بزرگ کو در بدر رُلایا جا رہا ہے۔ لیکن وہ کبھی جواب نہ دیتی تھی۔ کامران کا قصور بس اتنا تھا کہ ہر چھ مہینے سال بعد وہ ایک مرتبہ پھر ابا جی کو منانے بیٹھ جاتے کہ اب اس پرانے محلے سے ان سب کو نجات حاصل کر کے کسی اچھی کالونی وغیرہ میں شفٹ ہو جانا چاہیے۔ کامران خود بھی ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ گھر کا نظام بہت اچھا چل رہا تھا۔ ابا جی کی پنشن بھی تھی۔ بچے اب یونیورسٹی کالجز میں آ گئے تھے۔

چار جوان بچے، ساس سسر سمیت ایک آٹھ مرلے کے ساٹھ سال پرانے گھر میں ایڈجسٹ کرنا اب بہت مشکل ہو رہا تھا لیکن ابا جی کا ایک ہی مؤقف تھا کہ اچھے وقتوں کے بنے اس مضبوط خوب صورت گھر کو چھوڑنا سوائے ناشکری کے اور کچھ نہیں۔

کبھی کہتے اگر مجھے اس گھر سے کہیں اور لے گئے تو سمجھو میری زندگی کا بھی آخری دن ہوگا۔ بڑھاپے میں بزرگوں کو پرانی جگہوں سے نہ چھیڑا جائے تو ہی بہتر رہتا ہے۔ بزرگوں سمیت نئی جگہ جانا بڑی بدشگونی ہے۔ نئے گھروں میں بڈھے کب ٹِک پاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ باقی کے آخری ارشادات راحت کی بڑی دو نندوں کے تھے، جنہیں باپ سے ہمدردی تھی یا نہیں۔ بھابھی اور بچوں کے

pklibrary.com

نئے بنگلے سے شکوے ضرور تھے۔

راحت اور کامران بھی چند مہینوں بعد اُٹھتی اس لاحاصل بحث کے بعد ایک مرتبہ پھر چپکے بیٹھ رہتے۔

☆☆☆

احمد جلال، کامران کا بچپن کا دوست تھا۔ پیشے سے پراپرٹی ڈیلر تھا۔ کامران کا احمد کے ساتھ ہونا ابا جی کا اس لیے دل دھڑکا دیا کرتا کہ ضرور اس نے پھر کامران کے لیے کوئی نیا بنگلہ دیکھا ہوگا۔

راحت کمرے سے چلی گئی تھی۔ نیاز محمد اپنا چائے کا کپ لے کر کھڑکی میں آ کھڑے ہوئے۔ حسن آرا کی بہن بیمار تھی وہ اس سے ملنے سیالکوٹ گئی تھیں۔ اکتوبر کا پہلا ہفتہ ختم ہو رہا تھا۔ فضا میں خشک ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ پچھلا صحن خشک پتوں سے بھر گیا تھا۔ نیاز محمد نے ہلکی ہوا سے سرسراتے گرے پتوں کو رنج بھری مسکان سے دیکھا۔

زندگی کے ساٹھ برس اس مکان میں گزرے تھے۔ دیوار کے پار کا برگد ہمیشہ سے اسی طرح سایہ دیتا آ رہا تھا۔ ساٹھ برس پہلے جب وہ گیارہ، بارہ سال کا بچہ تھا۔ ابا جی ان سب کو اس نئے مکان میں لے آئے تھے۔ یہاں کا اسکول، دوستیاں، بچپن کی شرارتیں۔ انہیں یاد کیا کرتا وہ تو آنکھوں کے آگے سے کبھی محو ہی نہ ہوئی تھیں۔

نجانے یہ آج کے بچے۔ نہ انہوں نے پرانے لوگوں جیسی حساس طبیعت پائی تھی، نہ ہی شاید وہ احساس اور انسیت نامی جذبات سے بھی واقف ہو سکتے تھے۔ آخر انہوں نے بھی تو اپنی زندگی اسی گھر میں اسی برگد تلے گزاری تھی۔ انہیں اپنا بچپن کیوں پیارا نہیں لگتا تھا۔ وہ تو دنیا میں کہیں بھی چلے جاتے۔ اپنی گلی جیسا حسین ترین ٹکڑا پوری دنیا میں کہیں نہ دیکھا تھا۔

نکڑ کی سرخ چوبارے والی حویلی، دور تک جاتی اس کی اونچی پراسرار دیوار اس کے چھوٹے چھوٹے روشندان، نیاز محمد کی آنکھوں میں آج بھی بچپن کے دنوں جیسا اسرار رکھتے ہیں۔ بیچ کے کئی مکان اپنا نقشہ تبدیل کر چکے تھے لیکن پرانا مائی اسکول اس کا گراؤنڈ، پچھلی دیوار سے جڑی میونسپل کمیٹی کی کالونی اس کی اونچی ٹینکی، تین چھوٹے باغ، آموں کے درخت، کالونی کے پرانے مکان.....اور.....

وہ اپنی عینک سنبھالتے دروازہ کھول کر چھوٹے دروازے سے باہر نکل آئے۔ پچھلا دروازہ ہائی اسکول کے گراؤنڈ اور سرسبز کالونی کی طرف کھلتا تھا۔ اس گلی میں ایک اسکول کی پچھلی دیوار تھی۔ ایک کالونی کی سائیڈ کی دیوار اس کے علاوہ پرانا برگد۔ گلی میں نہ کوئی گندگی تھی نہ گھروں کی بہتات، نہ رش نہ ہجوم۔ نیاز محمد تو برسوں ہوئے جیسے اینٹوں والے اس راستے کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھنے لگے تھے۔

اور کیوں نہ ہو۔۔ وہ اسکول کی اونچی سیڑھیوں پر اکیلے جا بیٹھے۔ ساٹھ سال نیاز محمد کے قدموں نے اپنے فیصل آباد کی ان مانوس گلیوں کو ناپا تھا۔ یہاں سے چلے جانا۔ انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر اوپر گھنے برگد کی جھکی شاخوں کو دیکھا اور سر نفی میں ہلایا۔

"جیسے جگ سے گزر جانا، اور وہ اپنے بچوں کو کیسے سمجھاتے کہ آخر ایک دن تو دنیا سے بھی چلے ہی جانا ہے۔ بوڑھے باپ کو تب تک کی مہلت دے دینے میں اُن کا کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب سوچنے کے لیے یہاں۔ انہوں نے اپنے دل پہ انگوٹھا ٹھونکتے سیڑھیاں اتر کر گراؤنڈ کی راہ لی۔

یہاں جس جذبے کا ہونا ضروری ہے اُسے احساس کہتے ہیں۔ اور احساس سے عاری یہ جدید لوگ۔ شاید اینٹ پتھر کا دل رکھنے والے، اینٹ پتھر سے پیار نہیں کیا کرتے۔ دل موم سا ہو تو ٹھوس جامد منظر پگھلتے دکھائی دیں گے نا۔" بڑبڑاتے ہوئے گراؤنڈ کراس کرتے ایک ہاتھ عادتاً پیچھے کمر پہ رکھے دوسرے سے چھڑی ٹیکتے پیدل ہی مندر والی گلی میں مڑ گئے۔ بہت دن ہوئے کفایت علی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بیل بجائی تو وقار نے باہر نکل کر دادا کی موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے ان کے لیے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

''آؤ آؤ۔ بسم اللہ، میں تو تمہاری طرف آنے کا سوچ رہا تھا۔'' کفایت علی نے بغل گیر ہوتے ہوئے نیاز محمد کو کرسی پیش کی اور خود آگے بڑھ کر کھڑکیوں سے پردے سرکا دیے۔

''موسم بہت حد تک تبدیل ہوگیا ہے۔ نہیں؟''

''ہاں، دن کے اوقات میں تو ہوا خوش گوار لگتی ہے لیکن آدھی رات کو واش روم کے لیے نکلنا پڑ جائے تو جھرجھری سی آجاتی ہے۔'' دبلی پتلی جسامت کے مالک کفایت اپنی کیفیت بتاتے ہوئے آپ ہی ہنس پڑے۔

''ہم بوڑھوں کے لیے تو اب شدت کی سردی اور شدت کی گرمی دونوں ہی ناقابل برداشت ہوگئی ہیں۔''

''مطلب اکتوبر کو تو غنیمت جانیں؟'' کفایت علی اپنی مخصوص خوش مزاجی کے باعث بات بے بات مسکراتے ہی رہتے۔

''بالکل۔ یہی دیکھ لو، گھر سے تو یونہی گراؤنڈ تک ہی نکلا تھا لیکن اچھا موسم دیکھ کر پیدل یہاں تک آگیا۔''

''تو..... چائے ہوجائے؟'' وہ اُٹھنے لگے۔

''نہیں، چائے بس ابھی ابھی پی کر نکلا ہوں۔ تم نے پینی ہے تو اپنے لیے۔''

''میں بھی پی چکا۔ ابھی چائے پیتے ہوئے تمہاری پوسٹ ہی دیکھ رہا تھا۔ خوب لکھا ہے لطیف کے متعلق۔'' انہوں نے موبائل جیب سے نکالا۔ لطیف کے ذکر پر بے ساختہ ہی دونوں کے حلق سے آہ نکل گئی تھی۔

''آج لطیف یاد بن گیا، کل کے کسی کیلنڈر میں ہمارا نام بھی یاد بن کر ابھرے گا، ہیں سے تھے کا سفر بس اتنا سا ہی تو ہے۔'' نیاز محمد آہستہ روی سے بولتے چلے گئے۔ کفایت علی نے تائید میں سر ہلایا اور موبائل کی اسکرین روشن کی۔

''یاد'' سے ایک اور بات یاد آئی۔'' وہ پھر ہلکا سا مسکرائے اور موبائل میں کچھ نکال کر نیاز محمد کے سامنے کیا۔

''پچھلے دنوں وقار نے ایک فیس گروپ کا لنک مجھے بھیجا کہ دادا ابو آپ کے کام کی ایک چیز سامنے آئی ہے۔ میں تو تمہیں بھی بھیجنے والا تھا لیکن یار یہ لنک وِنک شیئر کرنا مجھے نہیں آیا۔ لو تم ادھر سے ہی دیکھو۔'' انہوں نے موبائل نیاز محمد کے ہاتھ میں دیا۔

''اپنا لائل پور'' نام کا یہ گروپ کسی ہمارے جیسے پرانے بندے نے ہی بنایا ہے۔ نام نے ہی مجھے کافی اپیل کیا۔ کچھ دن پہلے تو میں خود بھی سرچ کر رہا تھا کہ فیصل آباد کے کچھ ادبی حلقوں کا کام دیکھا جائے لیکن اپنا لائل پور واقعی ایک اچھوتا خیال ہے۔''

''میں بھی سرچ کرلوں گا۔ مجھے بھی ابھی صرف سرچ کرنا آیا ہے۔'' نیاز محمد نے مزاح کے انداز میں آنکھ دبائی اور کفایت علی نے قہقہہ لگایا۔

''جانتا تھا۔ خیر یہ دیکھو۔'' انہوں نے ایک پوسٹ نکال کر نیاز محمد کی توجہ دلائی۔

''تم یہ پڑھو، میں بس ابھی آیا۔ وقار مارکیٹ کے لیے نکل رہا ہے۔ ایک نسخہ سمجھا کر ابھی آتا ہوں۔'' انہوں نے جیب سے رقم اور نسخہ نکالتے ہوئے دروازے کا رخ کیا اور نیاز محمد نے توجہ پوسٹ کی جانب مبذول کی۔

کرپال سنگھ کی ڈائری۔

بانوے برس کی عمر میں جبکہ نہ آنکھیں صحیح سے کام کرنے کے قابل ہوتی ہیں نہ ہاتھ ہی کچھ لکھنے کے لیے قابو میں آتا ہے۔ میں کرپال سنگھ آبھاری (مشکور) ہوں اپنے ناتے (نواسے) اپلیش سنگھ کا جس نے مجھے موبائل فون کے ذریعے ایک ایسی دنیا سے جوڑ دیا کہ گویا کھڑکیوں کو دونوں ہاتھوں سے کھول کر ماضی کی دھندلی یادوں کو ٹھنڈی خوش گوار ہوا سا اندر آنے کی آگیا (اجازت) دے دی جائے، یا جیسے مدتوں پرانی تصویر پہ پڑی گرد کو جھاڑ کر سب ایک دم روشن اور واضح کردیا جائے۔

''اپنا لائل پور'' نام کا یہ فیس بک گروپ معلوم نہیں کیا چیز ہے۔ مجھ جیسے کم پڑھے لکھے پچھلے وقتوں کے شخص کو کیا پتا۔ لیکن اپلیش کی اچھا (خواہش) ہے کہ اپنی بیانویں

سالگرہ پر اس کا دادا اپنے ماضی کی کچھ یادیں اس گروپ میں شیئر کرے تو میں اس کی اچھا کو ہرگز نہیں ٹھکرا پایا کیونکہ ''لائل پور'' یادوں کے آسمان پہ چمکتا وہ واحد نام ہے جس کی تابناکی عشروں بیت جانے پر بھی صبح کی ٹھنڈی کرنوں جیسی کرپال سنگھ پر برسا کرتی ہے۔ اور پھر ''اپنا لائل پور'' جو نجانے کس کس کا ہے پر کرپال سنگھ کے سامنے تو بس اس کا اپنا بن کر ایسا اُبھرا ہے کہ گویا انگلی تھام کر بنا کسی ویزے اور پاسپورٹ کے اپنے ساتھ کھینچ لے گیا ہو۔

اور اگر میں خود کو لائل پور کے گلی کوچوں میں محسوس کروں تو میری یادوں میں سب سے پہلی خوب صورت یاد ''جھنگ بازار'' ہے۔ لیکن جھنگ بازار کا نام آتے ہی اگر کسی کے ذہن میں پاکستان کا شہر جھنگ اور ہیر کے مقبرے کا منظر گھوم جائے تو وہ صحیح دِشا (سمت) میں نہیں جا رہا۔ جھنگ بازار دراصل آٹھ بازاروں والے میرے آبائی وطن لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کا وہ بازار ہے جس کا رُخ جھنگ شہر کی جانب تھا اور یقیناً آج بھی اُدھر ہی ہوگا۔

اپنے پرانے لائل پور اور وہاں کی خوش گوار یادوں کو میرے ذہن، میری روح حتیٰ کہ میرے خون کی شریانوں تک سے کوئی نکال نہیں سکتا۔ جی ہاں میں کرپال سنگھ ولد موہن سنگھ عمر بانوے برس، آج! مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر (انڈیا) میں رہتا ہوں۔ سکھی ہوں آسودہ حال ہوں، تاہم آج بھی میرا دل لائل پور کے محلہ سنت پورہ اور وہاں کے گلی کوچوں میں اٹکا ہوا ہے۔ جن میں میرا بچپن لڑکپن اور جوانی کے چند ایام اپنے دوستوں اور کلاس فیلوز کے ساتھ کھیل کود میں بسر ہوئے۔ اُس گلی میں اُن دنوں گائیں بھینسیں بندھی رہتی تھیں جو ہمارے کھیل کود میں اڑچن (رکاوٹ) کے باعث ہمیں بالکل اچھی نہ لگتیں لیکن آج جب اس گلی کو یاد کرتا ہوں تو ان گائے بھینسوں کے وجود کے بغیر گلی کا اور کوئی تصور ہی نہیں اُبھرتا۔

ہم اپنے بزرگوں سے سنتے تھے کہ وہ مقام جہاں پہ آج لائل پور کا شہر واقع ہے۔ یہاں بہت پہلے گھنے جنگل ہوا کرتے تھے۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ ساندل بار کہلاتا تھا۔ ہاں ایک چھوٹی بستی کا وجود یہاں پہ ضرور تھا جسے ''پکی ماڑی'' کہا جاتا تھا، جو بعد میں شہر کے ایک گوشے میں موجود دیکھی جا سکتی تھی اور جہاں پہ ایک بزرگ ''بابا نور شاہ ولی'' کا مزار تھا۔ کبھی کبھار ہم دوست اُدھر بھی جا نکلتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا جب انگریزی دور میں یہاں ایک شہر بسانے کا سوچا گیا۔

چنانچہ سر لائل نے اسی ساندل بار میں ایک نئے شہر کی نِیو (بنیاد) رکھی۔ شہر کا نقشہ گنگا رام نے بنایا اور شہر کے آٹھ خوبصورت بازار برطانوی پرچم کے یونین جیک کی مخصوص ترتیب کو پیش نظر رکھ کر بنائے گئے۔ جی ہاں یہ تھے۔

بھوانہ بازار، امین پور بازار، چنیوٹ بازار، کچہری بازار، ریل بازار، کارخانہ بازار، منٹگمری بازار اور جھنگ بازار!

میری زیادہ تر یادیں ''جھنگ بازار'' سے اس لیے وابستہ ہیں کیونکہ یہ ہماری گلی کے قریب پڑتا تھا۔ جب بھی والدین کو سودا سلف خریدنے کی ضرورت پیش آتی۔ ایک چھوٹا سا تھیلا، اشیا کی لسٹ اور پیسے تھما کر بھیج دیا جاتا تو میری منزل ہمیشہ یہی بازار ہوا کرتا اور یہ وہ واحد بازار تھا جہاں پہ دور تک پھیلی دکانوں میں حتیٰ کہ فٹ پاتھ تک پہ کئی طرح کی اشیا کے ڈھیر لگے ہوتے۔ ہر قسم کے پھل، سبزیوں سے لے کر برتنوں میں تھال دیگچیاں، پرات گھڑے مٹکے صراحیاں غرض جھاڑو سے لے کر سوئی دھاگے تک ہر چھوٹی بڑی چیز دستیاب تھی۔

جب ہائی اسکول کا زمانہ آیا تو ہم یار دوست آس پاس کے علاقوں میں نکل جاتے، ہمارے شہر میں کارخانوں اور کھڈیوں کی بہتات کے باعث اسے ہندوستان کا مانچسٹر کہا جاتا تھا۔ اُسی زمانے میں ہم نے لائل پور کاٹن مل کو بھی دیکھا جو یہاں کی سب سے پرانی مل تھی۔ جس پر گہرا لال رنگ چڑھایا گیا تھا جس کے باعث ہم اسے ''لال مل'' کہا کرتے تھے، بعد میں اس کا اصل نام کسی کو بھی یاد نہ رہا اور یہ لال مل کے نام سے ہی جانی جاتی تھی، اور یہی دور تھا جب ہم نے مشہور و معروف کوہ نور مل کو بھی اندر سے دیکھا کیونکہ میرے کلاس فیلو نیش کے والد اسی مل میں سپروائزر تھے۔

pklibrary.com

کالج کا زمانہ آیا تو سمندری روڈ اور ڈجکوٹ روڈ کے سنگم پر نہر کنارے واقع ''ناولٹی سینما'' ہمارے لیے اس دور کی شاندار فلمیں دیکھنے کا مرکز تھا'' چندر لیکھا، شاہجہان اور مائی سسٹر ہم نے اُسی دور میں دیکھیں اور آج بھی جب کندن لال سہگل کا گایا نغمہ۔ ''اے کاتبِ تقدیر'' میرے ذہن کے پردوں پر گونجتا ہے تو پرانی یادوں کا ریلا ایک سہانے گیت مالا کے انداز میں ذہن کو مہکاتا چلا جاتا ہے۔

مجھے وہ وقت بھی یاد آرہا ہے جب ریل گاڑی کا ٹکٹ نہ خرید کر بھی ہم سبھی دوست ایک جگہ سے دوسری جگہ ریل کے ڈبوں میں سفر کر کے خوش و خرم وقت گزارنے میں بے حد کامیاب رہتے تھے، اسکول کے زمانے میں ہم چند دوست ناولٹی سینما پہ کوئی فلم دیکھنے جاتے تو شو کے اختتام پر چائے پینے اور سموسے کھانے کے لیے قریبی آبادی، جوالانگر اور ثمن آباد کی طرف نکل جاتے۔ اُن دنوں وہاں پہ چائے کے کھوکا نما ہوٹل ہوا کرتے تھے، جہاں بہترین قسم کی چائے کے چار کپ مع آٹھ سموسوں کے صرف ایک آنے میں مل جاتے۔

کھانے پینے سے فرصت پا کر ہم وہیں پہ آس پاس گھومتے رہتے۔ اس دوران گوجرہ سے لائل پور آنے والی اسٹیم ریل گاڑی کا وقت ہو جاتا جو شیشم کے سرسبز و شاداب پیڑوں کی قطار کے ساتھ ساتھ پٹھی ریلوے لائن پہ سیٹیاں بجاتی دھواں اُڑاتی پہنچ جاتی۔ جوالانگر کی آبادی میں ریلوے پھاٹک نہ ہونے کے باعث اُسے یہاں پہ اپنی رفتار کو سست رکھنا پڑتا، نتیجتاً ہم سب ہی دوست اس سست رفتاری کا فائدہ اُٹھا کر گاڑی کی کسی بھی مسافر بوگی میں لائل پور اسٹیشن پہ جا اترتے۔ یہاں سے ایک تانگہ ہمیں قیصری گیٹ اور ریل بازار کے راستے با آسانی گھنٹہ گھر پہنچا دیا کرتا۔

۱۹۴۲ء میں محمد علی جناح لائل پور تشریف لائے اور دھوبی گھاٹ کے یادگار جلسے سے خطاب کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر چھوٹی بڑی بات عوام کے لیے بہت خاص ہوا کرتی تھی۔ جب کسی ایک شادی اور کسی ایک موت کا واقعہ بھی مہینوں اہلِ علاقہ کی زبان پر رہتا تھا۔ محمد علی جناح تو ایک بہت بڑی شخصیت تھے۔ غالباً پچاس ہزار مسلمان آبادی کے اُس شہر میں ایک لاکھ کا مشترکہ ہندو مسلمان مجمع محمد علی کی بارعب پرسنالٹی کو دیکھنے دھوبی گھاٹ اُمڈ آیا تھا۔ یادوں کے پردے پہ متحرک چند بڑے واقعات میں سے یہ ایک اہم ترین واقعہ تھا جسے لائل پور کے حوالے سے میں آج تک بھول نہیں پایا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب میری عمر اٹھارہ برس ہوئی تو حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ تقسیمِ ہند کے کارن ہمارے پورے خاندان کو بھارت منتقل ہونا پڑا اور وہی لائل پور کا پیارا سا اسٹیشن جہاں پہ ہم ہنستے مسکراتے بلا ٹکٹ ٹرین کی سیر کے مزے اٹھایا کرتے تھے، آج خوف و ہراس کے گمان کی زد میں تھا۔ حالانکہ آج ہم میں سے ایک بھی فرد بنا ٹکٹ کے نہ تھا، تب ہی میں نے سمجھا کہ خوف کے گھنے جنگلوں اور خوشی اور اطمینان کی پرسکون وادیوں کے لیے ٹکٹ کا ہونا نہ ہونا شرط نہیں، ماحول کا نفرت سے پاک ہونا ضروری ہے۔

وطن کی مٹی میں ایک ایسی خوشبو ہوتی ہے جو عمر کے ہر حصے میں آپ کے ذہن اور روح کو مہکاتی رہتی ہے۔ کنٹرول لائن کی آہنی لکیر، ویزہ اور پاسپورٹ کی پابندیاں درمیان میں حائل نہ ہوتیں تو آج بانوے برس کی عمر میں بھی کسی روز جالندھر سے ٹرین میں بیٹھ کر لاہور اور پھر لائل پور پہنچ جاتا، لیکن اگر یہ ممکن نہیں تو اندر کہیں اس کا درد بھی نہیں کیونکہ میں جہاں کہیں بھی ہوں میرا دل آج بھی لائل پور کے گلی کوچوں، بازاروں اور دلکش مضافات کے مناظر میں اٹکا ہوا ہے۔

جگہ کا بدلنا تو بھاگیے (مقدر) سے جڑا ہے۔ وقت، حالات اور ماحول بھلا کب کسی ایک جگہ کا ہو کر رہنے دے سکتے ہیں۔ قدرت ہمیشہ کسی اچھے کے لیے ہی ہمیں ایک فیز سے دوسرے میں منتقل کرتی ہے۔ آج جالندھر کی طرف دیکھتا ہوں تو چھتر برس کی لاتعداد بے شمار یادیں یہیں سے جڑی، یہاں کے گلی کوچوں میں بھی لیے پھرتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان جگہوں کو بنا کسی ٹکٹ یا تردد کے دیکھ لیتا ہوں جب کہ اٹھارہ برس کی یادوں میں فاصلے رکاوٹ ہیں۔ اور دیکھا جائے تو اس میں بھی ایک حسن اور کشش ہے۔ اور یہی

pklibrary.com

کشش اور کھنچاؤ میرے لائل پور کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ آج میں اُن تمام آنکھوں کی خوش قسمتی پہ رشک محسوس کرتا ہوں جو میرے لائل پور کو محبت کی نظر سے دیکھتی ہوں گی۔

کل کے لائل پور اور آج کے فیصل آباد کے ہر واسی کو کرپال سنگھ کا محبت بھرا سلام اور نمسکار۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا کہ کہیں نہ کہیں ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی حوالے سے دوسرے سے جڑا ہے۔

اپنا رنگ رچاؤں سب انسانوں میں
دوڑ رہا ہوں دنیا کی شریانوں میں
نفرت کی تائید نہیں میں کر سکتا
نام میرا بھی لکھ لو، نافرمانوں میں!

(فتیل شفائی)

☆☆☆

''احمد کی کال آرہی تھی بار بار۔ کال بیک کرلو۔'' کامران واش روم سے نہا کر نکلا تو نیاز محمد نے اس کا موبائل آگے بڑھایا

''جی جی۔'' کامران نظریں چرا کر واپس پلٹا۔ احمد کی کال تو ابا جی کا بلڈ پریشر ہائی کرنے کے لیے کافی ثابت ہوتی تھی۔ کامران نے جی ہی جی میں اس وقت کو کوسا جب وہ اپنا موبائل ابا جی کے سامنے میز پر رکھ کر باتھ روم چلا گیا تھا۔

''نیا مکان کسی کھلے علاقے میں دیکھنا۔ ذرا درختوں والا ہرا بھرا علاقہ ہو۔''

''جی؟'' کامران تعجب سے پلٹا تو چہرے پر بے یقینی ثبت تھی۔ ابا جی نے کیا کہا اس کے تو سر سے ہی گزر گیا۔

''بھئی، احمد سے کہو، ہمارے لیے نیا مکان تلاش کرے۔'' انہوں نے مبہم سی ہنسی ہونٹوں میں چھپاتے اخبار سامنے کھولا تو کامران کرسی گھسیٹتے ان کے قریب آبیٹھا۔

''آپ خفا ہیں ابا جی؟''

''ہیں۔'' نیاز محمد نے گھور کر بیٹے کے ہونق پن کو جانچا۔ لڑکے کا دماغ تو نہیں چل گیا تھا۔

''یعنی میں نئے مکان کی بات خفا ہو کر کر رہا ہوں؟''

''نن..... نہیں..... وہ.....'' کامران پرانے حوالے دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، جھجک کر زبان روک لی۔

''بالکل خفا نہیں ہوں۔ ان فیکٹ چینج میری صحت کے لیے بھی اچھا ثابت ہوگا۔ ہاں لیکن گھر پہلے مجھے ضرور دکھانا۔'' آخر میں رعب ڈال کر گھورا۔

''جی جی ابا جی۔'' کامران اٹھ کر فوراً باہر نکل گیا اور وہ سر جھٹک کر ہنس دیے۔

اچھی سیکھ تو کسی بھی عمر میں لی جا سکتی ہے۔ اور نیاز محمد کو یہ نیا سبق ایک نئے دوست نے دیا تھا۔ کرپال سنگھ اب ان کا یا فیس بک فرینڈ تھا۔ جس کی پوسٹ کے بعد نیاز محمد نے انہیں ان کے لائل پور کی بہت سی خوب صورت اور نایاب تصویریں تحفتاً شیئر کی تھیں۔ کرپال سنگھ نے لائل پوری کی ایسی قدر دانی اور محبت پا کر شاید زندگی کے چند سال اور بڑھا لیے تھے۔ خوشی ہمیں اندر سے جوان اور درد والم اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ نیاز محمد نے بھی اپنے بال بچوں کی خوشیوں میں اضافہ کر کے اپنے آپ کو اندر سے جوان محسوس کیا تھا۔

جس لائل پور کو دوبارہ دیکھ لینے کی چاہ میں کرپال سنگھ برسوں سے تڑپ رہا تھا۔ وہ نیاز محمد کے آس پاس بکھرا تھا۔ محلہ بدلنا وطن بدلنے سے کہیں سہل تھا۔ بنا ٹکٹ ویزے اور پاسپورٹ کے وہ جب چاہتے اپنی گلی، گراؤنڈ، برگد کی چھاؤں میں واپس آسکتے تھے۔ پھر بقول کرپال سنگھ وطن تو ہمارے اندر بستا ہے، ضرورت ان یادوں کے چراغوں کو جلا کر ان کی روشنی اور تابناکی کو محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔

وطن نعمت تھا، آزادی نعمت تھی، سر سے پاؤں تک اللہ پاک کا عطا کردہ وجود اس نعمت سے لطف اٹھانے کے لیے صحیح سلامت تھا، پھر ان کی فیملی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے کیوں کچھ مشکلات اٹھائیں۔ ان کی خوشی اگر نیا گھر ہے تو وہ ہرگز ان کی اس خوشی کے آڑے نہیں آئیں گے۔ آخر چھتر سالوں سے یہاں بسنے والے مسلمان بھی تو اپنے ''نئے گھر'' کی لاتعداد بے شمار نعمتوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

نیاز محمد نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ اُٹھایا اور گرم گھونٹ لیتے ہوئے فیس بک کی ایک نئی پوسٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆

نعیمہ ناز

تلافی

pklibrary.com

گھر سے ایرپورٹ تک جہاز میں بیٹھنے تک سیٹ بیلٹ باندھنے اور جہاز کے اڑان بھرنے تک تو مما کی درجنوں نصیحتیں اور یاددہانیاں دماغ میں گردش کرتی رہیں۔

''کھانا ٹھیک سے کھانا، الابلا چیزوں سے دور رہنا، دودھ روزانہ پینا، میں نے آصفہ کو بتادیا ہے کہ تم دودھ پینے کی چور ہو، وہ نمٹ لیں گی تم سے، تمیز تہذیب سے رہنا، بے شک تایا کا گھر ہے مگر پھر بھی کسی بھی رشتے دار کے گھر جانا ہو، ان کے ساتھ جانا، خبردار جو اکیلے کوئی ایڈونچر کرنے کی کوشش کی، سمجھ رہی ہو نا؟''

''یس مما!'' عمیمہ نے ویسی ہی تمیز تہذیب سے انہیں جواب دیا تھا جسے اپنی اولاد کو سکھانے کے لیے وہ دن رات ہلکان ہوئی جاتی تھیں۔

ادھر ہوائی جہاز قائداعظم انٹرنیشنل ایرپورٹ پہنچا اور اس کے پہیوں نے رن وے کو چھوا اور ادھر عمیمہ کی یادداشت نے ان ساری ہدایات کو دماغ کی سلیٹ پہ ایک طرف سرکا دیا، بوقت ضرورت اور بوقت مجبوری انہیں استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا مگر ہر وقت ساتھ ساتھ لیے پھرتی تو دماغ پہ لازمی بوجھ پڑتا تھا اور وہ، جو کہ یہاں عید منانے اور شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ اس بوجھ کو کہاں ساتھ ساتھ لیے پھرتی؟

ایئرپورٹ پہ تایا ابو، شانو اور زلفی بھائی اسے لینے آئے تھے۔ سامان مختصر تھا۔ ایک سوٹ کیس، ایک بیگ اور بس، ڈگی میں دونوں چیزیں آ گئیں۔ باقی سب گاڑی میں لد گئے۔

مکمل ناول

pklibrary.com

''سفر کیسا گزرا تمہارا؟'' بڑے ابو نے رسمی سا سوال کیا۔

''یہ سوال گھر پہنچ کر کیجیے گا۔ ایئرپورٹ سے ناظم آباد تک کا سفر ہوائی جہاز کے سفر سے زیادہ دلچسپ ہوگا۔'' شاہ نور عرف شانو نے لقمہ دیا۔

''کیا مطلب؟'' عمیمہ نے بھنویں سکیڑ کر شانو کو دیکھا۔

''راستے کے دلکش مناظر دیکھنا پھر بتانا۔''

''شٹ اپ شانو!'' زلفی بھائی نے اسے ڈانٹا۔

''مجھے معلوم ہے، تمہارا اشارہ کس طرف ہے، یہ لو پہلا ویو آ گیا۔'' عمیمہ مسکرائی۔

''جیسا بھی ہے ہمارا شہر ہمیں پیارا ہے۔'' زلفی بھائی نے کچرے کے اس ڈھیر کو دیکھا جسے عمیمہ نے پہلا منظر بتایا تھا۔

''جو پیارا ہوتا ہے، اس سے پیار نبھایا بھی جاتا ہے۔'' عمیمہ نے فقرہ کسا۔

''سارا پیار ہم ہی سنبھالیں تو متعلقہ ادارے کیا کریں گے؟''

''گھاس کھودیں گے۔''

''تو اب کیا کر رہے ہیں؟'' شانو کے برجستہ جواب پہ ایک قہقہہ بلند ہوا۔ جس میں سب سے بلند آواز بڑے ابو کی تھی۔

گھر پہنچ کر عمیمہ نے جائزہ لیا۔ انٹیریئر اس سے تھوڑا مختلف تھا جو ویڈیو اور تصاویر شانو اسے اکثر بھیجتی رہتی تھی۔

بڑی امی بہت تپاک سے ملیں۔ کافی اسمارٹ اور فریش لگ رہی تھیں۔ شانو نے اوپری منزل پہ عمیمہ کا کمرہ دکھایا جو اس کے لیے سیٹ کیا گیا تھا۔ کلر اسکیم سوبر تھی دیوار گیر الماری، ایک سنگل بیڈ، ریک، بک شیلف، صوفہ۔

''اٹس ٹو نائس یار، وہاں تو میں اپنی بہن کے ساتھ کمرہ شیئر کرتی تھی۔'' عمیمہ سچ مچ بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس کی گفتگو میں بھی انگریزی اردو دونوں کی آمیزش تھی۔ وہ بہت زیادہ اچھی اردو نہیں بولتی تھی مگر کوشش ضرور کرتی تھی۔ اس وقت بھی اسے یاد آیا تو انگریزی بولتے بولتے وہ اردو پہ آ گئی۔

''یہ پاکستان ہے پیاری، عیش کرو، جو عیش وہاں میسر نہیں ہیں اور ان سہولتوں کی شکایت نہ کرنا جو تمہیں لندن میں مہیا ہیں۔''

شانو بولتے بولتے بیڈ پہ نیم دراز ہوگئی! ''اب تم فریش ہو جاؤ تو کھانا لگوائیں چوہے دوڑ رہے ہیں پیٹ میں۔''

''کیا؟'' عمیمہ نے آنکھیں پھاڑیں۔

''محاورہ ہے یار، سچ مچ کے چوہے نہیں ہیں۔ باقی داد سے تو بتاؤ تم میرے لیے کیا لائی ہو؟''

''پرنس ہیری کو لا رہی تھی، میگھن مارکل بیچ میں آ گئی۔'' عمیمہ شرارت سے بولتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی۔

کھانے میں بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ بڑی سی ڈائننگ ٹیبل انواع و اقسام کے پکوانوں سے بھری ہوئی تھی۔

''کیا اور بھی مہمان آنے والے ہیں؟'' عمیمہ نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں تو، کیوں؟''

''اتنی ساری ڈشز کون کھائے گا؟'' عمیمہ نے ایک نظر میز پہ ڈالی مچھلی، مرغی، گائے، بکرے کا گوشت، مختلف طریقوں سے پکا ہوا، سجا ہوا اپنی بہار دکھلا رہا تھا۔ دیسی پکوانوں کے علاوہ چائنیز، تھائی اور اٹالین ڈشز بھی تھیں، کھانے کے دوران اسے علم ہوا، شانو ایک ایک ڈش اس کے آگے رکھ رہی تھی، بمعہ اس کے نام اور خصوصیات کے ساتھ اور اپنے شیف کی تعریف و توصیف کے ساتھ۔

''میں نے تو سنا ہے کہ یہاں کی اکانومی کی حالت بہت خراب ہے اور بہت زیادہ مہنگائی ہے۔'' فش کا ٹکڑا کھاتے ہوئے عمیمہ نے سوال کیا۔

''وہ تو ہے پر ایک طبقہ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے ملک میں، جو ان سب مسائل سے بے نیاز ہوتا ہے۔'' بڑے ابو کا لہجہ فلسفیانہ تھا۔

''اور وہ کون سی کلاس ہوتی ہے؟''

''لندن جیسے شہر میں تعلیم حاصل کی ہے پھر بھی یہ سوال پوچھ رہی ہو؟''

"ڈگری اور تعلیم کا عقل و ذہانت سے کیا تعلق؟" شانو نے پھلجھڑی چھوڑی۔

"شانو۔" بڑی امی نے تنبیہی نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔

"شانو ڈیئر، اپنے پرسنل ایکسپیرئنس ہر ایک پر اپلائی نہ کیا کرو۔" عمیمہ نے بے حد سکون سے بولتے ہوئے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔

"واؤ۔" زلفی بھائی نے بے ساختہ اس کی توصیف کی اور اپنی بہن کو مخاطب کیا۔ "شانو اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خاموش رہو۔"

"کھانے کے لیے بھی منہ نہ کھولوں؟" شانو نے بے حد شرافت اور معصومیت سے سوال کیا تھا۔

☆☆☆

اگلا پورا دن ہی تقریباً ـــــ سوتے ہوئے گزرا تھا۔ رات گئے اٹھی تو فریش ہو کر پھر اپنا سوٹ کیس کھولا تھا، امی جان کے دیے ہوئے تحائف حق داروں یعنی بڑے ابو، بڑی امی، شانو اور زلفی بھائی کو دینے کے بعد وہ شانو کے سر ہو گئی۔

"کھڑی ہو جاؤ، واک کرنے چلتے ہیں۔"

"باہر مچھر بہت ہیں، گھر بیٹھو آرام سے۔" شانو ایک نمبر کی کاہل اور سست الوجود، اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے بھی سواری استعمال کرے۔

"اٹھو!" عمیمہ نے اس کا شانہ ہلایا۔

"کل چلتے ہیں نا!" شانو نے زوردار جمائی لی۔

"کل بجھی نہیں آتی بس آج ابھی اور اسی وقت، فوراً میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔"

عمیمہ ایک بار پھر اسے جھنجھوڑ کر باہر کی جانب چل دی۔ پیچھے سے شانو آواز لگا رہی تھی۔

"اے عمیم صاحب! سنو تو، رکو تو....."

مگر عمیمہ اپنے دونوں کان بند کیے گیٹ کی طرف چلتی چلی گئی اور باہر نکل کر ابھی نکڑ تک نہیں پہنچی تھی کہ پیچھے سے شانو دوڑتی ہوئی آ گئی۔

"تمہیں واک کرنے کا اتنا شوق کیوں ہے۔ اچھی بھلی اسمارٹ تو ہو۔" پھولی ہوئی سانسوں کو ہموار کرتے کرتے شانو بول رہی تھی۔

"میں آئندہ بھی اسمارٹ رہنا چاہتی ہوں۔"

عمیمہ چلتے چلتے رک گئی اور گردن اونچی کر کے اس مکان کا جائزہ لینے لگی جو بڑی شان سے سر اٹھائے سامنے کھڑا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کے علاوہ مکان کے باہر لگے اکا دکا سیور بھی جل رہے تھے پھر بھی یہ روشنی پوری طرح اس عمارت کا احاطہ کرنے میں ناکام تھی۔ درختوں کے سائے دیواروں پہ کسی چڑیل کے بالوں کی طرح پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ محراب دار کھڑکیوں کے پٹ بند تھے۔ بالکنی کی ریلنگ روشنی میں چمک رہی تھی۔ گھر کے احاطے میں موجود پھول دار بیلیں دیوار کے باہر لٹک رہی تھیں۔ ان دیواروں کی اوپری جانب قدیم طرز کی سیمنٹ کی جالیاں تھیں۔

"یہ کس کا گھر ہے؟ کافی مختلف اور پرانا ہے۔" عمیمہ نے آس پاس جدید طرز کے شان دار اور عالی شان بنگلوں پہ نظر دوڑائی، جن کے درمیان یہ قدیم مگر ساحر قسم کا مکان یوں لگ رہا تھا جیسے بے حد حسین اور رنگا رنگ مصنوعی پھولوں کے درمیان کوئی جنگلی پھول، جو اپنی رنگت، خوشبو اور صورت سے بالکل انوکھا اور بہت منفرد ہو۔

"بات سنو، یہ بھوت بنگلہ ہے اور یہاں چڑیلیں رہتی ہیں۔ جلدی نکل چلو یہاں سے۔"

"شٹ اپ!" عمیمہ نے اپنی جینز کی جیب سے موبائل نکالا اور مختلف زاویوں سے مووی بنانے لگی۔

"تم مرواؤ گی۔" شانو کھڑے کھڑے جز بز ہونے لگی۔

"اتنا کیوں ڈر رہی ہو، کون رہتا ہے یہاں۔"

"رشتے دار ہی ہیں، مگر بڑی خوفناک قسم کی آنٹی ہیں، ذرا بھی مروت نہیں ان میں، یوں بھگا دیتی ہیں یوں۔" شانو نے چٹکی بجا کے دکھائی۔

"رشتے دار ہیں؟ چلیں اس گھر میں؟" عمیمہ کھل اٹھی۔

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے کھڑوس آنٹی کی گالیاں سننے کا۔'' شانو دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

''ویسے ہیں کون؟'' عمیمہ نے ہرزاویے سے تصاویر بھی کھینچ لیں اور مووی بھی بنالی تھی۔ اب تجسس سے شانو کو دیکھ رہی تھی۔

''پتا نہیں پاپا کی کوئی رشتے دار ہیں۔ نہ خود کہیں جاتی ہیں نہ کسی کا اپنے گھر آنا پسند کرتی ہیں۔''

''کیوں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' شانو نے اپنے شانے اچکائے۔

''اور تم نے یقیناً معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہوگی۔''

''تو مجھے کیا ضرورت ہے ایسے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی، جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' شانو کا انداز لاپروائی لیے ہوئے تھا۔

''تم بے حد بورنگ ہو۔'' آگے چلتے ہوئے عمیمہ نے فیصلہ صادر کیا۔

''میں اور بورنگ؟ ذرا میری تمام دوستوں سے پوچھو، کتنا انجوائے کرتے ہیں سب میرے ساتھ۔'' شانو نے ایک ذرا ٹھہر کر بے حد صدمے سے اسے دیکھا۔

''تمہاری سب سے اچھی دوست میں تمہیں بتا رہی ہوں اس لیے یقین کرو۔ تم بے حد بورنگ ہو، اتنا آرٹسٹک مکان بالکل کسی پینٹنگ میں نظر آتے گھر کی طرح اور تم ایک قدم ٹھہر کر اس کی دلکشی کو نہ دیکھتی ہو، نہ محسوس کرتی ہو؟''

عمیمہ نے چلتے چلتے دائیں بائیں جدید وضع کے مکانات پہ ایک نظر دوڑائی۔

''اتنے زبردست قسم کے بنگلوز کے سامنے تمہیں وہ کھنڈر اچھا لگ رہا ہے۔'' شانو کی ننھی منی موبائل زدہ عقل میں عمیمہ کے خیالات و فرمودات سمانے سے قاصر تھے۔

''دنیا بھر کے لوگ پیسے خرچ کر کے ٹکٹ خرید کے کھنڈرات دیکھتے ہیں کچھ تو ہوتا ہی ہے ان میں، خوب صورتی، کشش، انفرادیت اور تاریخ۔''

''کھنڈرات میں کچھ نہیں ہوتا، لوگوں کے دماغوں میں فتور ہوتا ہے۔'' شانو کا جواب انتہائی اشتعال انگیز تھا۔ عمیمہ نے رک کر اسے گھور کے دیکھا۔

''تمہارا اوپر کا پورشن بالکل خالی ہے یا استعمال نہیں کرتیں؟''

''کم از کم ان فضولیات میں تو بالکل استعمال نہیں کرتی، جن میں تم لگی رہتی ہو۔ لوگ برج خلیفہ بنا رہے ہیں، ٹوئن ٹاور بنا رہے ہیں، اسکائی اسکریپرز بن رہے ہیں دنیا میں، تم کھنڈرات پہ جان دے رہی ہو۔'' شانو نے لتاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

''ہر کھنڈر گزرے انسانوں اور داستانوں سے عبارت ہوتا ہے۔'' عمیمہ شستہ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

''میں ابھی زندہ ہوں میری جان، اور آگے بھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ پیاس کے مارے دم نکل رہا ہے۔ چلو کچھ پیتے ہیں۔''

شانو آگے کی طرف تیز تیز قدم بڑھانے لگی جہاں سامان سے بھری جگمگاتی ہوئی دکانیں نظر آ رہی تھیں۔

''تمہارا کچھ نہیں ہوسکتا۔'' عمیمہ نے افسوس سے سر ہلایا اور اس کی ہم قدم ہوگئی۔

واپسی پر بھی عمیمہ نے نظر بھر کر اس مکان کو ضرور دیکھا جو اس وقت نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک گرم صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ سورج میاں کے تیور ابتدا سے ہی خطرناک نظر آ رہے تھے مگر گھر کے اندر ان کرنوں کی ساری تیزی طراری اور تپش ناکام تھی، وہاں ایئر کنڈیشن نے فضا کو یخ بستہ کیا ہوا تھا۔ ناشتے کی میز پہ فقط تین افراد تھے، بڑے ابو، امی اور عمیمہ دنیا جہاں کی نعمتیں میز پہ موجود تھیں مگر بڑے ابو کا ناشتہ پرہیزی تھا۔ براؤن بریڈ، بغیر چینی کی چائے اور جو کا دلیہ، بڑی امی بھی براؤن بریڈ کے ساتھ برائے نام تیل میں پکا انڈا کھا رہی تھیں۔ عمیمہ کے آگے البتہ ایک ایک شے اصرار کے ساتھ رکھی جا رہی تھی اور کھانے کی تاکید کی جا رہی تھی۔

''بڑے ابو! یہ جو ہماری لائن میں کارنر کا مکان

ہے پرانا سا بنا ہوا وہاں کون رہتا ہے؟'' توس پہ جیم لگاتے ہوئے عمیمہ نے وہ سوال کر ہی دیا جو رات سے اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔

''ہماری ایک پھوپھی ہیں، وہ رہتی ہیں، دراصل سگی پھوپھی نہیں ہیں، ابا میاں کی کزن تھیں، شاید خالہ زاد وغیرہ۔''

انہوں نے لاپروائی مگر ذرا تفصیل سے سوال کا جواب دیا۔ اصولاً تو اب عمیمہ کی کسی اور جانی چاہیے تھی مگر وہ بی بی کانوں سے زیادہ آنکھیں استعمال کرنے کی عادی تھیں، سننے سے زیادہ دیکھنے پہ یقین رکھتی تھیں۔ تبھی ان سے فرمائش کی کہ وہاں لے کے چلیں۔

''چھوڑو بیٹا! تم کیا کرو گی وہاں جا کر، ویسے بھی پھوپھی اماں کسی سے میل ملاپ رکھنا پسند نہیں کرتیں۔ بے کار میں بندہ وہاں جا کر پہلے شرمندہ پھر خوار محسوس کرتا ہے خود کو۔'' بڑے ابو کی باتیں بھی کم و بیش اپنی صاحبزادی شانو کی طرح تھیں مگر عمیمہ پہ ان سب باتوں کا کیا اثر ہونا تھا۔

''اور کون کون ہے گھر میں؟''

''بیٹی اور ایک نواسا ہے۔'' وہ جواب دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ جانتی ہیں انہیں؟'' تایا چلے گئے تو عمیمہ تائی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ سلائس کھانے کے بعد اس نے تائی کا دماغ کھانے کا ارادہ کیا اور روئے سخن ان کی جانب کیا مگر وہ اس کا ارادہ بھانپ کر صاف بچ دے گئیں۔

''میں زیادہ کچھ نہیں جانتی فیملی کے بارے میں، جتنا اظہر بتا گئے ہیں، اتنا ہی معلوم ہے، دراصل اتنا آنا جانا نہیں ہے وہاں، وہ جوان کی پھوپھی ہیں، کسی سے بھی زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں، گنتی کی چند بار ہی ملاقات ہوئی ہے میری ان سے اور بس۔''

بڑی امی نے وہی سب کچھ بتایا جو شانو اور بڑے ابو اسے بتا چکے تھے۔ عمیمہ نے ایک بار پھر اپنی توجہ ناشتے کی طرف مبذول کرلی۔ مایوس تو خیر وہ اب بھی نہیں تھی بس یہ تھا کہ اب دماغ اور ہاتھ پیر اپنے ذاتی استعمال کرنے ہوں گے۔

☆☆☆

شادی کی تیاریاں تو کئی ہفتوں سے ہو رہی تھیں۔ اب یہ تیاری اپنے عروج پر تھی۔ شہر کے بڑے اور مشہور شاپنگ مالز سے خریداری، ڈریس ڈیزائنرز، ویڈنگ پلانر، ڈھولکی، مایوں، مہندی، بارات، ولیمہ، چوتھی، درجنوں تقریبات تھیں اور ان سے جڑے تمام اہتمام۔

زلفی بھائی نے ساری پلاننگ اور تفصیلات لیپ ٹاپ میں محفوظ کرلی تھیں۔ سب کام اسی پلاننگ کے تحت ہو رہے تھے۔ کس تقریب میں کتنے بجے کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ ایک ایک بات اور گانوں تک کی معلومات اور تفصیلات موجود تھیں۔ عمیمہ کو بڑے فخر سے انہوں نے اپنا کارنامہ دکھایا تھا۔

''زلفی بھائی! دو گھنٹے کا کام دو مہینوں میں کیوں پھیلا دیا ہے؟'' عمیمہ سے اسی سوال کی توقع کی جاسکتی تھی۔

''یہ مشرق کی روایات ہیں، رسم و رواج ہیں۔ مغرب میں رہنے بسنے والو، تم کیا جانو، تم لوگ دو گھنٹے میں شادی نمٹا کر کیسی کیسی خوشیوں سے محروم رہتے ہو؟''

''ہم شاید خوشیوں سے محروم رہتے ہوں مگر آپ لوگ اس ہلے گلے کی بدولت اپنے بینک بیلنس کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو جاتے ہیں۔''

''پیسے کی خیر ہے یار! بندہ آخر کماتا کس لیے ہے؟ شادی اور گھر، ان میں جتنا پیسہ لگ جائے کم ہے۔''

''پیسہ کمانا اور لٹانا آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں مگر جن لوگوں کے لیے ہے، انہیں ترغیب دے کر ان کے لیے بڑے مسائل پیدا کر رہے ہیں۔''

عمیمہ کے افکار و خیالات سے اس کے اماں بابا بھی کبھی کبھی پریشان ہو جاتے تھے، مگر انہوں نے خود ہی تو سوچنے اور بولنے کی آزادی دی تھی، اس لیے خاموش ہو جاتے تھے۔

''بھئی جس کی جتنی چادر ہے وہ اتنے ہی پیر پھیلائے، دوسروں کی نقل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

زلفی بھائی کا جواب معقولیت پہ مبنی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنا موبائل آن کر کے جلدی جلدی اوپر نیچے کیا اور اسکرین عمیمہ کے سامنے کی۔

pklibrary.com

Monthly Shuaa July 2021

"میرے سارے ڈریسز تیار ہوگئے ہیں، بتاؤ کیسے ہیں۔"
عمیمہ، ایک کے بعد ایک — انتہائی مہنگے اور خوب صورت جوڑے دیکھتی رہی، ہر جوڑا ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔
"شادی ایک ہی بار ہوتی ہے، جی بھر کے اپنے ارمان پورے کرنے چاہئیں۔"
زلفی بھائی کا قول شاید ٹھیک ہی تھا ان کے اپنے حساب سے، مگر عمیمہ کو شرارت سوجھی، بڑی سنجیدگی سے زلفی بھائی کو مخاطب کیا۔
"بعض افراد کو ایک کے بعد دوسرے چانسز بھی مل جاتے ہیں۔ کیا پتا آپ بھی ان خوش نصیبوں میں ہوں؟"
"میری سوئٹ ہارٹ کے سامنے ایسا مذاق نہ کرنا، میں تمہیں بچا نہیں سکوں گا۔" زلفی بھائی نے بھی اتنی ہی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔
کارڈ تقسیم کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ بیشتر دعوت نامے دیے جا چکے تھے۔ بس چند ایک گھرانے باقی رہ گئے تھے وہ بھی قریب ہی تھے۔
چھٹی والے دن بڑے ابو نے اس کام کو نمٹانے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ عمیمہ خوشی خوشی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی تھی۔
خواہشیں یوں بھی پوری ہو جاتی ہیں؟ لکڑی کے بڑے سے پھاٹک والے اسی قدیم گھر کے سامنے کھڑے ہو کر عمیمہ نے سوچا۔
بڑے ابو نے دستک دینے کا تکلف یونہی کیا۔ ادھ کھلے پٹ سے ایک نوجوان زرد پڑتی گھاس پہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے آ کر چرچراتے گیٹ کو پورا کھول دیا۔ تایا ابو سے علیک سلیک کی، عمیمہ سے ہیلو ہائے اور انہیں اندر لے جا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ عمیمہ نے کچھ عادت اور کچھ مارے تجسس اور شوق کے کمرے کا جائزہ لیا۔ پہلی، دوسری، تیسری بلکہ کسی بھی نظر میں کمرے کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ڈرائنگ روم ہے، بیڈ روم ہے، ڈائننگ روم ہے یا اسٹور۔
وہ ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ اس میں ایک طرف صوفہ سیٹ پڑا تھا جس پر وہ لوگ بیٹھے تھے۔ ایک بڑا سا تخت بھی بچھا تھا جس پہ جھالر دار چادر پڑی ہوئی تھی۔ ایک گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ یہاں دو پٹ والی، لوہے کی ایک الماری بھی تھی، ایک کونے میں گول میز اور تین کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ایک شوکیس رکھا تھا۔ جس میں کانچ اور چینی کے برتن تھے۔ عمیمہ ایک ایک شے کا بغور جائزہ لینے میں منہمک تھی، چوکنی تب ہوئی جب کمرے میں ایک بھاری بھرکم سی خاتون داخل ہوئیں۔ گوری رنگت، بڑی بڑی سنہری آنکھیں، وہ بالکل اس مکان کی مانند تھیں، شاندار اور بوسیدہ، آثار بتا رہے تھے کہ یہ کھنڈر کبھی ایک دیدہ زیب شاہکار تھا۔
"یہ کون ہے؟" اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے انہوں نے عمیمہ کو غور سے دیکھا۔ "بھتیجی ہے۔"
"دراصل میں زلفی کی شادی کا دعوت نامہ دینے آیا تھا۔" تایا ابو نے کارڈ ان کی جانب بڑھایا۔
"میں تو کہیں آتی جاتی نہیں، تمہیں تو معلوم ہے۔"
"بچوں کو بھیج دیجیے گا۔"
"رانی بھی نہیں آئے گی، اسے بھیج دوں گی۔"
انہوں نے اسی جوان کی طرف اشارہ کیا جو مہمانوں کے لیے کولڈ ڈرنک لے کر آیا تھا۔
ٹرے سے اٹھا کر ایک گلاس اس نے ماموں کو دیا ایک عمیمہ کی جانب بڑھایا۔
"کیا میں آپ کا گھر دیکھ سکتی ہوں؟" عمیمہ نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھر کے اچانک ہی براہ راست خاتون خانہ کو مخاطب کیا۔
"کیوں؟" ان کا لہجہ کرخت تھا۔ دوسرے میزبان نے ذرا دلچسپی اور حیرانی سے عمیمہ کا معائنہ کیا تھا۔
"باہر سے دیکھنے پر آپ کا گھر بہت خوب صورت لگا تھا، مجھے پرانی عمارتوں سے لگاؤ ہے۔" عمیمہ نے انگلش زدہ لہجے میں اردو بولنے کی کوشش کی۔
"ہر ایرے غیرے کو میں اپنے گھر میں نہیں گھساتی، جتنا دیکھ لیا، اتنا کافی ہے۔" پھوپھی جان کا لہجہ رکھائی لیے ہوئے تھا۔
اس ٹکڑا توڑ جواب کا تایا نے کوئی نوٹس نہیں لیا جیسے کہ وہ اس لب و لہجے کے عادی تھے، وہ بڑے اطمینان سے

Monthly Shuaa July 2021

اپنے دوسرے میزبان سے باتوں میں مصروف تھے۔
"میں ایری غیری نہیں ہوں آپ کی رشتے دار ہوں۔" عمیمہ نے احتجاج کیا۔
"ہوگی، میں کیا کروں۔" خاتون نے ناک سے مکھی اڑائی۔
"شانو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، میں مذاق سمجھی۔" عمیمہ نے ایک آہ بھری۔
"سچ مچ کنڑوس قسم کی خاتون ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے اپنا گلاس ختم کر رہی تھی جب کمرے میں ایک اور فرد داخل ہوا بلکہ ہوئیں۔ وہ آ کر عمیمہ کے سامنے بیٹھی تھیں۔ اس لیے اسے نووارد کا جائزہ لینے میں بڑی سہولت ہوگئی تھی۔ وہ ہو بہو پھوپھی جان کی تصویر تھیں۔ ویسی ہی گوری رنگت، سنہری آنکھیں، دل آویز نقوش بس عمر کا فرق تھا۔ وہ پھوپھی جان کی تقریباً آدھی عمر کی تھیں۔ وہ یونہی آ کر خاموش بیٹھی تھیں۔ عمیمہ نے خیر سگالی والی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔ وہ جواباً مسکرائی نہیں بس اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے عمیمہ کو دیکھتی رہیں۔
"آپ کون ہیں؟"
"میں؟ میں کون ہوں؟" سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ بڑبڑائیں۔
"رانی بٹیا! اندر جا کر آرام کرو۔" پھوپھی کے سخت لہجے میں خفیف سی نرمی چھپی ہوئی تھی۔
"آپ کی بیٹی ہیں؟ بالکل آپ کی طرح ہیں۔ سو پریٹی۔" عمیمہ نے حسب عادت بلا سوچے سمجھے بولنا شروع کر دیا۔
"اچھا اظہر میاں! پھر ملاقات ہوگی، میں شیراز کو بھیج دوں گی۔" پھوپھی اماں نے بدقت اپنے بھاری بھرکم وجود کو صوفے سے اٹھایا اور کھڑی ہوگئیں۔ ساتھ ہی انہوں نے رانی کا کاندھا بھی ہلا دیا۔
"جی!" وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔
"بڑے ابو.....!" عمیمہ نے ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھا، وہ کچھ دیر اور بیٹھ کر رانی سے باتیں کرنا چاہتی تھی جو عمیمہ کو ہی دیکھ رہی تھیں مگر ان کی نگاہیں ہر تاثر، ہر جذبے سے خالی تھیں۔
"پھر آئیں گے بیٹا!" بڑے ابو نے بیک وقت عمیمہ اور شیراز دونوں سے کہا تھا۔
واپسی کے بعد گھر میں شادی کے ہنگاموں، دیگر کزنز کی آمد اور ملے گلے میں بھی عمیمہ کے دل و دماغ سے کچھ فراموش نہیں ہوا تھا۔ دو خوب صورت مگر بالکل بے تاثر سنہری آنکھیں بار بار اس کے ذہن میں آتیں اور اس کا دھیان بھٹکا دیتیں۔
"کہاں گم ہو تم؟" شانو نے دوسری تیسری بار اس سے کوئی بات کہی تھی اور وہ ہوں ہاں کر کے رہ گئی۔
"بات سنو شانو! رانی آنٹی کے بارے میں تم کچھ جانتی ہو؟ بڑے ابو بتا رہے تھے کہ وہ سائیکو پیشنٹ ہیں؟"
"کون؟ کس کی بات کر رہی ہو..... اوہ وہ کارنر والی فیملی؟" شانو استفسار کرتے کرتے خود ہی سمجھ گئی۔
"ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے مگر کبھی بات یا ملاقات نہیں ہوئی ان سے، بچپن میں ایک دو بار دیکھا تھا انہیں، مگر تمہیں کیا انٹرسٹ ہوگیا ہے، پہلے مکان سے، پھر انسان سے؟" شانو جھنجلائی۔
"دنیا میں چند ہی چیزیں ہیں دلچسپی کی، جن میں سرفہرست انسان ہے۔" عمیمہ مسکائی۔
"تو ڈھنگ کے انسانوں میں انٹرسٹ لو، سائیکو پیشنٹ کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟"
"پتا نہیں کون، کس کے پیچھے پڑا ہے؟ میں یا ان کا خیال میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔" عمیمہ نے پرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔
"تم بھی اسی فیملی کا حصہ بنتی جا رہی ہو میڈم!" شانو اسے گھور کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

شادی شروع ہوئی، ڈھولکی سے آغاز ہوا، ہر فنکشن میں پانی کی طرح پیسہ بہایا جا رہا تھا۔ اتنا دھوم دھڑکا، ہلا گلا، رشتے داروں اور کزنز کے ساتھ مزا تو بہت آ رہا تھا عمیمہ کو مگر یہ کم بخت سوچنے کی عادت نہ جانے کس سے ورثے میں ملی تھی، اسے اندازہ نہیں

pklibrary.com

تھا کہ نمود و نمائش اور بے جا اسراف بھی یہاں کے کلچر کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

بارات کے دن عمیمہ کا جوڑا بھی شانو اور دیگر کزنز کی طرح خاصا فارمل تھا۔ گلابی غرارہ ساتھ ہم رنگ قمیص دوپٹہ بے حد خوب صورت اور نفیس کام کے ساتھ، بک سک سے تیار وہ موبائل کان سے لگائے ہنستی ہوئی چلی آ رہی تھی، چھوٹی بہن کا فون تھا۔ وہ اپنی بدحواس کلاس فیلوز کے قصے اور لطیفے سنا رہی تھی۔ عمیمہ نے جب خدا حافظ کر کے موبائل آف کیا تب بھی وہ ہنس ہی رہی تھی اور موبائل آف کر کے سامنے دیکھتے ہوئے اس نے خود کو بے اختیار بریک لگایا تب بھی اس کے چہرے پہ بڑی خوب صورت ہنسی بکھری ہوئی تھی۔

''ارے آپ؟ کیسے ہیں؟''

''اچھا ہوں، آپ کیسی ہیں؟''

''آپ کی طرح اچھا ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتی، ویسے ٹھیک ہوں۔''

عمیمہ کی اس سے یہ تیسری چوتھی ملاقات تھی۔ وہ مایوں، مہندی کے فنکشن میں بھی آیا تھا اور عمیمہ نے اس کے گھر کی تعریف کرتے ہوئے اسے اندر سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

عمیمہ کے برجستہ جواب پہ وہ محظوظ ہو کر مسکرایا تھا۔

''بہت اچھا کرتی ہیں آپ جو اچھا ہونے کا دعوا نہیں کرتیں، یہ ضروری بھی نہیں۔'' عمیمہ کے ہم قدم چلتا ہوا شیراز گویا ہوا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ جن کی آنکھیں شفاف ہوں اور مسکراہٹ بے ریا انہیں اپنی اچھائی کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اچھا.....!'' عمیمہ پھر ہنس پڑی بقول مما جان خوامخواہ کی ہنسی ہر وقت کی ہنسی، پتا نہیں کیوں اسے بات بے بات اتنی ہنسی کیوں آتی تھی یا شاید سب ہی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں ایک جیسی۔

''اچھا تو آپ پرسوں اپنے گھر کے بارے میں بتا رہے تھے، ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی۔'' عمیمہ نے کچھ یاد کیا یا اسے یاد دلایا۔

''یہ گھر میرے نانا نے بنوایا تھا، بہت محبت اور بہت چاؤ سے، وہ آرکیٹیکٹ تھے۔ انہوں نے خود ڈیزائن کیا تھا اسے۔'' چلتے چلتے وہ ٹھہر گیا۔

''بہت آرٹسٹک مائنڈ تھا ان کا۔'' عمیمہ نے تبصرہ کیا۔

''ہاں، مگر شاید قسمت کو ان کا یہ خواب پسند نہیں آیا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس گھر میں شفٹ ہونے کے بعد وہ دو ماہ سے زیادہ نہیں جیے، پھر نانی نے تین بچوں کو کیسے سنبھالا، کیسے پالا اور کیا زندگی گزاری یہ ایک الگ کہانی ہے۔''

''اوہ!'' عمیمہ کے چہرے پہ افسوس کے تاثرات آ گئے۔

''ارے میں بھی اس وقت کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا، آپ پلیز شادی انجوائے کریں۔'' شیراز کو یکدم ہی کوئی خیال آیا۔

''ارے تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ ضرور شیراز بھائی کا دماغ کھا رہی ہو گی اب، چلو سب بلا رہے ہیں تمہیں، گروپ فوٹو میں تمہاری کمی ہے بس۔''

شانو شور مچاتی ہوئی آئی اور اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئی۔

☆☆☆

شادی کے ہنگامے ذرا سرد پڑے تو ماہ رمضان شروع ہو گیا۔

عمیمہ کچھ دنوں کے لیے اپنے ددھیالی آبائی گھر گئی تھی۔ وہاں ایک تایا اور ایک چچا کی فیملی تھی۔ پھپھو بھی قریب ہی رہتی تھیں۔ دادا، دادی تو فوت ہو چکے تھے۔ مگر ان سب نے عمیمہ کا بہت پرتپاک استقبال کیا اسے دی آئی پی پروٹوکول ملا ہوا تھا۔

یہاں اگرچہ اظہر تایا کی طرح بہت زیادہ خوش حالی اور پیسے کی اتنی فراوانی نہیں تھی تاہم ان میں سے کوئی بھی اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا۔ معاشی طور پہ ٹھیک ٹھاک مستحکم تھے۔ کزنز کے درمیان عمیمہ کو بہت مزا آ رہا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے بھی وہ تقریباً سب

سے واقف تھی۔ شادی میں ہوئی ملاقات اور جدید ذرائع ابلاغ نے فاصلوں کو، ناواقفیت کو اور اجنبیت کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے۔

بنیادی طور پہ عمیمہ زندہ دل خوش باش قسم کی لڑکی تھی۔ اس کی دوستی بہت جلد ہو جاتی تھی سب سے پھر اس کی عادتیں بھی بے ضرر قسم کی تھیں، کسی کو تنگ کرنے یا پریشان کرنے والا مزاج نہ تھا اس کا۔

''بھئی عمیمہ! تمہیں دیکھ کر تو بالکل نہیں لگتا کہ تم لندن سے آئی ہو۔'' چھوٹی چچی تو اس سے بہت ہی متاثر تھیں۔

''باہر سے آنے والوں کے سر پہ سینگ ہوتے ہیں کیا؟'' عمیمہ ہنس پڑی۔

وہی عادت کے مطابق، بات ہنسنے کی ہو نہ ہو، ہنسی ضرور آتی ہے۔

''سینگ ہی نہیں، بعض لوگوں کی تو ایک عدد دم بھی ہوتی ہے۔'' ان کی بیٹی پٹاخ سے بولی اور عمیمہ کی پھر..... وہی مشہور زمانہ ہنسی۔

''پتا ہے ہماری آنٹی بھی کینیڈا میں ہیں پچھلے سال اپنے بچوں کے ساتھ آئی تھیں وہ، اف توبہ، اتنے نخرے، اتنی باتیں، اتنی گرمی ہے یہاں، گندگی بہت ہے، ڈسٹ بہت ہے، لوگ بولتے بہت ہیں۔ زبردستی چپکتے ہیں، ذاتی معاملات کرید تے ہیں، انہیں تو یہاں کی ہر چیز میں ہر فرد میں کوئی نہ کوئی برائی نظر آتی رہی، اپنی مرضی ہوئی تو ہنس بول لیا، موڈ نہیں ہے تو کسی سے بات نہیں کریں گی۔'' یمنی شروع ہو گئی۔

''ارے چھوڑو تم یہ سب باتیں، تم سناؤ کہیں رشتہ وشتہ طے ہوا تمہارا؟''

چچی نے عمیمہ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

جس سے ان کی کینیڈین پلٹ بھانجیاں چڑ جاتی تھیں اور عمیمہ ہنس پڑی۔

☆☆☆

ماہ رمضان شروع ہو چکا تھا۔ آسودہ حال اور پیسے کی ریل پیل والے گھرانوں کی طرح یہاں بھی نعمتوں کی فراوانی تھی، سحری ہو یا افطاری کھانے کی میز انواع واقسام کے نت نئے پکوانوں سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔

''اتنی ڈشز کیوں بنتی ہیں جو بعد میں ضائع ہوتی ہیں؟'' عمیمہ نے شانو سے سوال کیا۔

''ارے ضائع تھوڑی ہوتا ہے ماسیاں لے جاتی ہیں آس پاس جو سلمز (کچی آبادی) کے لوگ ہیں وہ لوگ بھی لے جاتے ہیں۔''

''بچا کھچا دے کر ثواب کمایا جاتا ہے؟''

''تو میکچریار، عید کی شاپنگ کب کرو گی؟''

''عید سے دو دن پہلے۔'' عمیمہ نے بے خیالی میں بولتے بولتے لب بھینچ لیے، وہ سب بہت شدت سے یاد آیا جسے بھلانے کے لیے یہاں تک آ گئی تھی مگر پتا نہیں کیا اسرار ہے یہ، جتنا دور بھاگنے کی اور بھلانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ دشمن جاں اتنا ہی قریب محسوس ہوتا تھا۔

''کیا ہوا؟ کہاں کھو گئیں؟'' شانو نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''کہیں نہیں۔'' عمیمہ نے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی کو ٹٹولا۔ ایک انگوٹھی کا لمس لمحہ بھر کو چمکا اور واقعہ یہ تھا کہ اس انگلی میں جو انگوٹھی اس نے پہنی تھی وہ چند لمحوں کے لیے ہی پہنی تھی اور کچھ عرصہ جو اس نے سرخوشی، شادمانی اور کیف میں گزارا تھا وہ عرصہ بیت گیا تھا، اب اس گزرے وقت کو بھلانے اور فراموش کرنے کے لیے (اگرچہ یہ بہت مشکل امر تھا اس کے لیے)

وہ جتن کر تو رہی تھی مگر بس کبھی کسی یاد کی روشنی کوندتی اور وہ سب اسے پھر سے نظر آنے لگتا، یاد آنے لگتا، جسے یاد کرنے کا کوئی جواز رہا نہ فائدہ، مگر دل اپنے معاملات میں کوئی فائدہ دیکھتا کب ہے؟ کوئی جواز ڈھونڈتا کہاں ہے؟ اس بے چین و بے قرار دل کے لیے مصروفیات ڈھونڈنا ضروری تھا۔ اسے بہلانا اور کہیں اور لگانا ضروری تھا۔

وہ بہت پریکٹیکل سہی مگر دل کے معاملات تو ایسے ہی ہوتے ہیں، پتھروں پہ بھی اثر انداز ہو جاتے ہیں اور وہ جو خود کو بہت حقیقت پسند اور عملی لڑکی سمجھتی

تھی اسے علم ہوا کہ دل کو چوٹ پہنچے تو بہت تکلیف ہوتی ہے اور کوئی بھی انسان کتنا ہی حقیقت پسند اور عملی ہو اس کی تکلیف کو بہت بری طرح محسوس کرتا ہے۔

''مومو۔'' شانو نے اس کا نک نیم پکارتے ہوئے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' شانو کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔ (اچھے دوست بھی کتنی بڑی نعمت ہوتے ہیں)

''میں ٹھیک ہوں شانو! بس یہ دل؟ یہ دل..... یہ اب تک ٹھیک نہیں۔'' عمیمہ بے بسی کی انتہا پہ پہنچ کر مسکرادی۔

سحری، روزہ، افطاری، نمازیں، تلاوت، دن نکلنا، ڈھلنا اور ختم ہو جانا، آدھا ماہ گزر گیا تھا جب بڑے ابو کے گھر افطار پارٹی ہوئی، افطار ڈنر، ہمیشہ کی طرح بے حد اہتمام، بڑا خرچا۔ سب کی مصروفیات دیکھتی رہی، سب کے ساتھ بولتی رہی ہنستی رہی۔

''آپ پھر اکیلے آ گئے، رانی آنٹی کو لے آتے؟'' شیراز کو تنہا دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

''وہ بھی نانی کی طرح کہیں جاتی نہیں ہیں گھر پر ہی رہتی ہیں۔'' سادہ سے قمیص شلوار میں ملبوس، سادگی سے بولتا ہوا شیراز۔

''مگر کیوں؟'' عمیمہ کی آنکھوں میں حیرت کا جہان تھا، سوالوں کی دنیا تھی۔

''کیونکہ ..... کیونکہ .....'' شیراز الفاظ ڈھونڈنے میں ناکام ہو گیا، تبھی جواب دینے کے بجائے مشورہ دے بیٹھا۔

''ہر سوال کا جواب جاننا ضروری نہیں ہوتا۔''

''مگر ہر سوال کا جواب تو ہوتا ہے نا؟'' عمیمہ کا اضطراب بڑھا۔

''یہ تمہاری عمر سوالوں جوابوں میں پڑنے والی نہیں ہے، لائف انجوائے کرو لڑکی!'' شیراز آگے بڑھ گیا۔

عمر تو سوالوں جوابوں میں پڑنے والی نہیں تھی مگر پھر بھی اس کے ہاتھوں میں ایک سوال نامہ تھما دیا گیا تھا۔

''کیا تمہیں لگتا ہے ہم دونوں مزید ایک ساتھ آگے چل سکتے ہیں؟''

''میں بے بس ہو گیا ہوں مومو! تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟''

عمیر کی آواز، اس کے سوالات، اس کی وضاحتیں، اس کی معذرتیں بازگشت بن کر عمیمہ کا پیچھا کر رہی تھیں۔

''مومو! مومو!'' کوئی اسے پکار رہا تھا وہ ماضی کے سرابوں اور عذابوں سے نکل کر حال کی دنیا میں واپس آئی۔ یہاں نہ عمیر تھا نہ اس کے سوالات، نہ بے رحم وضاحتیں، نہ بے معنی معذرتیں۔

''جی آنٹی!'' وہ ایک طرف کو لپکی، جہاں سے اسے آواز دی گئی تھی۔

☆☆☆

چاند رات کو گھر سے فون آیا۔ سب سے بات ہو گئی۔ وہاں آج عید ہو گئی تھی۔ امی اس کے لیے بہت فکر مند تھیں۔

''تم ٹھیک تو ہو نا مومو!'' پانچ منٹ میں انہوں نے تیسری بار پوچھا تھا۔

''آپ پریشان مت ہوں مما! میں خود کو سنبھال لوں گی، بس کچھ وقت لگے گا۔'' عمیمہ نے بہت رسان سے انہیں جواب دیا تھا۔

''اللہ سمجھے اس عمیر سے، مجھے کیا، کسی کو بھی اس سے یہ امید نہیں تھی۔'' مما کا غصہ اور رنج ابھی تک اپنی جگہ برقرار تھا۔

''مجھے بھی نہیں تھی مگر زندگی میں بہت کچھ ہوتا ہے جو ناقابل یقین ہوتا ہے اور ناقابل برداشت بھی اور ہمیں یقین اور برداشت دونوں کرنے پڑتے ہیں۔'' عمیمہ انہیں بھی بتا رہی تھی اور خود کو بھی سمجھا رہی تھی۔

''میرا تو دل نہیں چاہتا اس کی شکل دیکھنے کو، بے شک سگا بھتیجا ہے مگر اولاد کا دل دکھانے والا کتنا ہی سگا کیوں نہ ہو، ہر رشتہ ختم ہو جاتا ہے، میں نے تو کہہ دیا اس کے باپ سے بھی اور ماں سے بھی۔'' مما

کی آواز میں آنسوؤں کی نمی آ گئی تھی۔
''چھوڑیں نا، ماموں یا ممانی کا اس میں کیا قصور ہے؟ وہ دونوں بے چارے تو خود بیٹے کی حرکت سے شاکڈ ہو گئے تھے۔''
''اچھا چلو، رہنے دو، تم اپنا خیال رکھنا اور خوش رہنا اچھا۔''
''جی!'' عمیمہ نے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون آف کر دیا۔
زلفی بھائی کی بیگم کی پہلی عید تھی۔ جسے بڑے اہتمام اور سارے چاؤ چوچلوں کے ساتھ منانے کی تیاری کی گئی تھی۔ وہ ایک مہنگے پارلر سے بڑی بھاری رقم کے عوض مہندی لگوا کر آئی تھیں۔ بالوں کا رنگ اور انداز بھی تبدیل ہو گیا تھا۔
شانو، عمیمہ کے ساتھ چاند رات کی رونقیں دیکھنے نکلی ہوئی تھی اور عمیمہ کو اندازہ ہوا کہ فقط وہ دونوں ہی نہیں آج پورے پاکستان کی آبادی بازاروں، سڑکوں، گلیوں میں نکل آئی ہے۔
دونوں نے اپنے لیے چوڑیاں خریدیں، مہندی لگوانے کے لیے ہر جگہ استعارش تھا کہ انہیں لگا صبح عید کی نماز یہیں پڑھنی پڑے گی۔
''چلو یار! ہماری طرف دو چار لڑکیاں ہیں، بڑی اچھی مہندی لگاتی ہیں وہیں سے لگواتے ہیں۔'' شانو اسے اپنے ساتھ ساتھ لیے گھسیٹ رہی تھی۔
عید کی صبح، چاند رات کی نسبت کچھ خاموش اور پرسکون سی تھی۔ روایتی گہما گہمی اور ہنگامے سے ذرا پرے، بڑے ابو عید کی نماز پڑھ کر آئے تو زلفی بھائی سو کر بھی نہیں اٹھے تھے شانو اور عمیمہ البتہ تیار ہو کر بیٹھی اب بور ہو رہی تھیں۔
''چلو شانو بڑی آنٹی اور رانی آنٹی سے عید ملنے چلیں۔''
''معاف کرو عید کے روز بھی ویسی ہی رہتی ہیں جیسے سال کے باقی دنوں میں مزاج ہوتا ہے ان کا۔'' شانو نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔
''شیراز تو ایسے نہیں ہیں نا، انہیں مبارک باد دے آتے ہیں۔'' عمیمہ نے اسے منانے کی کوشش کی۔
''ہو سکتا ہے وہ شام میں خود ہی چکر لگا لیں جب ہی دے دیں گے عید کی مبارک باد۔'' شانو ٹس سے مس نہ ہوئی۔
سہ پہر ڈھلنے لگی تھی عمیمہ نے خود ہی فیصلہ کیا، آئینے میں اپنا جائزہ لیا، گھر والوں کا جائزہ لیا اور خاموشی سے گھر سے نکل گئی۔ سڑک کنارے چار دیواری، درختوں اور گھنی بیلوں میں گھرا وہ مکان ویسی ہی شان سے ایستادہ تھا۔
عمیمہ نے پھاٹک کو دھکیلا تو وہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا سامنے کا منظر وہی تھا پہلے جیسا، بڑھی ہوئی گھاس، درخت، پودے، بے ترتیب گھنی بیلیں، گھر کا اندر داخلی دروازہ بند تھا، احاطے میں ایک طرف سفید رنگ کا گول چکر دار زینہ اوپر جا رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اوپر نگاہ دوڑائی، کھلی کھڑکی میں سرخ آنچل سا لہرایا تھا۔ عمیمہ نے داخلی دروازہ دھکیل کر دیکھا وہ اندر سے بند تھا۔
وہ چند لمحے تذبذب میں کھڑی رہی پھر سیڑھیوں کی جانب بڑھی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچی تو بالکنی میں سب سے پہلی کھڑکی وہی تھی جہاں لہراتا آنچل دیکھا تھا، عمیمہ نے کھڑکی سے جھانکا اور کھڑی کی کھڑی رہ گئی، اس کی بے یقین نگاہوں کے سامنے رانی آنٹی کھڑی تھیں، سنگھار میز کے آئینے میں اپنا جائزہ لیتی ہوئی، سرخ عروسی جوڑا، ٹیکہ جھومر سمیت مکمل زیورات اور میک اپ میں سجی ہوئی وہ دلہن کا روپ دھارے ہوئی تھیں۔
انہوں نے گردن گھما کر کھڑکی کی جانب دیکھا، ان کی سنہری آنکھیں، عمیمہ کی حیران اور بے یقین نگاہوں سے ٹکرائیں، عمیمہ نے گڑبڑا کر اپنا سر گھمایا تو نگاہ نیچے اس جھاڑ جھنکار چھوٹے سے باغیچے پہ پڑی، جہاں کھلے پھاٹک سے شیراز اندر آ رہا تھا اور اوپر بالکنی میں عمیمہ کو کھڑا دیکھ کر اس کے تاثرات بھی عمیمہ جیسے ہو گئے تھے، پہلے حیران اور پھر پریشان، بہت تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آیا تھا۔

pklibrary.com

''میں عید ملنے آئی تھی آپ سب سے۔'' شیراز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عمیمہ نے وضاحت کی۔
''گیٹ کھلا ہوا تھا تو میں اندر آ گئی، آئی ایم سوری، بغیر اجازت مجھے اندر نہیں آنا چاہیے تھا شاید۔'' عمیمہ شرمندہ ہونے لگی۔
''اٹس اوکے، دراصل میں دس منٹ کے لیے ہی باہر گیا تھا، اندر سے گیٹ بند کرنے والا کوئی نہ تھا گھر میں، نانی سو رہی ہیں اور خالہ.....'' شیراز نے لب بھینچ لیے۔
''یہ..... کیا ہے؟'' عمیمہ نے ایک نظر پہلے شیراز پہ پھر رانی آنٹی پہ ڈالی جو پھر سے آئینے کے سامنے مگن تھیں۔ عمیمہ اور شیراز بلکہ دنیا سے بے خبر۔
''عید مبارک ہو۔''
شیراز نے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسے عید کی مبارکباد دی۔ اور سامنے کی طرف چل دیا۔ طویل بالکنی کے دوسرے سرے پہ تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ عمیمہ نے ایک نظر پھر کمرے میں اندر کھڑے اس وجود پہ ڈالی پھر شیراز کی طرف بڑھی۔
شیراز بالکنی پہ ہاتھ جمائے جھکا ہوا تھا۔ عمیمہ بھی وہیں کھڑی ہو گئی۔ شیراز سیدھا ہوا۔
''یہ جو آپ نے ابھی دیکھا، یہ محبت کا شاخسانہ ہے یا الفت کی سزا۔'' عمیمہ کو مخاطب کرتے ہوئے وہ سامنے کی جانب دیکھ رہا تھا اور بول رہا تھا۔ عمیمہ خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔
''محبت غلط فرد سے کی جائے تو سزا بن جاتی ہے۔'' شیراز نے گردن موڑ کر عمیمہ کی آنکھوں میں جھانکا جہاں بہت اندر کہیں نمی کی ایک تہہ جھلملا رہی تھی۔
''جیسے تمہارے ساتھ ہوا.....'' شیراز کی بات پہ اس کا پورا وجود ہی شل ہو گیا تھا۔ بمشکل اس نے اپنی پلکیں اٹھائیں۔
''تمہیں کیسے معلوم؟'' عمیمہ کا سوال اس کی آنکھوں میں رقم تھا۔ شیراز نے پڑھ لیا۔ تبھی گویا ہوا۔
''تم اتنا ہنستی ہو، بات بات پہ ہنسی، لوگوں کو جو تاثر دینا چاہتی ہو، اکثر کامیاب رہتی ہو مگر کبھی تمہاری ہنسی ساتھ نہیں دیتی نہ چہرے کا، نہ آنکھوں کا، محبت اگر دکھ پہنچائے تو انسان اکثر سنبھل ہی جاتے ہیں۔ مگر کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو خود کو سنبھال نہیں پاتا، رانی خالہ بھی ان ہی چند افراد میں سے تھیں۔''
شیراز اسے وہ سب بتا رہا تھا جو اسے بتایا گیا تھا کبھی۔
''کبھی جب رانیہ عرف رانی ایک کم عمر الھڑ سی، خوابوں میں رہنے والی پیاری سی لڑکی تھی، اس کی سنہری آنکھوں پہ پڑی لانبی پلکیں گرتے اٹھتے کسی کے بھی دل کی دنیا زیر و زبر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اور اس کی خوب صورتی، سادگی، معصومیت کتنوں کو گھائل کر گئی مگر اکبر تو جیسے دیوانہ ہو کر پروانہ بن گیا تھا۔ آپس میں رشتے داری تھی، وہ گھڑی گھڑی کبھی کسی بہانے، کبھی کسی بہانے کوچہ جاناں کا طواف کرتا رہتا، اپنی شدتوں اور بے قراریوں کو قطرہ قطرہ رانی کے دل پہ لکھتا رہا، رانی کوئی پتھر تو نہ تھی، وہی لڑکیوں والا، چڑیا سا، خوابوں سے، امنگوں آرزوؤں سے بھرا، نرم و گداز دل تھا اور پھر واقعہ یہ ہوا تھا کہ وہ جو شمع تھی، خود ہی پروانہ بن گئی، شوخ جاذب نظر، چلبلا مگر بہت ذہین اور بہت محنتی اکبر وہ خوابوں کا آسمان رانی کے سامنے کر دیتا اور خود اس کی اپنی آنکھیں ستاروں کی طرح جگر جگر کرنے لگتیں، رانی کی سپنوں سے بوجھل آنکھیں بند تھیں مگر ماں کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں، جہاں دیدہ اور تجربے کار نگاہیں، پھر ساری معلومات کہ اکبر رشتے دار بھی تھا۔
''دل پھینک ہے موا، نظر باز، پہلے آفرین کے پیچھے پڑا ہوا تھا، اس سے پہلے سمیرا کے گھر کے چکر لگاتا رہتا تھا، میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹری کی پڑھائی کیسے پڑھتا ہے؟''
ماں کے بتانے اور سمجھانے کا رانی پہ کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اکبر نے جو یقین دلایا تھا اپنی محبت کا اور سنجیدہ ہونے کا وہ یقین بہت پختہ اور پائیدار تھا اور پھر وہ اپنے گھر والوں کو بھی تو اس رشتے کے لیے منا رہا تھا جو پہلے اس کی تعلیم مکمل ہونے پہ زور دے رہے تھے۔

pklibrary.com

ہوا کے پیروں پہ محبت نامے لکھتے لکھتے اور پڑھتے پڑھتے دونوں ہی آسمانوں میں پہنچے ہوئے تھے۔

رانی کی سنہری آنکھوں میں چمک بڑھتی جارہی تھی کہ سارے خدشات اوہام، وسوسے اور شکوک و شبہات بھاپ بن کر اڑ گئے تھے۔ اکبر کے والد نے آ کر اس رشتے کو قبولیت اور مضبوطی کی سند دے دی تھی، وہ رانی کا منہ میٹھا کرگئے، سر پہ سرخ دوپٹا اوڑھا دیا، خروٹی انگلیوں والے موٹی ہاتھوں میں شگن کے نوٹ رکھ دیے تھے اور رانی کو اکبر سے منسوب کر دیا تھا۔

''دیکھا، میں نے کہا تھا نا کہ میری محبت سچی ہے اور میں بھی۔''

اکبر کا فخر رانی کی آنکھوں میں اس کے چہرے پہ اعتماد بن کر اتر گیا تھا، جذب ہو گیا تھا، اس کے اندر رچ بس گیا تھا یہ اعتبار کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں اور آخری سانس تک ایک دوسرے کے ہو کے رہیں گے۔

نوعمری کی اولین محبت، چاہے جانے کا احساس، سراہے جانے کا احساس، کسی سے محبت کرنے کا احساس، کتنا کچھ تھا جو روح میں گھل مل گیا تھا۔ جیسے پانی میں رنگ حل ہو جائے، ہوا میں مہک شامل ہو جائے، رانی کو والہانہ محبت ہو گئی تھی، ایسی محبت جس میں وقت گزرتا تو ہے مگر گزرتا ہوا محسوس نہیں ہوتا، یوں لگتا ہے جیسے تھم گیا ہو، ایک جگہ ٹھہر گیا ہو۔

ایسی محبت کہ دور ہوتے ہوئے بھی کوئی قریب محسوس ہو، ہر وقت آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس، کسی کے ساتھ ہونے کا احساس۔

ایسی محبت، ویسی محبت، کیسی محبت؟ کیسی محبت ہو گئی تھی رانیہ شہاب کو کہ اگر بھولے سے بھی کوئی خیال آجاتا کسی انہونی کا، تو اس کا دل بند ہونے لگتا اور جب اکبر نے لندن جانے کا بتایا تو وہ بالکل ہی ڈھے گئی۔

''ڈاکٹر تو بن گئے ہو، اب وہاں کیوں جا رہے ہو؟''

''آپا بلا رہی ہیں، بھائی جان (بہنوئی) اسپانسر کر رہے ہیں ایسا چانس بار بار نہیں ملتا، میں اسے مس نہیں کرنا چاہتا۔ دیکھو اگر وہاں سیٹل ہو گیا تو تمہیں بھی لے جاؤں گا۔'' وہ رانی کو مزید خواب دکھا رہا تھا۔

''نہیں، میں تمہیں نہیں جانے دوں گی، پہلے ہی بڑے ماموں (اکبر کے والد) کے انتقال کی وجہ سے شادی کی ڈیٹ آگے بڑھ چکی ہے اب پھر.....''

''اب ڈیٹ آگے نہیں بڑھے گی، آئی پرامس، میں چاہے چاند رات کو آؤں مگر ضرور آؤں گا۔'' وعدوں کی ڈور رانیہ کے ہاتھ میں تھما کر وہ پردیس چلا گیا۔

''عید کے روز تمہیں رخصت کرا کے لے جاؤں گا۔ اتنی پریشان شکل نہ بناؤ، تمہارا مسکراتا چہرہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

سارے وعدے، دلاسے، تسلیاں پھولوں کی طرح اپنے آنچل میں سمیٹ کر رانیہ انتظار کے پل گن رہی تھی نگاہیں تھیں کہ گھڑی کی سوئیوں سے بندھ گئی تھیں۔

شعبان کا مہینہ گزر گیا، رمضان بھی گزر گیا عید کا دن آ گیا اور گزر بھی گیا، اکبر لندن سے واپس نہیں آیا۔

پچیس سال گزر گئے تھے وہ ایک بار بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے وہاں شادی کر لی تھی۔ وہ وہیں سیٹل ہو گیا اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ایک کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے متعلق خبریں اور اطلاعات ملتی گئیں مگر رانیہ کو کسی کی کسی بات پہ یقین نہ آیا، دھوکے اور بے وفائی نے اس کی دھڑکنیں تو نہیں روکیں مگر گھڑی کی سوئیاں ضرور رک گئی تھیں۔ وقت اس کے لیے ٹھہر گیا تھا وہ آج بھی بس اسی لمحے میں زندہ تھی جب اکبر واپسی کا وعدہ کر کے اس سے رخصت ہوا تھا۔ ہر سال عید کے روز وہ دلہن بن کر تیار

pklibrary.com

ہو جاتی تھی اور اس کی آمد کا انتظار کرتی تھی۔

شام کے سرمئی سائے پھیلنے لگے تھے، نیلے آسمان پہ سفید بادلوں اور کبوتروں کی ٹکڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ شیراز نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے تھے، اس کی نگاہیں سامنے کہیں افق پر تھیں۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتا رہا پھر گویا ہوا۔

"خالہ سے زیادہ بڑا صدمہ اور غم نانی جان کو پہنچا تھا۔ ان کی بیٹی دیکھتے ہی دیکھتے ان کے سامنے ہی ایک زندہ لاش بن گئی تھی، پہلے ہی وہ میری امی کی جوان مرگی کا دکھ لیے بیٹھی تھیں اب دوسری بیٹی بھی نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں، نانی کا مزاج تلخ ہوتا چلا گیا۔ لوگوں کی ہمدردی بری لگنے لگی، انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، لوگوں سے خود ملنا جلنا چھوڑ دیا اور ان کے مزاج اور زبان کی کڑواہٹ کی وجہ سے لوگ بھی یہاں آنے سے کترانے لگے۔"

"اور یہ زندگی بعض افراد کے لیے کبھی کتنی بے رحم ہو جاتی ہے؟" عمیمہ نے سرمئی شام اپنے آس پاس محسوس کی اور سوچا۔

"کیا آپ اتفاقات پہ یقین رکھتے ہیں؟"

"ہاں!" شیراز کا جواب مختصر تھا۔

"کیا ایسا بھی ہوتا ہے کبھی کہ قدرت ہم سے کوئی کام لیتی ہے اپنے بعض مقاصد کی تکمیل کے لیے اور ہم ان سب سے بے خبر ہوتے ہیں؟"

عمیمہ کے لہجے میں اضطراب تھا۔ آج اس پر جو کچھ بھی منکشف ہوا تھا۔ اس نے عمیمہ کو جیسے کسی پاتال میں دھکیل دیا تھا، جو اپنے ہوتے ہیں جو پیارے ہوتے ہیں ان کے متعلق کوئی ایسی بات علم میں آئے جو عظمت کے بتوں کو اوندھے منہ گرا دے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ بے حد دکھ ہوتا ہے اور درد سے زیادہ شرمندگی ہوتی ہے۔

عمیمہ نے اپنی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا ایک لمحاتی لمس اب بھی چاند بن کر تیسری انگلی کے گرد جگمگا رہا تھا اور باوجود کوشش کے، باوجود نہ چاہنے کے وہ کہانی، وہ زندگی، بھنور بن کر اس کے وجود سے لپٹتی چلی گئی، جسے بھلانے کے لیے، جسے فراموش کرنے کے لیے وہ اتنی دور چلی آئی تھی۔

☆☆☆

ہاتھوں پہ دستانے چڑھا کر اس نے کیک اوون سے نکالا، ٹوتھ پک کی مدد سے چیک کیا وہ تیار تھا۔ گرما گرم کیک کی سوندھی سوندھی مہک چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اسے ٹھنڈا ہونے کے لیے ایک طرف رکھا اور اس پہ سجاوٹ کے لیے چیزیں تیار کرنے لگا۔

"خوشبو تو بڑی زبردست آ رہی ہے۔" عمیمہ نے منہ اوپر کر کے ہوا میں گہری سانس لی۔

"یہ صرف کیک کی خوشبو نہیں ہے۔" عمیر مسکرایا۔

"تو پھر؟" عمیمہ کی شرارتی لٹ ذرا آگے کو جھک آئی تھی۔

"اس میں محبت کی خوشبو بھی شامل ہے مادام!" عمیر نے ایپرن سے ہاتھ صاف کر کے اس کے آگے سر خم کیا۔

"ٹائی ٹینک آج بھی تمہاری فیورٹ ہے؟ تم اور تمہارے ڈائیلاگز؟"

"بالکل فیورٹ ہے اور خبردار جو میرے ڈائیلاگز پہ کوئی ڈائیلاگ بولا، میں ناراض ہونے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔" عمیر نے چاکلیٹ سیرپ کو کیک پہ انڈیلا۔

"تم خود کو جیک سمجھتے ہو مگر ہو نہیں۔" عمیمہ کی شوخ زبان بے قابو ہوئی۔

"آئی ایم، مائی ڈیئر روز.....!" عمیر نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا اور چاکلیٹ کا پھول بنانے لگا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" عمیمہ کو دفعتاً یاد آیا۔

"میرے ہاتھ کا بنا کیک کھانے کے لیے تم نے یقیناً دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہوگا؟" عمیر کی مسکراہٹ ہی جان لیوا تھی۔

"خود کو لی ہو پنز نہ سمجھا کرو۔"

"وہ نہیں ہوں مگر اس سے کم بھی نہیں ہوں، ڈنر

کے بعد تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔'' عمیر نے چاکلیٹ سے بنا گلاب کا پھول کیک پہ سجایا اور کون شیپ میں کریم بھرنے لگا۔

''سال میں چند بار تم کوکنگ کرتے ہو ان میں ایک دن میری برتھ ڈے کا ہوتا ہے اور تم سوچتے ہو کہ دنیا کے سب سے بڑے شیف بن گئے ہو؟'' عمیمہ مسلسل بول رہی تھی عادت کے مطابق۔

''انسان وہی ہوتا ہے جو وہ سوچتا ہے۔'' عمیر نے فلسفے کا سہارا لیا وہ بڑی مہارت سے کیک پہ عمیمہ کے لیے ہیپی برتھ ڈے لکھ رہا تھا۔

''آف کورس، اگر انسان سوچے کہ وہ ایک سپرمین ہے تو وہ یقیناً بلڈنگز سے جمپ کر سکتا ہے، ہوا میں اڑ سکتا ہے اور.....''

''اور کسی لڑکی سے عشق بھی کر سکتا ہے۔'' عمیر نے کیک کا جائزہ لیتے ہوئے لقمہ دیا۔

''عشق کرنے کے لیے سپرمین ہونا ضروری نہیں۔''

''صرف مین، ہونا ضروری ہے جو کہ میں ہوں۔'' وہ عمیمہ کے اچانک ہی اتنے قریب آ کر کھڑا ہوا تھا کہ عمیمہ کو دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیلنا پڑا۔

''انسان بنو۔''

''اور جب تم شرماتی ہو، کتنی کیوٹ لگتی ہو۔''

''شٹ اپ.....!''

''میرا دوست کہتا ہے، کسی خوب صورت لڑکی کی زبان سے شٹ اپ بھی بہت خوب صورت لگتا ہے۔'' عمیر نے کیک کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے بتایا۔

''تمہارا دوست بھی تمہاری طرح اسٹوپڈ ہے۔'' عمیمہ نے فیصلہ صادر کیا۔

''ہاں دوستی اور محبت کے معاملے میں میری قسمت ذرا.....'' عمیر نے بے چارہ سا منہ بنایا۔

''تم اور تمہاری قسمت.....'' عمیمہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

''اگر یہ کیک میری سالگرہ کا نہ ہوتا نا تو ابھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔''

''ایک تو اتنی محنت اور محبت سے میں نے تمہارے لیے کیک بنایا ڈنر تیار کیا اور تم.....'' عمیر نے افسوس سے سر ہلایا۔

''تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کچھ تو قدر کرتی میری۔''

''بہت شوق آ رہا ہے میری جگہ دوسری لڑکی کو دینے کا؟'' عمیمہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی، چہرے پہ برہمی تھی۔

''تم.....اف۔'' عمیر نے ایک گہری سانس لی۔

''اگرچہ ناراض ہو کر تم اور بھی حسین ہو جاتی ہو مگر پھر بھی، پھر بھی، آئی ایم سوری یار، مذاق میں بھی کسی اور کو تمہاری جگہ نہیں دے سکتا، نہیں کرنی چاہیے تھی مجھے ایسی بات، آئی ایم سوری اگین۔''

عمیر یکدم ہی سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سچائی بھی رقم تھی۔

☆☆☆

کہر آلود صبح جو شروع ہوتی تو مانو شام تک یہی عالم رہتا کہ دبیز دھند، بات کرنے کے لیے منہ کھولو تو الفاظ بعد میں نکلتے منہ سے بھاپ پہلے نکلتی۔

''اف ف.....!'' دستانوں کے اندر بھی ہاتھ یخ ہو رہے تھے، انگلیاں تھیں کہ لکڑیاں، عمیمہ نے جیکٹ کا کالر چھو کر دیکھا۔

''تمہیں کیا مزا آ رہا ہے یہاں؟'' عمیمہ نے جیکٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ گھسیڑے۔

''موسم اور تمہارا چہرہ، دونوں ہی مزا دے رہے ہیں۔'' عمیر کے چہرے پہ بڑی شوخ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''تھوڑی دیر اور یہاں بیٹھے رہے نا تو یہیں اسنیچو بن جاؤں گی۔'' عمیمہ کو شدت سے اپنے گھر کا آتش دان، جلتی ہوئی لکڑیاں اور نرم گرم ماحول یاد آ رہا تھا مگر عمیر اس خون جما دینے والے سرد موسم کو باہر انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ عمیمہ کے ساتھ، آئس کریم کھاتے ہوئے اور عمیمہ نے تو یہ سنتے ہی کانوں کو

pklibrary.com

ہاتھ لگا لیے۔
"کس قدر بورنگ ہوتی جا رہی ہو تم۔" عمیر نے اسے گھورا۔
"تو؟ تمہاری طرح ایڈونچرس ہو جاؤں اور ڈبل نمونیے کا شکار بن کر ہاسپٹل پہنچ جاؤں؟" عمیمہ نے چمک کر جواب دیا۔
"اتنی معمولی سی سردی اور ذرا سی آئس کریم سے کچھ نہیں ہوتا۔" عمیر کا اطمینان قابل دید تھا۔
"واقعی؟" عمیمہ نے اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔ "ویسے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تبھی تم ٹھنڈ میں میری آئس کریم بنا رہے ہو۔"
"بے وقوف لڑکی! یہ وقت یاد آئے گا۔ یہ یادگار لمحے اس وقت یاد کرنا جب ہم ایک روٹین لائف گزارتے ہوئے ایک بورنگ کپل بن جائیں گے۔" عمیر نے مستقبل کی ایک ممکنہ تصویر کھینچی۔
"کیا ایسا بھی ہوگا؟"
"ہو بھی سکتا ہے۔" عمیر نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔
"ڈرا رہے ہو؟"
"بالکل، مگر تمہارے چہرے پہ تو خوف کے کوئی آثار نہیں۔" عمیر کا قہقہہ جان دار تھا۔ عمیمہ پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پہ خفگی کے آثار تو تھے مگر اطمینان بھی تھا کہ اس کی ناراضی کی پروا کرنے والا، اسے منانے والا، اس سے محبت کرنے والا، یہ شخص جو ہمیشہ اس کے اعتماد پہ پورا اترا ہے اس کی دنیا میں اس کے آس پاس موجود ہے اسے کیا معلوم تھا کہ۔
"کل تمہاری جاب کا پہلا دن ہے۔" عمیمہ نے اسے یاد دلایا۔
"تب ہی تو یہاں تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں، یہ فرصتیں پھر کہاں ملیں گی۔"
"کیوں نہیں، انسان جس کے لیے وقت نکالنا چاہے نکال سکتا ہے۔"
"میرا تو سارا وقت پوری زندگی ہی تمہارے لیے ہے۔" عمیر نے ڈائیلاگ مارا۔
"تمہارا بار بار اظہار بہت اچھا لگتا ہے مگر پلیز ٹائی ٹینک سے باہر نکل آؤ۔"
"اچھا چلو نکل آیا اب؟" عمیر نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پہ باندھ لیے۔
"کبھی سیریس ہو کر بھی بات کر لیا کرو۔"
"سیریس ہو کر تو صرف میں پاپا سے بات کرتا ہوں۔ کل میں نے بڑا سیریس قسم کا مذاق بنا کر پاپا سے کہا تھا کہ اب تو میرے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کر لیں اب تو کمانے لائق ہو گیا ہوں۔ سر پر سہرا سجائیں میرے اور بہو گھر لے آئیں مگر پتا نہیں کیوں میں جتنا سیریس ہو کر بات کرتا ہوں پاپا اتنا ہی زور دار قہقہہ لگاتے ہیں۔ اب دیکھو ذرا کل تبھی میری بات پر خوب ہنسے پھر کہنے لگے۔ بہو کی پڑھائی مکمل ہونے دو، پھر اسے گھر لائیں گے۔ بیٹے کے ارمانوں کی کوئی فکر نہیں، بہو کی ڈگری کا خیال ہے بس۔"
عمیر نان اسٹاپ بولتا ہی چلا گیا، عمیمہ کی ہنسی نقرئی سکے بن کر اس کے آس پاس بکھرتی رہی۔
"تمہیں معلوم نہیں ہے کہ جب تک میرا فائنل نہیں ہو جاتا۔ شادی کا نام لینا بھی منع ہے؟" عمیمہ نے ہنستی ہوئی نگاہ اس دیوانے پر ڈالی۔
"چھ ماہ باقی ہیں۔ کچھ معلوم بھی ہے چھ مہینوں میں کتنے ہفتے کتنے دن، کتنے گھنٹے، کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈز ہوتے ہیں؟" عمیر نے سوال کیا۔
"میرا تھیسس شروع سے ہی بہت خراب ہے۔" عمیمہ نے اسے اطلاع دی۔
"تمہاری نظریں بھی بہت خراب ہیں۔ تمہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ نہ میرا انتظار، نہ پیار نہ....."
"مجھے سب نظر آتا ہے عمو! لیکن ڈگری بھی ضروری ہے نا، مجھے معلوم ہے کہ میں شادی کے بعد بھی پڑھ سکتی ہوں۔ تم سب مجھے سپورٹ کرو گے مگر شادی کے بعد پڑھنے کو کس کا دل چاہے گا؟ اس لیے تھوڑا انتظار اور کر لو۔" عمیمہ نے اسے پیار سے سمجھایا۔

pklibrary.com

"گھر پر پاپا لیکچر دیتے رہتے ہیں۔ گھر سے باہر تم — اف میں بے چارہ کہاں جاؤں۔" عمیر کا چہرہ اتنا بے چارہ ہوگیا تھا کہ عمیمہ کی بے اختیار ہنسی پھوار بن کر دونوں کو بھگوتی چلی گئی۔

☆☆☆

لیپ ٹاپ سے نگاہیں ہٹا کر اس نے اپنی پشت کرسی سے ٹکائی اور اپنی انگلی اور انگوٹھے سے بند آنکھوں کے پپوٹے سہلانے لگی۔

"یہ لو، فٹافٹ پیو اسے، ایگزامز کے دوران تو تمہیں نہ کھانے پینے کا کچھ ہوش رہتا ہے نہ اپنا۔" مما نے گرم دودھ کا گلاس میز پر رکھا۔

"شکل دیکھو ذرا اپنی، کتنا ذرا سا منہ نکل آیا ہے۔"

ہر بار اس کے امتحانات کے دنوں میں مما اسی طرح فکر مند ہوکر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھیں اور اس کے کھانے پینے کا خیال بھی کہ وہ تو بس پیپر کے سوائے باقی سب کچھ بھول جاتی تھی یہاں تک کہ کھانا پینا بھی۔

"تھینکس مما!" عمیمہ نے سیدھے ہوکر آنکھیں کھول دیں اور مسکرادی۔

"پورا گلاس ختم کرنا!" وہ تاکید کرتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

عمیمہ نے جی کڑا کے گلاس اٹھایا اور فٹافٹ اسے — خالی کردیا۔

"اور تمہیں کتنے دن ہوگئے مجھ سے بات کیے ہوئے؟ اچھی جاب لگی ہے تمہاری، ہمیں بھی بھول گئے؟" عمیمہ نے عمیر کو کال کرکے شکوہ کیا۔

"تمہارے ایگزامز ہورہے ہیں اس لیے ڈسٹرب نہیں کیا۔ پھر میں بھی بزی تھا۔" عمیر کی آواز سنجیدگی لیے ہوئے تھی۔

"ایگزیم ختم ہونے والے ہیں۔" عمیمہ نے اسے اطلاع دی۔

"ہاں تو اس کے بعد ملتے ہیں نا۔" عمیر شاید جلدی میں تھا ورنہ اتنی مختصر بات تو کرنے کا وہ قائل نہیں تھا۔

"کچھ کررہے تھے؟ کیا میں نے ڈسٹرب کردیا؟" عمیمہ بجھ سی گئی۔

"تھکا ہوا ہوں۔ نیند پوری نہیں ہورہی۔" عمیر کا جواب اب بھی مختصر تھا۔

"اچھا تو پھر تم ریسٹ کرو۔"

"میں بعد میں کال کرتا ہوں تمہیں۔ لیک ہے۔" عمیر نے اس کی آواز سے جھلکتی مایوسی محسوس کی تو اس کی دل جوئی کی سعی کی۔

کال ختم ہوگئی تھی عمیمہ کچھ دیر یونہی بیٹھی جانے کیا سوچتی رہی پھر یکدم ہی سر جھٹک کر سارے خیالات ایک طرف کرکے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

اللہ اللہ کرکے ایگزلم کا بوجھ سر سے اترا، آخری روز خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کرکے وہ جھوم ہی اٹھی اور جھوم اٹھنے کی وجہ — صرف یہی نہیں تھی کہ امتحان ختم ہوگئے تھے بلکہ اس سرخوشی کی اصل وجہ یہی تھی کہ ہجر کی طویل شب ختم ہونے کو تھی۔ انتظار کا موسم، وصل میں ڈھلنے کو تھا۔

زبانی کلامی تو کئی ماہ پہلے ہی طے ہوگیا تھا کہ عمیمہ کے امتحان کے دو ماہ بعد شادی فکس ہے۔ اب بس تاریخ انعقاد اور رسمی کارروائی باقی تھی مگر عمیمہ نے ایک نیا بلکہ پرانا شوشا چھوڑ دیا تھا جس کی شکایت وہ پہلے بھی کئی بار کرچکی تھی۔

"دیکھو، اتنی کنجوسی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایسے نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔ شادی بعد میں ہوگی پہلے انگیج منٹ ہوگی، مجھے رنگ چاہیے۔" وہ بچوں کی طرح عمیر سے جھگڑ رہی تھی۔

"ہاں بھئی، مومو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ایک لڑکی کو قید کرنے کے لیے انگیج منٹ رنگ سے بہتر کوئی زنجیر نہیں۔" انکل نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"عمو! تم ایسا کرو، مومو کو اس کی پسند کی رنگ دلا دلاؤ، ڈیٹ فکس ہوگی تو اسی میں رنگ بھی پہنا دینا۔ لڑکیوں کے بڑے ارمان ہوتے ہیں بھئی۔"

"صرف لڑکیوں کے؟" عمیر نے سوال اٹھایا۔

"کیوں نہیں بھئی۔ لڑکے اس دوڑ میں کہاں پیچھے ہیں میرے بیٹے کے ارمان ہی دیکھ لو۔ ٹیمز کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک تو ہوں گے یا شاید اس سے بھی زیادہ ہوں۔" انکل کے چہرے پر ویسا ہی شرارتی تبسم تھا۔ جیسی شرارتی چمک ان کی ہونے والی بہو اور بھانجی کی آنکھوں میں تھی۔

"آپ دونوں مل کر میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟ عمیر نے شوخی دکھانے کی کوشش کی مگر نہ جانے کیوں اس کی مسکراہٹ پھیکی پھیکی سی تھی۔

"مذاق کر رہے ہیں۔ اڑا نہیں رہے۔" عمیمہ نے تصحیح کرتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔

"ویسے تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟ بے فکر رہو زیادہ مہنگی رنگ نہیں لوں گی۔"

وہ کھلکھلائی۔ اب تو بات بے بات ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اپنی ہنسی کی بارش میں بھیگتے ہوئے اس نے عمیر کو دیکھا ہی نہیں جس کے چہرے پہ ایک عجیب سی دھند چھا رہی تھی جیسے بے بسی کی دھند، بے چارگی کی دھند اور عمیمہ کی ہنسی نے دور تک اور دیر تک اس کا پیچھا کیا مگر دھند تھی کہ چھٹنے کے بجائے دبیز ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

شفاف شیشوں کے پار بھی زیورات کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک کتنی ہی انگوٹھیاں دیکھ چکی تھی۔ مگر ابھی تک کسی پر بھی حتمی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ ساری ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔

"اف کیا کروں۔ سب ہی اچھی لگ رہی ہیں۔" عمیمہ نے مدد طلب نگاہوں سے عمیر کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے ایک نازک سی انگوٹھی پر اس کی نظر پڑی۔

"بس یہی ٹھیک ہے؟" عمیمہ نے اسے پہن کر ہاتھ کا جائزہ لیا۔ مخروطی سپید انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی دمک رہی تھی۔

"دیکھو!" عمیمہ نے ہاتھ اس کے آگے کیا۔

"مجھے محبت ہوگئی ہے۔" عمیر کی بڑبڑاہٹ سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی بس۔

"افوہ عمو، تم کبھی بھی، کہیں بھی شروع ہو جاتے ہو؟"

عمیمہ نے ٹھٹک کر اسے دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گئی۔ یہ آنکھیں وہ نہیں تھیں جنہیں دیکھنے کی وہ عادی تھی یہ تو کوئی اجنبی سی نگاہیں تھیں جو اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے سوزین سے محبت ہوگئی ہے۔" عمیر یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" عمیمہ کی آنکھیں بے یقین تھیں اور لہجہ بھی، میکانکی انداز میں اس نے انگلی میں پہنی انگوٹھی اتاری تھی۔

"تم باہر چلو۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

"تم کوئی پرانک (عملی مذاق) کر رہے ہو۔" عمیر کے ہمراہ چلتی ہوئی وہ باہر آگئی تھی۔ جہاں سڑک پر ٹریفک کا سیلاب بہہ رہا تھا۔

"وہ میری کولیگ ہے۔ میں نہیں جانتا، کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ میں بہت الجھن میں تھا بہت زیادہ پریشان اور ابھی جس وقت تم نے وہ رنگ اپنی انگلی میں پہنی، مجھے شدت سے احساس ہوا کہ جو کچھ بھی ہماری زندگی میں ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے وہ غلط ہے۔ مجھے معلوم ہے معذرت کے چند الفاظ کافی نہیں ہوں گے مگر..... مجھے اس کے سوا نہ کچھ دکھائی دیتا ہے نہ کچھ سجھائی دیتا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دو مومو! میں جانتا ہوں تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے اور ہوگی مگر یقین کرو اگر یہ شادی ہوئی تو تمہارے لیے، میرے لیے، ہم دونوں کے لیے بہت برا ہوگا۔" عمیر کی باتیں کچھ بے ربط تھیں مگر عمیمہ کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ اور اب اس کے خیالات بلکہ زندگی بے ربط ہونے والی تھی۔

☆☆☆

pklibrary.com

کھڑکی کی محراب سے سامنے افق کی سرخی دکھائی دے رہی تھی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے بہت اہتمام کے ساتھ آسمانوں کے کناروں پر خوب صورت رنگ بکھیر رہا تھا۔ ان رنگوں کو دیکھتے ہوئے عمیمہ نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ کی تیسری انگلی کو دوسرے ہاتھ سے چھوا، چند لمحوں کا لمس، ایک انگوٹھی کا لمس اب تک تر و تازہ موجود تھا۔

"کبھی ایسے ہی رنگ، ایسی شفق میرے چہرے پر بھی اتری تھی۔

اس سے زیادہ خوب صورت اور حسین رنگ میری زندگی میں پھیلے ہوئے تھے۔"

گردن گھما کر اس نے شیراز کو مخاطب کیا۔ اور وہ جو پچھلے ایک گھنٹے سے اسے سن رہا تھا۔ فقط ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"کئی ہفتوں تک میں یہ سوچتی رہی کہ یہ کیا ہو گیا! اور بہت عرصے بعد میں نے سوچا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ اور مجھے اس سوال کا جواب یہاں آ کر ملا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ کہانیاں اور واقعات سفر کر کے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک کہانی مشرق سے سفر کر کے مغرب پہنچ گئی۔"

"تمہارے ساتھ ہونے والا سانحہ تمہیں فہم ادراک دے گیا۔" شیراز نے تبصرہ کیا۔

"ہاں شاید۔" عمیمہ نے کھڑکی کی منڈیر جیسے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ "ایک خواب جو پورا نہ ہوا۔ تو کیا ہوا۔ کسی خواب کے پورے نہ ہونے سے کوئی قیامت تو نہیں آ جاتی۔" سوچتے سوچتے اس کے تصور میں اچانک ایک وجود لہرایا۔ عروسی جوڑا اور زیورات سے سجی دلہن۔ "اف، رانیہ آنٹی!" عمیمہ نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"اور کبھی کوئی خواب پورا نہ ہو تو قیامت آ بھی جاتی ہے۔" رانیہ کا خیال عمیمہ کے پہلے خیال کی نفی کرنے لگا۔

☆☆☆

شام اور رات میں عید کی رونق ذرا محسوس ہوئی کہ مہمانوں کی آمد نے بھرم رکھ لیا وگرنہ عمیمہ بہت مایوس اور اداس تھی۔

"یہاں کی روایتی عید، رونق، شور شرابا، ہلا گلا، گہما گہمی، اس پوش علاقے میں ذرا کم ہی نظر آئے گی۔ گھروں کے اندر پارٹیز ہوں گی مگر باہر خاموشی، سناٹا۔" شانو نے عمیمہ کے سوال کا جواب دیا۔

تایا ابو نے رات میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا خاندان کے سب لوگ مدعو تھے۔ بڑا سارا لان روشنیوں اور رنگوں سے جگمگا رہا تھا۔ خوش باش لوگ۔ پررونق چہرے، ہنستے کھلکھلاتے وجود، ٹولیاں بنا کر سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ عمیمہ سب سے علیک سلیک کر کے شانو کو ڈھونڈ رہی تھی۔ جو اچانک ہی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اندر کی جانب چلی تو چند رشتے دار خواتین کی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے جو گوسپس میں مگن تھیں اور موضوع گفتگو عمیمہ تھی۔

"اظہر بھائی کی بھتیجی کو دیکھا جو لندن سے آئی ہے۔ سنا ہے شادی ہونے والی تھی۔ عین وقت پر رشتہ ختم ہو گیا۔ اللہ جانے کیا بات ہو گی؟"

"ارے بات کیا ہو گی۔ یہیں کے لڑکے لڑکیاں دیکھ لو، آپے سے باہر ہو رہے ہیں باہر تو بالکل ہی کھلا ڈلا ماحول ہے۔"

"اظہر بھائی کو دیکھو، ہر سال نیا ڈیکوریشن، نیا انٹیریئر خوب ڈھرلے سے اوپر کی کمائی کھا رہے ہیں۔"

"ہاں تو اور کیا، خالی خولی سوکھی تنخواہ میں اتنے عیش کہاں ہوں گے۔" دوسری نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"ایسی بات نہیں ہے رشوت وغیرہ کی باتیں تو لوگوں نے یونہی اڑائی ہوئی ہیں۔ دراصل سستے زمانوں میں اظہر بھائی نے مکانات اور دکانیں وغیرہ خریدی تھیں۔ وہ سرمایہ کاری اب کام آ رہی ہے۔ تنخواہ سے زیادہ تو ماہانہ کرایہ آتا ہے ان کا۔" ایک دوسرے خاتون نے پہلی والی کی تردید کی۔ وہ اظہر کی

pklibrary.com

کزن تھیں اور اندرون خانہ سب حالات سے واقف تھیں۔

"ہاں مگر....."

عمیمہ مزید کچھ سنے بغیر باہر آ گئی۔

"ایک تو یہ عورتیں، انہیں دوسرے کے معاملات ڈسکس کرنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ اوپر سے یہ شانو کی بچی کہاں چلی گئی۔" عمیمہ کا موڈ خراب ہونے لگا۔

"ہیلو، کیسی ہیں آپ؟ مزاج کیوں برہم ہے؟" شیراز سامنے سے آ رہا تھا۔ عمیمہ کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔

"ویسی ہی ہوں جیسی آج شام میں تھی۔"

"یعنی کہ اداس؟" شیراز نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"پتا نہیں۔" عمیمہ نے کوفت سے سر جھٹکا۔ دراصل میری آج تک کی لائف میں عید کا دن ایسا کبھی نہیں گزرا اتنا خاموش، بغیر کسی ہلچل بغیر کسی ہنگامے کے۔"

"تمہیں عید کی رونق دیکھنی ہے؟"

"اب تو عید ختم ہوگئی، سارا دن تو گزر گیا، اوپر سے آج کے ہی دن ایسا انکشاف جس نے گزرتے وقت کو اور بھی بوجھل بنا دیا۔" عمیمہ نے دھیرے سے بولتے ہوئے اردگرد پھیلی رونق اور شور شرابے کو دیکھا۔

"عید تین دن تک ہوتی ہے اگر تمہیں عید کی اصل رونق اور چہل پہل دیکھنی ہے تو کل میرے ساتھ چلنا۔"

"کہاں؟"

"ایک تو تم سوال بہت کرتی ہو۔" شیراز نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"اور میرے سوالوں کے جوابات آپ ہی کے پاس کیوں ہوتے ہیں؟" عمیمہ کا ردعمل بے ساختہ تھا۔ شیراز جواب دیے بغیر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا کم از کم اس سوال کا جواب تو اس کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

اگلا دن بہت جلدی شروع ہوگیا تھا اس کا، شیراز نے نو بجے کا وقت دیا تھا اور نو بجنے میں پانچ منٹ پر وہ اس گھر کے پھاٹک پر تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" راستے میں اس نے پھر سوال کیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے زیادہ سوالات کرنے پر خضر بھی ساتھ نہیں دیتے چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔" شیراز نے سورہ کہف میں موجود تاریخی واقعے کا حوالہ دیا۔

"مگر آپ خضر نہیں ہیں۔"

"راہنما تو ہوں، تمہیں لے کر جا رہا ہوں۔"

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں، کہاں؟"

"ایک شے ہوتی ہے جسے سرپرائز کہتے ہیں۔" شیراز نے بڑی مہارت سے موڑ کاٹا۔

زندگی میں اتنا بڑا سرپرائز ملا ہے کہ اب کسی اور سرپرائز کی ہمت ہے نہ شوق۔" عمیمہ بڑی بہادری سے مسکرائی تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد گاڑی جس علاقے میں داخل ہوئی وہ شہر کی کوئی متوسط آبادی تھی۔ عید کا دوسرا دن تھا اور ایک بڑے سے میدان میں جھولے والے، اونٹ والے، گھوڑے والے تھے۔ بہت سارے ٹھیلے تھے جن پہ کھانے پینے کی مختلف اشیاء تھیں، ان کے علاوہ وہاں قابل ذکر اور نمایاں تعداد بچوں کی تھی۔ رنگ برنگے نئے کپڑے پہنے، تیار ہوئے۔ ہنستے کھیلتے، خوش و خرم بچے، عید کا دوسرا دن بھی بھرپور انجوائے کر رہے تھے۔

"اس پورے علاقے کے بچے یہیں آ گئے۔ اس گراؤنڈ میں؟" عمیمہ نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"علاقے کے نہیں، فقط دو چار محلوں کے بچے ہیں یہ۔" شیراز نے مسکراتے ہوئے ایک جگہ گاڑی پارک کی اور نیچے اتر آیا۔

لوہے کا نیلا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ شیراز نے کنڈی بجائی اور اندر داخل ہوگیا۔ پہلے صحن پھر کمرہ، جہاں دو

pklibrary.com

تخت بچھے تھے اور ایک بڑا صوفہ، ایک بڑے میاں نے اور بڑی بی نے ان کا استقبال کیا۔ چاندی بالوں والے، مہربان مشفق وجود، انہوں نے بڑی محبت سے دونوں کا استقبال کیا۔

''ماشاء اللہ بڑی لمبی عمر ہے تمہاری، ابھی ہم دونوں یہی ذکر کررہے تھے کہ شیراز آنے ہی والا ہوگا؟'' صاف رنگت والی دبلی پتلی سی بڑی بی نے مسکرا کر بتایا۔

وہ لوگ باتیں کررہے تھے جب اچانک ہی پانچ چھ بچے اندر چلے آئے۔ نووارد مہمان کو دیکھ کر ذرا جھجک گئے۔ شیراز سے تو وہ لوگ واقف تھے۔

''محلے کے بچے۔ اپنی عیدی تو کل لے چکے تھے۔ آج پھپھو عید ملنے آئی تھیں تو ان کے بچوں کو لے کر آئے تھے۔'' بڑے میاں نے ان سب بچوں کو عیدی دی وہ سب خوشی خوشی واپس چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد مختلف اشیائے خورونوش کی ٹرے بھر کے ایک خاتون آگئیں۔

''یہ رافعہ بھابھی ہیں۔ چچا کی بہو۔'' شیراز نے عمیمہ اور ان کا آپس میں تعارف کرایا۔

دو تین گھنٹے بیٹھ کر شیراز نے روانگی کا قصد کیا، مگر انہوں نے کھانا کھائے بغیر اٹھنے نہیں دیا۔ یہ دونوں میزبان شیراز کے چچا اور چچی تھے۔ گھر میں بیٹا اور بہو تھے۔ اکلوتا بیٹا تھا اور بے اولاد تھا۔ انہوں نے محلے کے سارے بچوں کو اپنی اولاد بنالیا۔

دونوں میاں بیوی خوش مزاج تھے۔ پرانے قصے کہانیاں گزرتی زندگی اتنے دلچسپ انداز میں سنارہے تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

کھانے پر رافعہ بھابھی کی بریانی کھا کر عمیمہ کو مزا آگیا۔ ان کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ میٹھے میں روایتی شیر خرما۔

تقریباً پانچ چھ گھنٹے وہاں گزار کر دونوں باہر نکلے تھے۔ گلی میں ہنگامہ مچا تھا۔ عورتوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں بنی ہوئی تھیں، آج کے دن کے دو تین گھنٹے خالصتاً ''لیڈیز ٹائم'' تھا۔

گلی میں اونٹ والے کو بلا کر اونٹ کی سواری کی جاتی اور ڈولی والا جھولا بھی اندر آجاتا۔ اس بہانے ساری خواتین اور لڑکیاں اپنے بچپن کو آواز دے لیتیں۔

''اونٹ پر بیٹھو گی؟'' شیراز کے پوچھنے پر وہ ہنس پڑی۔ اور تھوڑی دیر بعد جب وہ اس دلچسپ تفریح سے لطف اندوز ہوکر واپس آئی تو شیراز سے مخاطب ہوئی۔

''لندن جاکر اس تفریح کو بہت مس کروں گی؟''

''اونٹ سے بہتر اور کچھ نہیں ہے، مس کرنے کے لیے؟''

''مثلاً!؟'' عمیمہ نے چلتے چلتے سوال کیا۔

سوال کا جواب دیا جاتا ہے جواب میں سوال نہیں کیا جاتا۔

''میرے سوال کا جواب تو آپ نے بھی نہیں دیا۔ اونٹ سے بہتر اور کیا ہے یہاں مس کرنے کے لیے؟'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے عمیمہ نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

''یہ تو تمہیں واپس جاکر ہی علم ہوگا۔ بعض باتوں کا احساس قریب ہوکر نہیں۔ دور ہوکر ہوتا ہے۔'' شیراز ڈرائیو کرتے ہوئے واپسی کا راستہ طے کررہا تھا۔ مگر اندر ہی اندر وہ کہیں ایک سفر اور بھی کررہا تھا۔ وہ سفر جو ایک دل کا دوسرے دل تک ہوتا ہے۔

☆☆☆

گھر کا گیٹ شیراز نے ہی کھولا تھا۔ پھوپھی اماں اس کے مقابل صوفے پر بیٹھی اسے گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ عمیمہ کو الجھن ہونے لگی۔

''میں کل واپس جارہی ہوں لندن، آپ لوگوں سے ملنے آئی تھی۔'' عمیمہ نے پہلو بدلتے ہوئے وضاحت کی۔

''کوئی ضروری بھی نہیں تھا آنا، نہ ہمیں تمہارے آنے کی خوشی تھی نہ جانے کا غم۔'' پھوپھی

pklibrary.com

اماں نے جواب دیا۔
''کم از کم میرے ساتھ یہ بدمزاجی شاید ان کا حق ہے۔'' عمیمہ نے چپکے سے سوچا۔
''مجھے علم نہیں تھا کہ تم اکبر کی بیٹی ہو۔ ورنہ پہلے دن ہی گھر میں نہیں گھسنے دیتی۔'' وہ نخوت سے بولتی ہوئی کھڑی ہوگئیں۔
بوجھل قدموں سے واپس آئی تو بہت بجھی بجھی سی تھی۔

☆☆☆

ایک طویل سفر طے کرکے گھر واپس پہنچی تو تب بھی اس کے چہرے پر خوشی کے بجائے اداسی تھی۔ مما، پاپا اسے اداس دیکھ کر خود بھی افسردہ ہوگئے۔
''شاپنگ کرنے چلتے ہیں۔ پھر تمہاری فیورٹ آئس کریم کھائیں گے آج تو میں بھی آنکھیں بند کرکے چاکلیٹ فلیور کھالوں گا۔'' پاپا اسے بچوں کی طرح بہلا رہے تھے۔
''ٹھیک ہے؟'' وہ کچھ سوچ کر راضی ہوگئی۔
ایک قیمتی منک کوٹ اور کچھ جیولری اور پرفیوم خرید کر وہ آئس کریم کھا رہے تھے۔ عمیمہ خاموش کسی اڈھیر بن میں تھی۔ باپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آغاز کے لیے کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔
''میرا خیال تھا کہ پاکستان جاکر تم بہل جاؤ گی۔ مگر تم تو پہلے ہی کی طرح ڈسٹرب لگ رہی ہو۔'' باپ نے اسے غور سے دیکھا۔
''ایسی کوئی بات نہیں پاپا!'' ایک پھیکی سی ہنسی نے عمیمہ کے لبوں کو چھوا۔
''دیکھو بیٹا! ہم سمجھ سکتے ہیں۔ دل کا ٹوٹنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ مگر حادثے ہمیشہ غیر متوقع اور اچانک ہوتے ہیں تمہیں خود کو سنبھالنا ہی پڑے گا۔ کسی اور کے لیے نہیں بلکہ اپنے آپ کے لیے، اپنی آئندہ خوشیوں کے لیے، اپنے مستقبل کے لیے، ماضی کو بھولنے کی کوشش کرو اور آگے کی طرف دیکھو۔ اس خودغرض انسان کے لیے اپنی فیلنگز ضائع مت کرو۔ جب اس نے ایک کمٹ منٹ کرکے، وعدہ کرکے اتنی آسانی سے سب کچھ ختم کردیا تو تم بھی لعنت بھیجو اس پر۔'' افسوس سے بولتے بولتے ان کا لہجہ برہم ہوگیا۔
''اس میں خودغرضی کی کیا بات ہے پاپا۔ اس کو مجھ سے بہتر آپشن نظر آیا اس نے وہی اختیار کرلیا۔'' عمیمہ نے چمچہ بھر کے آئس کریم منہ میں رکھی، اس کا لہجہ ہموار اور پرسکون تھا۔
''تم اس کی طرف کی صفائی پیش کررہی ہو؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کمٹ منٹ اور وعدے کی کوئی اہمیت نہیں؟'' اکبر اپنی بیٹی کی بات سن کر حیران تھے۔''
''آپ کو لگتا ہے کہ کمٹ منٹ اور وعدے کی کوئی اہمیت ہوتی ہے؟''
''کیا مطلب؟'' بیٹی کے بدلتے لب و لہجے پر اکبر ٹھٹھک گئے۔
''رانیہ آنٹی سے آپ وعدہ کرکے آئے تھے واپس آنے کا۔ پھر کیوں نہیں گئے واپس؟''
''تمہیں کس نے بتایا یہ سب؟'' وہ آئس کریم کھانا بھول گئے۔ ان کی بے یقین نگاہیں عمیمہ پر گڑی تھیں۔
''میں ان کے گھر گئی تھی۔ رانیہ آنٹی سے ملی تھی مگر یہ سب انہوں نے نہیں بتایا مجھے کسی اور نے بتایا ہے جس لڑکی سے آپ کمٹ منٹ اور عہد کرکے آئے تھے۔ اس کا حال اب یہ ہے کہ اگر اب آپ بھی پانچ منٹ ان کے ساتھ بیٹھیں تو وہ پانچ بار یہ سوال کریں گی کہ آپ کون ہیں؟''
عمیمہ نے بھی اپنی آئس کریم پگھلنے دی۔ کسی انسان اور ایک دل کا پگھلنا اس سے زیادہ اہم تھا۔
''مجھے اس وقت جو ٹھیک لگا میں نے کیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی.....'' اکبر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ ان کی نگاہیں کسی مجرم کی طرح جھکی ہوئی تھیں جن میں شرمندگی بھی تھی اور ندامت بھی۔
''مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ آپ بھی اتنے۔'' وہ ایک لمحے کو رکی۔ ''اتنے خودغرض رہے ہوں گے۔''

pklibrary.com

دونوں باپ بیٹی کے درمیان کچھ دیر خاموشی کا پردہ حائل رہا۔

''آپ ایک آئیڈیل باپ ہیں مگر بطور انسان آپ میں اور عمیر میں کوئی خاص فرق نہیں۔''

عمیمہ کی صاف گوئی اکبر کو تکلیف پہنچا رہی تھی مگر ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

اپنی زندگی کو اور خود کو خیالات اور معاملات میں الجھانے کے بجائے عمیمہ نے خود کو مصروفیات میں گم کرلیا۔ جاب سے بہتر مصروفیت اور کیا ہوتی؟ صبح گھر سے نکل جاتی، سوچ سوچ کر خود کو دکھی کرنے کا وقت اب کم ہی میسر آتا تھا۔ کچھ وقت دوستوں کے ساتھ چیٹ میں صرف ہو جاتا۔

کئی ہفتوں بعد اس نے اپنی پرسنل گرومنگ پر بھی توجہ دی۔ اس کی وارڈ روب کلیکشن میں موسم اور فیشن کے ملبوسات، جوتے بیگز اور دیگر چھوٹی موٹی کئی چیزوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ اس ویک اینڈ پر ایک دوست کے گھر پارٹی تھی۔

بہت دنوں بعد وہ دل سے تیار ہوئی تھی اور خوش تھی۔ سفید سلک کا میکسی نما گاؤن جو اپنی بہترین تراش خراش اور ہلکی پھلکی ریشم کی کڑھائی کے ساتھ بہت خوب صورت اور نمایاں لگ رہا تھا۔ سفید موتیوں کے چھوٹے چھوٹے سے آویزے کانوں میں ڈالے اور اسی کی میچنگ کا بریسلیٹ کلائی میں ڈال کر اس نے اپنے ہاتھ کا جائزہ لیا اور بے اختیار ہی ہاتھ کی تیسری انگلی پر نظر گئی۔ اس نے چند لمحے اس خالی انگلی کو دیکھا اور ہونٹ بھینچ لیے۔

کمرے سے نکل کر وہ لاؤنج میں آئی تو ٹھٹھک گئی۔ مما کے ساتھ عمیر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہمیشہ کی طرح نک سک سے تیار وہ بہت فریش اور ہنڈسم لگ رہا تھا۔

''ہیلو مومو، کیسی ہو؟'' وہ یوں مسکرا کر پوچھ رہا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان پچھلے چھ ماہ، وہ مشکل اور اذیت کے چھ ماہ آئے ہی نہ ہوں۔

''مما!'' عمیمہ کی سوالیہ نگاہیں ماں کی طرف اٹھیں۔

''عمیر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''میرے پاس فالتو باتوں کا وقت نہیں ہے۔''

عمیمہ نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ اشتعال کی جو لہر اس کے اندر اٹھی تھی وہ ابھی تک وہیں کہیں موجزن تھی۔

''مومو! میری بات سنو، مجھے معلوم ہے تمہیں مجھ پر بہت غصہ آرہا ہے۔ بہت ناراض ہو تم، مگر صرف دس منٹ کے لیے میری بات سن لو پلیز۔''

''میں اس وقت پارٹی میں جارہی ہوں۔''

عمیمہ نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔

''ہم ساتھ بھی تو چل سکتے ہیں۔ راستے میں بات کرلیں گے۔'' عمیر اس کی طرف بڑھا۔

''عمیر پلیز۔'' عمیمہ کے لہجے میں اتنی سرد مہری تھی کہ وہ وہیں ٹھٹھک گیا۔

راستے بھر وہ اپنے اشتعال پر قابو پا کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

سارہ کے گھر پہنچی تو اندر داخل ہوتے ہوئے ایک دلکش مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔

ابھی بہت کم مہمان آئے تھے۔ عمیمہ ہی جلدی آگئی تھی۔ وہ سارہ سے مل کر بیلا کی طرف بڑھی۔

''کیسی ہو تم؟ کہاں تھیں؟'' عمیمہ اس کی جانب بڑھی۔

''یہیں ہوں اور مزے میں ہوں؟'' بیلا نے کندھے اچکائے۔

''شادی ہے نا تمہاری اکتوبر میں؟''

''کینسل ہوگئی، بریک اپ ہوگیا ہمارا۔'' بیلا کے لہجے میں اتنی لاپروائی تھی کہ عمیمہ حیران رہ گئی۔

''تمہیں افسوس نہیں ہوا؟'' تم دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔''

''شادی کے بعد چھوڑ دیتا تو افسوس ہوتا۔ اچھا ہوا یہ سب پہلے ہی ہوگیا۔'' بیلا نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

pklibrary.com

"اب تم خوش ہو؟ عمیمہ نے اسے غور سے دیکھا۔"

"ناخوش بھی نہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے ایک ایسے انسان کے لیے آنسو بہاتی رہوں جسے میری کوئی پروا نہیں۔"

"اور اگر وہ دوبارہ تمہاری زندگی میں آ گیا تو؟" عمیمہ کو اچانک ہی کچھ خیال آیا۔

"پھر؟ دیکھا جائے گا۔" بیلا نے پھر حسب عادت کندھے اچکائے۔

"جو ایک بار چھوڑ کے جا چکا ہو اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟"

"غلطی کرنے والے کو ایک آدھ چانس تو دینا ہی پڑتا ہے اگر وہ نادم ہو تو۔" بیلا جواب دیتے ہوئے چل دی اور آنے والے مہمانوں سے ملنے لگی۔

سب کے ساتھ ہنستے بولتے ہوئے۔ کھاتے پیتے ہوئے۔ عمیمہ نے اپنی اندرونی کشمکش بڑی کامیابی سے چھپائی ہوئی تھی۔

واپسی پر وہ پارکنگ میں آئی تو ٹھٹھک گئی۔ عمیر اپنی کار سے ٹیک لگائے سامنے ہی کھڑا تھا۔

"اف....." وہ کراہ کر رہ گئی۔ "اب کیا ہے؟"

"اگر تم آتے ہوئے دس منٹ میری بات سن لیتیں تو مجھے تین گھنٹے یہاں انتظار نہیں کرنا پڑتا۔"

"کہو! کیا بات ہے؟"

"بس اتنی سی بات ہے کہ تم سے دور رہ کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میری زندگی میں تمہارے بغیر کوئی خوشی نہیں ہے۔"

"کیا اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ تم اس کے معیار پر یا توقعات پر پورے نہیں اترے۔" عمیمہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ میں نے خود اسے چھوڑا ہے جب مجھے محسوس ہوا کہ تمہارے بغیر میں کتنا ادھورا ہوں۔"

"اس طرح کے فلمی ڈائیلاگ بولنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟ پہلے جیسا؟ پہلے کی طرح؟"

"میرے جذبات کی توہین مت کرو، یہ فلمی ڈائیلاگ نہیں ہیں۔" عمیر نے احتجاج کیا۔

"پہلے تمہیں مجھ سے محبت تھی ہماری شادی ہونے والی تھی۔ پھر تین، چار ماہ کی جاب میں تمہیں اچانک محسوس ہوا کہ تمہیں سوزین سے پیار ہو گیا ہے۔ تم سب کچھ ختم کر کے اس کی طرف چلے گئے پھر تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ دراصل تمہارا اصلی اور سچا پیار میں ہی ہوں تو تم اس لڑکی کو چھوڑ کر میری طرف پلٹ آتے ہو۔ اور سوچتے ہو کہ تمہاری شرمندگی اور محبت کے اظہار پر میں کسی فلمی ہیروئن کی طرح پگھل کر تمہارے آگے ڈھیر ہو جاؤں گی۔" عمیمہ نے بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"عمیر! زندگی ایک گھنٹے کا ڈرامہ یا تین گھنٹے کی فلم نہیں ہوتی، نہ ہی چند سو صفحات پر مشتمل کوئی ناول، جس کے آخر میں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے، ہیپی اینڈنگ؟"

"تمہاری بھی تو فیلنگز تھیں کچھ؟ کیا وہ بھی اتنی جلدی ختم ہو گئیں۔" عمیر نے سوال کیا۔

"میرا بھروسا ختم ہو گیا ہے۔ اعتبار اٹھ گیا ہے۔" عمیمہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی اور اسے اسٹارٹ کرنے لگی۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا مگر وہ حسب معمول علی الصبح ہی اٹھ گئی تھی۔ کھڑکی کا پردہ کھول کر اس نے باہر دیکھا۔ لندن کی روایتی کہر آلود صبح، اس کی زندگی کی طرح، چند قدم سے آگے کچھ دیکھنا محال تھا۔ اس نے پردہ دوبارہ تان دیا۔

جیکٹ کی زپ بند کر کے ہڈ سر پر ڈال کر وہ باہر نکل آئی۔ دھند نے۔ اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ ساتھ عمیر نے بھی۔

"ہیلو!" عمیر اس کے ہمقدم چل رہا تھا۔

"اوہ ناٹ اگین۔" وہ کراہ کر رہ گئی۔

"کتنے فون کر چکا ہوں تمہیں، کال ریسیو کرتی ہو نہ گھر پر ملتی ہو۔ اور میں کیا کرتا؟"

"کیوں کر رہے ہو یہ سب؟ کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

محبت کے لیے کر رہا ہوں یہ سب، وہ محبت جو ہمارے درمیان تھی۔ اسے تم کیسے فراموش کر سکتی ہو؟"

"محبت سوائے تکلیف اور دکھ کے اور کچھ نہیں۔" عمیر بڑبڑائی، اس کے تصور میں رانیہ کا چہرہ ابھر آیا۔

"تم اتنی سخت اور کٹھور دل تو کبھی نہیں تھیں۔" عمیر اس کی بڑبڑاہٹ سنے اور سمجھے بغیر بول رہا تھا۔

"جو کچھ پہلے تھا وہ اب نہیں ہے۔ اور جو پہلے نہیں تھا۔ وہ اب ہے۔"

عمیمہ جاگنگ کرتے ہوئے شاہ بلوط کے گھنے درختوں کے عقب میں کہیں غائب ہوگئی تھی۔ عمیر وہیں کھڑا بے بسی سے اسے دور جاتا دیکھ رہا تھا۔

شاہ بلوط کی قدیم آنکھیں جو صدیوں سے یہ مناظر دیکھ رہی تھیں۔ خاموشی سے مسکرا دیں۔

☆☆☆

ڈنر ٹیبل پر رائمہ ہی ہمیشہ کی طرح چہک رہی تھی۔ خلاف معمول عمیمہ ذرا خاموش تھی۔ مما پاپا بھی کچھ سنجیدہ تھے۔

"رائمہ! آپ کافی بنالو بیٹا۔" مام نے کھانے کے بعد رائمہ سے کہا۔

"جی مما!" وہ پلیٹیں اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

"پھر تم نے کیا سوچا مومو، اب تو بھائی صاحب اور بھابھی آکر بات کر گئے ہیں۔ عمیر اپنی حرکت پر بہت شرمندہ ہے۔ کتنی بار تم سے بلکہ ہم سب سے معذرت کر چکا ہے۔ کچھ تو لچک دکھاؤ۔" مما نے ایک بار پھر عمیمہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"مما! مجھے تھوڑا وقت دیں۔ میں سوچ کر جواب دوں گی۔" عمیمہ نے رسان سے انہیں جواب دیا۔

"اور کتنا وقت چاہیے بیٹا۔ کتنے دنوں سے وہ بے چارہ تمہیں منانے کی کوشش کر رہا ہے۔" مما نے بھتیجے کی حمایت کی جسے وہ صبح کا بھولا قرار دے چکی تھیں۔

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ میں سچ مچ اس کی محبت ہوں یا محض ایک آپشن؟ تھوڑا انتظار کرنے دیجیے اسے۔" عمیمہ نے کھڑے ہو کر کرسی پیچھے کھسکائی۔

☆☆☆

اپنے لیے شرٹس اور ٹائیاں منتخب کرتے ہوئے اکبر منگر تھے وہ اپنی ساری توجہ ان ملبوسات پر مرکوز رکھنا چاہ رہے تھے جنہیں خریدنا تھا مگر دھیان بھٹک بھٹک کر بیٹی کی طرف جا رہا تھا۔ جس نے اپنے فیصلے سے والدین کو آگاہ کر دیا تھا اور عمیمہ کے اس فیصلے سے اگرچہ وہ بہت زیادہ مطمئن اور خوش نہیں تھے مگر بیٹی کی مرضی اور رائے ان کے لیے اہم تھی۔

"ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو، عمیر دیکھا بھالا ہے اور اپنے کیے پر نادم بھی ہے۔"

"اسے دیکھ بھال کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے اور ویسے بھی اس فیصلے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور آپ جانتے ہیں۔" عمیمہ نے باپ کی جانب دیکھا۔

"مجھے سزا دے رہی ہو یا خود کو؟"

"کسی کو نہیں پاپا نہ آپ کو سزا دے رہی ہوں نہ خود کو، بس تلافی کی کوشش کر رہی ہوں۔"

براؤن رنگ کی ایک سوبر سی ٹائی اٹھاتے وقت بھی ان کے ذہن میں یہی سب باتیں گھوم رہی تھیں اور عین اسی وقت انہیں عمیر کی آواز سنائی دی۔

"ایک منٹ صبر کرو بے بی۔ میں اپنے لیے شرٹس لے لوں پھر لیڈیز سیکشن کی طرف چلتے ہیں۔"

عمیر ان کے قریب آکر ہیلو ہائے کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے خفیف سے آثار تھے۔ سوزین تعارف کے مراحل سے گزر کر لیڈیز سیکشن کی جانب چلی گئی۔

اکبر، عمیر کی طرف متوجہ ہوئے کہاں تو وہ دن رات عمیمہ کے پیچھے چکر لگا رہا تھا اور کہاں اب سوزین کے ساتھ؟

pklibrary.com

"تو عمیمہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تم نے فیصلہ کرلیا؟"

"دو مہینے ہو گئے ہیں انکل! عمیمہ سے جب بھی کچھ کہتا ہوں وہ کہتی ہے۔ ویٹ کرو؟ یہ رومیو جولیٹ کا نہیں واٹس ایپ کا دور ہے۔ اتنے دن کون انتظار کرتا ہے؟"

"سوزین سے جھگڑا ہو گیا تھا تمہارا؟ تب ہی تم عمیمہ کی طرف آئے؟" اکبر بچے نہیں تھے پل بھر میں معاملہ سمجھ گئے۔

"آپ خود سوچیں انکل! میں اور کیا کرتا؟ جس وقت جو آپشن مجھے ٹھیک لگا میں نے ایڈاپٹ کرلیا۔" عمیر نے کندھے اچکائے۔

"اگر مومو مجھے یس کہہ دیتی تو میرا پہلا آپشن وہ ہی تھی۔"

"تو مومو نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ عمیر کے لیے محبت نہیں بلکہ محض ایک آپشن ہے۔" لیڈیز سیکشن کی طرف جاتے عمیر کو دیکھ کر انہوں نے سوچا اور ساتھ ہی ساتھ وہ سوچ رہے تھے کہ عمیمہ کا فیصلہ درست ہی ہے۔

اور خدا کرے کہ اس نے نیک نیتی کے ساتھ جو کچھ چنا ہے اس میں اس کے لیے خوشیاں ہوں۔ خدایا میری خود غرضی کی سزا میری بیٹی کو نہ دینا۔ ان کے ندامت بھرے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔

☆☆☆

کھلے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر الفاظ چمک رہے تھے ان لفظوں کو وہ کئی بار پڑھ چکی تھی۔ ایک ایک لفظ حفظ ہو گیا تھا اور اب ایک بار پھر اس کی نگاہیں اسکرین پر پھسل رہی تھیں۔

"اچھی لڑکی۔"

"خوش رہو، ایک پرانی بات سے آگاہ کرتا ہوں۔ جب میں نو عمر تھا۔ نانی جان سے جو کہانی سنی اور جو حال رانیہ خالہ کا دیکھتا تھا تو مجھے اس انسان پر بہت غصہ آتا تھا۔ اتنا شدید غصہ کہ میں عجیب و غریب یا فلمی قسم کے انتقامی منصوبے بناتا تھا۔

ایک بار میں نے پلان کیا کہ اس شخص کی بیٹی کو اپنے جھوٹے پیار کے جال میں پھنسا کر اسے بھی دھوکا دوں اور زندہ درگور کردوں۔ مگر جب تم ملیں تو اتنا شعور آ گیا تھا کہ معاف کرنا، انتقام لینے سے بہتر ہے اور یہ کہ ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمے دار ہے۔ والدین کے گناہ کا کفارہ اولاد کے ذمے نہیں ہے۔ اور جہاں تک محبت کا معاملہ ہے تو بس یہ سمجھ لو کہ شکاری خود شکار ہو گیا۔

تمہاری آنکھوں میں میں نے بارہا تاسف کے رنگ دیکھے جب تم خالہ کو دیکھتی تھیں اور تم نے کئی بار کہا۔ "کاش میں ان کے لیے کچھ کرسکتی، تمہارے ان ہی لفظوں نے اور حساس دل نے مجھے یہ بات کہنے کا حوصلہ بخشا ہے جو میں آگے کہنے جارہا ہوں۔

رانیہ خالہ کو کینسر کی تشخیص ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کا مرض اس اسٹیج پر ہے کہ وہ ڈیڑھ دو سال بھی زندہ رہ گئیں تو معجزہ ہوگا۔ نانی اس بار یہ صدمہ نہ جھیل سکیں۔ انہیں دنیا سے گزرے دو ہفتے ہونے کو آئے۔

میں خالہ کو اکیلے نہیں سنبھال سکتا۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جو ان کے لیے ہمدردی اور خلوص کے جذبات رکھتی ہو اور جسے میرا گھر بہت پسند ہو اور جو بے پناہ چاہے جانے کے قابل ہو۔ ایسی لڑکی، ایسی ساتھی اس پوری دنیا میں، سوائے تمہارے اور کوئی نہیں۔

تمہارے جواب کا منتظر

شیراز!"

عمیمہ اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ الفاظ چاہے کاغذ پر ہوں زبان پر یا مشینی اسکرین پہ اگر وہ سچے ہوں اور دل سے نکلے ہوں تو خود کو منوا لیتے ہیں اور سننے والے کو منا لیتے ہیں۔

عمیمہ کا دل مان گیا تھا۔ لہٰذا وہ خود بھی مان گئی۔ اس کے حساس دل نے محبت کے ساتھ تلافی کا راستہ چنا تھا اور وہ اس پر مطمئن تھی۔

☆

حمیرا شفیع

ہم، تم اور چاند

pklibrary.com

"آپا... آپ بھائیں اسے کہ شادی بیاہ کوئی ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ ہر قسم کے حالات میں ایک گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہوتا بلکہ دو افراد کے مابین دوسرے کا ساتھ نبھانے کا، احساس ذمہ داری کا۔ میرا

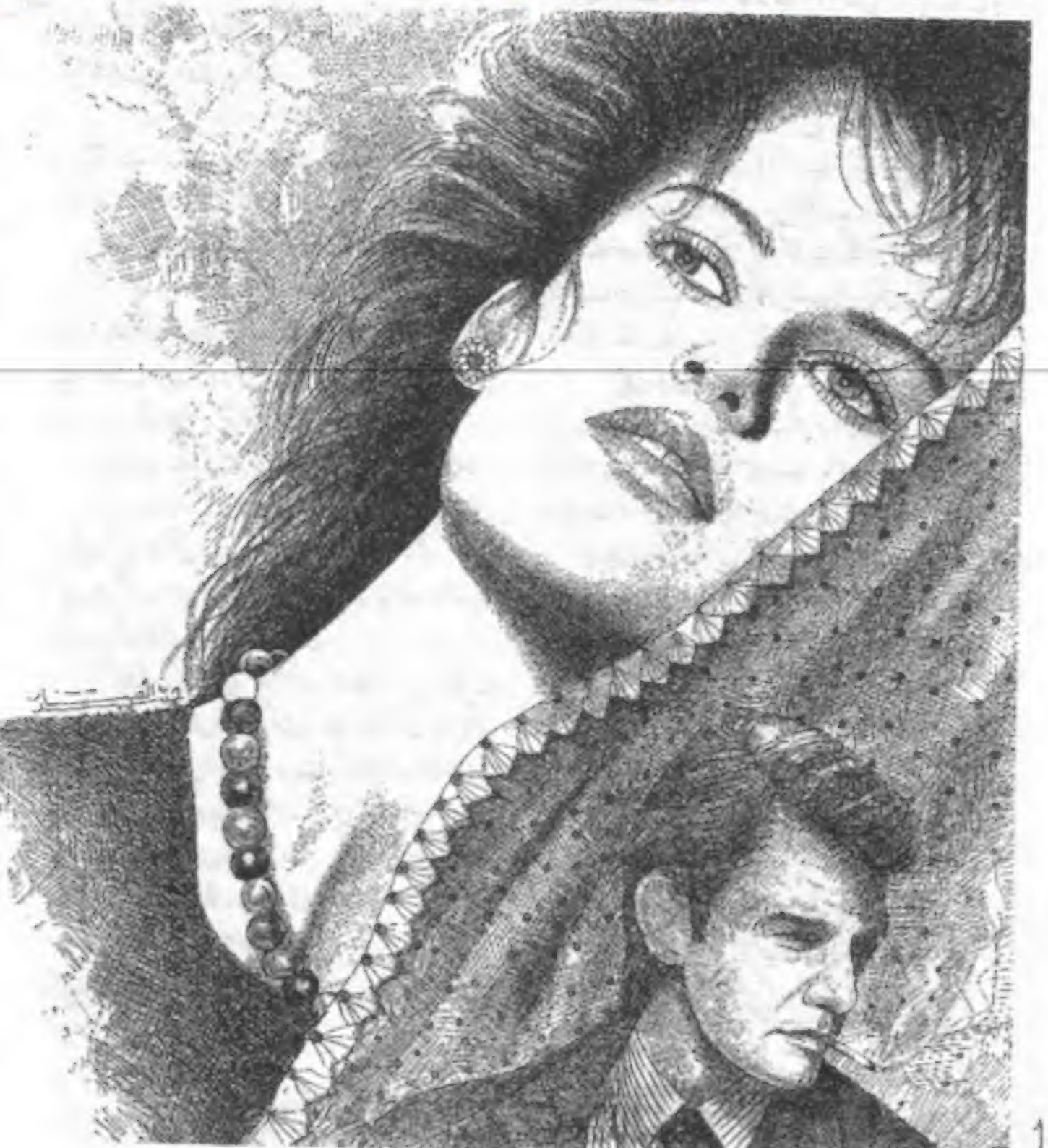

مطلب ہے، ایک کمٹ منٹ ہوتی ہے۔"

ہارون نے کسی جوشیلے مقرر کی طرح ہاتھ لہرا کر کہا تو آپا اس کے انداز پر دنگ رہ گئیں جبکہ فاریہ کا مارے طیش کے برا حال ہو گیا۔ وہ بھڑک کر بولی۔

"آپا! انہیں بتائیں کہ شادی ایک کمٹ منٹ ضرور ہوتی ہے مگر ایسی کمٹ منٹ نہیں ہوتی جس میں بیوی تو چکی میں گیہوں کی مانند پستی رہے اور شوہر موج مستی کرتا پھرے۔"

"ہیں..... موج مستی..... کیسی موج مستی؟ کیوں، کیا میں نوکری نہیں کرتا۔ سارا دن دفتر میں سر کھپاتا ہوں۔" وہ تڑپ اٹھا۔

"اونہہ..... سارا سارا دن.....؟ آپ کی ڈیوٹی نو بجے سے ڈیڑھ بجے تک ہوتی ہے اور ہفتے میں دو دن آف بھی ہوتا ہے۔"

اب کے فاریہ نے آپا کو بیچ میں لائے بغیر براہ راست کہا۔

"اچھا..... میرے تو ہفتے میں دو دن آف ہوتے ہیں۔ تمہارا تو پورا ہفتہ ہی آف ہوتا ہے۔ صفائی والی آتی ہے، دھلائی والی بھی آتی ہے۔ ایک ہنڈیا ہی چڑھانی ہوتی ہے۔ دل چاہا تو چڑھالی ورنہ ہوٹل زندہ باد۔"

ہارون نے بھی جوابی حملہ کرنے میں دیر نہ کی۔

اس سے پہلے کہ فاریہ بھی مزید گل افشانی کرتی، آپا جو اتنی دیر سے ان دونوں کی ٹکر ٹکر شکلیں دیکھ رہی تھیں، ان کا ضبط جواب دے گیا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

"خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ..... دونوں خاموش ہو جاؤ۔ میں تو تم لوگوں سے ملنے آتی ہوں مگر آگے سے تم دونوں ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتے ہو۔ بی پی ہائی ہو جاتا ہے میرا۔ اب نہیں آؤں گی دوبارہ..... جا رہی ہوں ابھی کے ابھی..... پکڑاؤ فاریہ! میری چادر۔"

"ارے آپا! بیٹھیں پلیز..... مت جائیں، ابھی تو آئی تھیں۔" فاریہ نے گھبرا کر جلدی سے انہیں کندھوں سے تھام کر دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔

"ہاں آپا! آپ تشریف رکھیں پلیز' ابھی تو آپ نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ میں ابھی آپ کے لیے گرم گرم بریانی اور کولڈ ڈرنک لے کر آتا ہوں۔"

وہ عجلت میں سائڈ ٹیبل پر دھری موٹر سائیکل کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کیوں بھئی؟ کیا گھر میں کھانا نہیں بنا۔" انہوں نے فاریہ کی جانب تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنی جگہ پر کھسیا کر رہ گئی جبکہ ہارون جتاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نہیں آپا! آپ کو میں تھوڑی دیر پہلے ہی تو بتا رہا تھا کہ ہمارے ہاں اکثر بازار سے کھانا آتا ہے۔"

"آپا! یہ دفتر سے آ کر بستر پر اینڈتے رہتے ہیں، کوئی سبزی وغیرہ ہی نہیں لا کر دیتے، میں کیا پکاؤں۔" فاریہ جلدی سے اپنی صفائی دیتے ہوئے مسکین شکل بنا کر بولی۔ جواب میں ہارون بھی کچھ کہنے لگا تھا مگر اس سے پہلے کہ دونوں کے درمیان پھر جنگ چھڑ جاتی۔ آپا ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے بولیں۔

"اچھا، کوئی بات نہیں۔ میں نے کچھ دن پہلے بڑیاں بنائی تھیں، ایک پیکٹ تم لوگوں کے لیے بھی لائی ہوں۔ فاریہ! چلو میرے ساتھ کچن میں۔ تم روٹیاں ڈالو اور میں اس کا سالن بنا لیتی ہوں۔"

بڑیاں ماش کی دال سے بنائی جاتی ہیں۔ دال میں تمام مسالا جات ڈال کر اسے پیس لیا جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں خشک کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ حسب ضرورت اس کا سالن بنا لیا جاتا ہے۔

☆☆☆

تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ تینوں کھانا کھانے کے بعد چائے پی رہے تھے۔

"واہ آپا! مزا آ گیا۔ بہت لذیذ سالن بنایا ہے آپ نے۔ اماں کی یاد تازہ ہو گئی۔"

ہارون فاریہ کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کو بھی کچھ سکھا دیں نا..... کچا پکا پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔"

فاریہ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا تو آپا جلدی سے بولیں۔

''ان شاء اللہ سیکھ جائے گی۔ جلد ہی سیکھ جائے گی۔ شروع شروع میں ہم بھی ایسا ہی پکایا کرتے تھے۔ پھر یہ بھی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ابھی کچن میں کام کرتے ہوئے میں نے دیکھا ہے کہ کھانا پکانے کا بہت سا ضروری سودا سلف عنقا ہے۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ فاریہ بیٹا! تم کاغذ قلم لے کر آؤ، ضروری سامان کی لسٹ بناتے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد فاریہ نے آپا کی مدد سے تمام اشیا خوردونوش کی فہرست بنالی اور ہارون وہ سامان خریدنے بازار چلا گیا۔

اب فاریہ اور آپا لاؤنج میں تنہا رہ گئیں۔ آپا صوفے پر آرام دہ حالت میں بیٹھ گئیں اور پھر شفقت سے فاریہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''دیکھو بیٹا! گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ اس سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ شیطان خوش ہوتا ہے۔ تم دونوں سلوک اتفاق سے رہا کرو۔ میں جب یوں تم دونوں کا جنگ وجدل دیکھتی ہوں تو مانو کہ میرا کلیجہ کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اتنی پریشان ہو کر گھر جاتی ہوں مگر جب تمہاری ساس وہاں سے تم لوگوں کا حال چال دریافت کرتی ہیں تو ان کو سب اچھا ہے کی ہی رپورٹ دیتی ہوں۔ کیا بتاؤں ان کو کہ ان کے جانے کے بعد تم دونوں نے گھر کو میدان جنگ ہی بنالیا ہے۔''

''آپا! میں تو اپنی طرف سے ہارون کو خوش رکھنے کی اپنی کوشش کرتی ہوں، مگر یہ کسی طرح سے مطمئن ہی نہیں ہوتے۔ اتنے غصیلے اور نک چڑھے سے ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ مجھ پر کتنا چلا رہے تھے۔'' فاریہ نے اپنا دکھڑا رویا۔

''ہاں، مگر میں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ تم بھی برابر مقابلہ کرتی ہو۔ دوبدو جواب دیتی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہارون تھوڑے گرم مزاج کا ہے مگر دل کا بہت اچھا ہے۔ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ میں تو اسے بھی سمجھاتی ہوں اور تمہیں بھی سمجھا رہی ہوں کہ گھر کا ماحول پرسکون رکھنے کے لیے صبر، برداشت اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پر چیخنے چلانے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ ان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا! مگر میں کیا کروں؟ ہمیشہ جھگڑا ہارون ہی شروع کرتے ہیں تو پھر میں بھی اپنا ضبط کھو دیتی ہوں۔ اعجاز بھائی بھی تو ہیں نا۔ میں نے آج تک کبھی ان کی اونچی آواز تک نہیں سنی۔ کتنی ٹھنڈی اور پرسکون طبیعت کے مالک ہیں۔ آپ دونوں کے بیچ تو لگتا ہے کہ کبھی لڑائی ہوئی ہی نہیں ہوگی۔''

''نہیں بٹیا! تم غلط کہہ رہی ہو۔ دنیا میں کوئی میاں بیوی ایسے نہیں ہوتے جن کے مابین اختلاف رائے نہ ہوتا ہو۔ تم نے سنا نہیں کہ جہاں دو برتن ہوں وہاں کھڑکتے تو ہوتی ہے۔ پھر نوک جھونک سے ہی تو ازدواجی زندگی کا حسن قائم رہتا ہے ورنہ یکسانیت سے تو ہر کوئی اکتا جاتا ہے۔ بس خیال رکھنا چاہیے کہ بحث وتکرار، لڑائی جھگڑے میں نہ بدلے اور نہ ہی آواز کمرے سے باہر جانی چاہیے۔ دونوں کو آپس کے معاملات خود ہی سلجھا لینے چاہئیں تاکہ کسی تیسرے کو مداخلت نہ کرنی پڑے ورنہ میاں بیوی تو لڑ جھگڑ کر پھر ایک ہو جاتے ہیں، مگر دوسروں کی نظروں میں دونوں کی عزت گر جاتی ہے اور گھر کا ماحول علیحدہ خراب ہوتا ہے۔

فاریہ بٹیا! مجھے تم دونوں سے ہی بہت پیار ہے۔ جب ابا مرحوم نے سامنے والا گھر کرائے پر لیا تھا تو تم صرف چھ ماہ کی تھیں اور اپنا ہارون یہی کوئی سوا سال کا ہوگا۔ تم دونوں کو اپنی گود میں کھلایا ہے میں نے۔ تمہارے ساس سسر نے بھی مجھے اپنی منہ بولی بیٹی بنایا ہوا تھا۔ ہمیشہ مجھے اس گھر سے اپنے میکے جیسا مان، عزت اور چاہت ملی۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آئی نمی کو وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھنے لگیں۔ فاریہ بھی ان کی جذباتی کیفیت سے بہت متاثر ہوئی۔

''سوری آپا! آپ کو ہمارے ہاں آ کر اتنی پریشانی ہوئی۔''

''نہیں بٹیا! میں جانتی ہوں کہ تم ابھی کم عمر ہو۔

pklibrary.com

گھر داری کا زیادہ شعور بھی نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ سیکھ جاؤ گی۔ بس تحمل سے کام لو۔ مرد کی تو فطرت میں ہی اتاؤلا پن ہوتا ہے۔ عورت کو ہی اپنا دل و دماغ ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے۔ پہلے تو تمہارے ساس سسر گھر میں موجود تھے، اونچ نیچ دیکھ لیتے تھے۔ اب تم دونوں کو گھر اکیلے ہی چلانا ہے تو اس کے لیے صبر و برداشت اور تحمل کی ضرورت ہوگی۔ بس میری بچی! گھبرانا نہیں۔ اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔"

وہ دعائیں دیتے ہوئے اس وقت فاریہ کو اتنی اچھی لگیں کہ اس کے دل میں ان کی قدر و منزلت پہلے سے بڑھ گئی اور ہاں البتہ ان کی نصیحتوں کو اس نے ہمیشہ کی طرح ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا۔

☆☆☆

فاریہ ایک شوخ و چنچل، لا ابالی اور من موجی مزاج کی حامل لڑکی تھی۔ پڑھائی لکھائی سے جو وقت بچتا، وہ سارا کھیل کود اور موج مستی میں گزر جاتا۔ ماں نے بہتیری کوشش کی مگر فاریہ بی بی نے گھر داری کی الف ب تک نہ سیکھ کر دی۔ لاپروائی کا یہ عالم تھا کہ اگر ماں کبھی زبردستی دودھ ابالنے کے لیے کھڑا کر دیتی تو اپنے موبائل میں غرق رہتی یہاں تک کہ دودھ ابل ابل کر چولہا، شیلف سب ہی بھر جاتے مگر وہ مشہور برانڈ کے لان پرنٹ میں کھوئی رہتی۔ جب ماں اچانک کچن میں آ کر اس کی پشت پر ایک زوردار دھمو کا رسید کرتی تو اسے ہوش آتا۔

دیوار پار تایا، تائی کا گھر تھا۔ یہ اکلوتی تھی تو ان کے فقط دو ہی لڑکے تھے۔ بیٹی کوئی نہ تھی۔ تائی کی اپنی بھی کوئی بہن نہ تھی۔ اس وجہ سے اسے وہاں بھی بہت لاڈ پیار ملتا۔ اپنی ماں تو پھر روک ٹوک کرتی مگر تائی تو واری صدقے جاتی نہ تھکتیں۔ ماں اکثر شکوہ کرتی۔

"بھابھی! آپ اسے بگاڑ رہی ہیں۔ کچھ سکھایا بھی کریں۔"

"کوئی بات نہیں، ابھی بچی ہے۔" وہ لاپروائی سے اس کی چوٹی گوندھتے ہوئے کہتیں۔

جب وہ انٹر میں تھی تو اماں ابا اسے تایا تائی کے ہاں چھوڑ کر عمرے کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کو اس مقدس سفر سے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ وہیں ایک حادثے میں ختم ہو کر مدفون ہو گئے۔ روتی بلکتی فاریہ کو تایا تائی نے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔

والدین کی وفات پر تعزیت کے لیے آنے والی خاندان کی کچھ خواتین کی کھسر پھسر سے اس پر انکشاف ہوا کہ ماں، ابا نے بچپن میں ہی اس کی نسبت تایا تائی کے چھوٹے بیٹے ہارون سے طے کر دی تھی۔ بڑوں نے اب تک کسی کو بھی اس بات کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی تاکہ کہیں بچوں کا ذہن منتشر نہ ہو جائے۔

وہ اور ہارون ایک دوسرے کے آنگن میں ہی کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ بہت پرانی انسیت تھی جو حسین رشتے کا ادراک ہونے پر پسندیدگی اور الفت میں ڈھل گئی۔

تایا، تائی دونوں جہاندیدہ اور زیرک تھے۔ اگرچہ فاریہ ان کی سگی بھتیجی تھی مگر دو جوان بچوں کا یوں چھت تلے رہنا زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے انہوں نے معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے جب فاریہ ابھی گریجویشن کر رہی تھی اور ہارون بھی زیر تعلیم تھا تو دونوں کی شادی کر دی۔

ان کا بڑا بیٹا شرجیل پہلے ہی شادی شدہ تھا اور بیوی بچوں کے ہمراہ شارجہ میں مقیم تھا۔

☆☆☆

جب فاریہ کی شادی ہو رہی تھی تو اس کی ایک سہیلی بڑی دور کی کوڑی لائی۔ اس نے چپکے سے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ اب اسے سنبھل کر چلنا چاہیے کیونکہ خالہ، ممانی، پھوپھی، تائی وغیرہ جیسے رشتے جب ساس کا روپ دھار لیتے ہیں تو پھر وہ پچھلا لاڈ پیار کہیں اڑن چھو ہو جاتا ہے۔ اس کا تو کوئی میکہ بھی نہ تھا، اس لیے وہ بہت ڈری ہوئی تھی مگر شادی کے بعد تمام خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے۔ تایا، تائی کی پذیرائی میں کوئی کمی نہ آئی۔

ساری گھر گرہستی تائی چلا رہی تھیں۔ اس پر کوئی خاص ذمہ داری نہ ڈالی گئی۔ وہ پہلے کی طرح بھی دل

چاہا تو کپڑے استری کر دیتی۔ کبھی شام کی روٹیاں ڈال دیتی۔ ہاں البتہ اب وہ اسے سنجیدگی سے خانہ داری سکھانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ اس قدر سست تھی کہ کبھی کبھار وہ بھی مشکل میں پڑ جاتیں، اگر اسے صبح ناشتے کے لیے آملیٹ بنانے کا کہتیں تو چھوٹے چھوٹے اتنے سوال پوچھتی۔

''نمک مرچ کتنا ڈالوں؟''

''پیاز کتنی کاٹوں؟''

وہ تو تحمل سے جواب دیتیں مگر ہارون جھنجلا جاتا۔

''اس سے تو بہتر ہے اماں! آپ خود ہی بنالیں۔ گھنٹہ لگا دے گی۔''

ایک دن تائی کی طبیعت خراب تھی۔ بھنڈی گوشت کا سالن بنانا تھا۔ وہ اسے ترکیب سمجھا کر خود لیٹ گئیں۔ محترمہ نے ان کی پوری ہدایات تو غور سے سنی نہیں تھیں کیونکہ وہ اس وقت ساتھ ساتھ نیٹ پر آئی میک اپ کا پورا پروسیس بھی ملاحظہ کر رہی تھی۔ فارغ ہو کر اس نے نہایت اطمینان سے پہلے بھنڈیوں کو چھوٹا چھوٹا کاٹا پھر دھونے کے لیے ٹوکری میں ڈال کر سنک کے اندر رکھ کر اوپر سے نل کھول دیا۔ پھر جب مسالا بھون کر بھنڈیاں ڈالیں تو وہ ملغوبہ سی شکل اختیار کر گئیں۔

''ہیں.....؟ یہ کیا بنایا ہے؟''

اہل خانہ ششدر رہ گئے۔ دونوں بزرگوں نے تو کچھ پس و پیش کے بعد کھالیا مگر ہارون اکڑ گیا۔ اسے کچھ باہر سے منگوا کر دینا پڑا۔ بہر حال جو بھی تھا فی الحال تو گھر کا نظام احسن طریقے سے چل رہا تھا۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا مگر سدا حالات ایک سے نہیں رہتے۔ زندگی کسی کے لیے بھی ہمیشہ پھولوں کی سیج ثابت نہیں ہوتی۔ فاریہ پر بھی آزمائش پڑی۔

☆☆☆

ہوا یوں کہ ایک شام تایا جی سودا سلف لے کر گھر آرہے تھے کہ ایک اندھا، تیز رفتار موٹر سائیکل سوار ٹکر مار کر رفو چکر ہو گیا۔ وہ گر پڑے۔ ریڑھ کی ہڈی پر شدید ضرب آئی۔ بہت علاج معالجہ کروایا مگر تکلیف دور نہ ہوئی۔ ہارون سے بڑا شرجیل اور اس کی بیوی دونوں فزیوتھراپسٹ تھے۔ انہوں نے بصد اصرار ماں باپ دونوں کو وہاں بلوالیا۔ وہ جانا تو نہیں چاہ رہے تھے مگر مجبوری تھی۔

جاتے وقت تائی اماں نے اپنی تشویش کا اظہار آپا سے بھی کیا۔

''بلقیس! فاریہ اور ہارون دونوں کم عمر ہیں۔ گھر کا نظام سنبھالنے کے اہل نہیں ہیں۔ میرے ہوتے آپس میں الجھ پڑتے ہیں۔ بعد میں نجانے کیا ہوگا؟''

''باجی! بھائی صاحب کی دیکھ بھال کے لیے آپ کا جانا بہت ضروری ہے۔ آپ ان دونوں کی فکر نہ کریں۔ میں وقتاً فوقتاً چکر لگاتی رہوں گی۔ پکانے ریندھنے میں بھی فاریہ کی مدد کروا دیا کروں گی۔''

☆☆☆

دونوں بڑوں کے جانے کے بعد نئے نویلے جوڑے پر گھر بار کی تمام ذمہ داری آپڑی تو وہ بوکھلا کر رہ گئے۔ اگر فاریہ اندرونی گھریلو امور سے آزاد تھی تو ہارون پر بھی بیرونی کام کاج کا کوئی بوجھ نہ تھا۔ اس کے والد صاحب ہی بل وغیرہ جمع کرواتے۔ سودا سلف لے کر آتے اور گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزیں بھی وہی مرمت کرواتے۔

وہ پہلے زیر تعلیم تھا۔ اب اس کی نئی نئی نوکری لگی تھی۔ کچھ وہ فطری طور پر نازک مزاج بھی واقع ہوا تھا۔ فاریہ اگر کچھ بھول جاتی تو دوبارہ مارکیٹ جانا اسے عذاب لگتا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد اکثر لڑکیاں تمنا تو کرتی ہیں کہ سارے راج پاٹ کی وہ تن تنہا مالک ہوں۔ کوئی مداخلت کرنے والا نہ ہو مگر بزرگوں کی رہنمائی کے بغیر (جسے وہ مداخلت سمجھتی ہیں) گھر چلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پھر فاریہ بے چاری نے تو ایسی کوئی تمنا کی بھی نہیں تھی۔ یہ سب تو حادثاتی طور پر ہوا تھا۔ پہلے تو اس کے دو ہی شوق تھے۔ نیٹ پر میک اپ کے نئے نئے انداز سیکھنا اور اپنے کپڑوں کی ڈیزائننگ وغیرہ کرنا۔ مگر اب عملی زندگی میں تو یہ شوق کم ہی کام

pklibrary.com

آرہے تھے۔ ہارون جیسے چٹورے شوہر کا دل دماغ سب ہی معدے میں پڑے تھے۔

کہنے کو تو وہ صرف دو ہی افراد تھے۔ دو افراد کا کام ہی کتنا ہوتا ہے مگر حقیقت میں بہت بکھیڑے تھے۔ ڈبل اسٹوری گھر تھا۔ کام والی کے پیچھے پھر پھر کر صفائی کروانی پڑتی تھی۔ وہ پھر بھی کہیں نہ کہیں ڈنڈی مار جاتی تھی۔ ہارون نے ڈھیر سارے طوطے، چڑیاں وغیرہ پالے ہوئے تھے۔ اس کی غیر موجودگی میں تمام پنجروں کو صاف کروا کر دانہ پانی ڈالنا پڑتا تھا۔ دھلائی والی آتی تھی مگر اسے بھی میلے کپڑوں کی الگ الگ ڈھیریاں بنا کر دینی پڑتی تھیں۔ ہارون کو تینوں وقت کچھ مختلف کھانے کے لیے چاہیے ہوتا تھا۔

اب وہ اکیلی جان اور سو دھندے۔ اکثر گڑبڑ ہو جاتی۔ وہ دفتر سے آ کر پوچھتا۔

"کیا بنا ہے؟"

وہ کہتی۔ "مونگ کی دال۔"

"ساتھ میں کیا؟"

"روٹی ہے بھئی۔" وہ جواب دیتی تو وہ بدمزا ہو جاتا۔

اماں تو ساتھ ابلے چاول، رائتہ، سلاد اور ایک دو طرح کی چٹنیاں بھی بنا کر رکھتی تھیں مگر یہاں سامنے ملیدہ سی مونگ کی دال اور سادہ روٹی دل جلا دیتی۔ اس کی قیمصوں کے کف اور کالر ٹھیک سے صاف نہ ہوتے۔ دھلائی والی کو بھی کسی بڑے کا ڈر نہ تھا۔ وہ بھی الٹے سیدھے دھو کر جان چھڑا کر جانے کی کرتی۔ آپا بہتیرا کہتیں۔

"اپنی نگرانی میں برش پھروایا کرو۔"

مگر فاریہ اکثر بھول جاتی۔ یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر دونوں میں جھگڑے رہنے لگے۔ تلخیاں بڑھنے لگیں۔ ہارون اکثر کھانا چھوڑ کر بگڑے تیوروں کے ساتھ گھر سے نکل جاتا۔ وہ آپا سے شکایت لگاتی۔ وہ دونوں کو سمجھاتیں۔ ساتھ خود بھی حتی المقدور مدد کروانے کی کوشش کرتیں مگر ان کا اپنا علیحدہ گھر بار تھا۔ اب وہ دونوں کے ساتھ مستقل تو نہیں رہ سکتی تھیں۔

ہاں، البتہ وہ ہارون کی نسبت فاریہ کو زیادہ سمجھاتیں، بجھاتیں تو وہ سوچ میں پڑ جاتی۔ لاشعوری طور پر ہارون کا موازنہ آپا کے شوہر سے کرتی۔ جنتی ٹھنڈی میٹھی طبیعت کی مالک آپا خود تھیں، ان سے بھی زیادہ پرسکون شخصیت کے مالک ان کے میاں تھے۔ خاموش خاموش سے، دھیما دھیما سا مسکرانے والے نرم خو انجان بھائی جبکہ غصہ ور اور فراتفری مچانے والا ہارون۔

☆☆☆

یوں ایک ایک کر کے تین مہینے گزر گئے اور رمضان کا مقدس مہینہ آ پہنچا۔ رحمتوں، برکتوں اور فضیلتوں والا مقدس مہینہ سایہ فگن ہو رہا تھا۔ فاریہ پکی روزہ دار تھی مگر ہارون کچھ آنا کانی کر جاتا تھا۔ آپا نے فون کر کے فاریہ کو ضروری ہدایات دیں اور ساتھ ہی ملازم کے ہاتھوں ڈھیر سارے سموسے اور کباب وغیرہ فریز کرنے کے لیے بھیج دیے تاکہ افطاری میں دونوں کے کام آ سکیں۔ فاریہ نے بھی ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے پہلی سحری کے لیے دوپہر میں ہی آٹا گوندھ کر فریزر میں رکھ لیا تاکہ خراب نہ ہو جائے۔ ارادہ تھا کہ سوتے وقت نکال کر نیچے فریج میں رکھ دے گی۔ رات کو بھی ہارون سے کہا کہ دو گھنٹے پہلے ہی کا الارم لگا دے تاکہ سکون سے سحری کر سکیں۔

اب یا تو موبائل میں کوئی مسئلہ تھا یا پھر ہارون سے ہی غلطی ہوئی تھی۔ الارم سحری بند ہونے سے صرف بیس منٹ پہلے بجا۔ فاریہ نے دوڑ کر فریج کھولا۔ وہ آٹے کا پیالہ فریزر میں سے نکالنا بھول گئی تھی۔ اب وہ پتھر بنا پڑا تھا۔ ڈبل روٹی کے چند سلائس موجود تھے۔ دونوں نے بشتم پشتم روزہ رکھا۔

ناکافی کھانا کھایا تھا، اس لیے سارا دن نقاہت محسوس ہوتی رہی۔ فاریہ علیحدہ سے کچھ پکا نہ سکی۔ آپا کے سموسے اور کباب ہی کام آئے۔ راشن بھی تقریباً ختم تھا۔ اگلے دن اس نے لسٹ بنا کر دی مگر ہارون بستر سے ہی نہ اٹھا۔

"یار! روز کے روز حسب ضرورت لے آیا کروں گا، تم سے اکٹھا اتنا سامان کہاں سنبھالا جائے گا۔"

یوں ایک ایک کرکے آدھے روز ے گزر گئے۔ مگر ابھی عید کی ساری تیاری ادھوری پڑی تھی۔ اس نے پورا گھر صاف کروانا تھا۔ بیڈ شیٹس، پردے، کور وغیرہ نئے خریدنے تھے۔ ہارون اپنے کپڑے سلنے دے رہا تھا مگر اس نے ابھی اپنے کپڑے ڈیزائن کرنے تھے۔ وہ اس معاملے میں بہت مشکل پسند واقع ہوئی تھی۔

اس دن وہ فون پر اپنی دوست کے ساتھ مصروف تھی، جب ہارون عجلت میں اندر داخل ہوا۔ شاید کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ ابھی ضروری بات کررہی ہے۔

"ہاں زارا! تم کیا بتارہی تھیں کہ آج کل سوئس لان کے سوٹ کے ساتھ شیفون کا دوپٹا فیشن میں ہے۔ ٹھیک ہے، میں بھی کل مارکیٹ جاؤں گی اور کیا تمہاری دو تین لپ اسٹک ختم ہوگئی ہیں، ان کو پھینکنا مت۔ میں تو ان کو مکس کرکے نیا شیڈ بنالیتی ہوں جو کہیں سے بھی نہیں ملتا۔ بالکل نیا اور انوکھا شیڈ بنتا ہے۔ بس کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

"یار! میری تمام جینز کی پینٹس دھونے والی پڑی ہیں۔ میں کل دفتر کیا پہن کر جاؤں گا؟"

ہارون مزید صبر نہ کرسکا تو اس نے بھی فون بند کرکے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

"اچھا، میں کچھ کرتی ہوں۔"

دراصل کئی روز سے کپڑے دھونے والی نہیں آرہی تھی۔ اس نے اپنے تو دو چار لان کے سوٹ دھولیے تھے مگر ہارون کی بھاری بھرکم پینٹس دھونے کی ہمت نہ تھی مگر اب کچھ تو کرنا تھا۔ ناچار اس نے واشنگ مشین کھینچی۔ پاؤ بھر سرف ڈالا اور کھونٹی سے لٹکتی ہوئی دو پینٹس بغیر سوچے سمجھے مشین میں جھونک دیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کو کھنگالنے بیٹھی تو ایک کی جیب کچھ بھاری لگی۔ ہاتھ ڈالا تو یہ کیا ہارون کا موبائل برآمد ہوا۔

"اف..... میرے خدایا....." اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ جیبیں چیک کرنا بھول گئی تھی۔ ہارون کسی کام سے گیا تھا جب اندر آیا تو وہ سامنے کھڑی سرف اور صابن سے نہلایا ہوا نیا نکور قیمتی موبائل ہاتھوں میں تھامے گم صم کھڑی تھی۔

"یہ کیا کیا.....؟" وہ صدمے سے گنگ رہ گیا۔

"سوری..... ہارون..... یہ غلطی سے مشین میں....."

"کیا..... احمق عورت! تم نے اس کو مشین میں ڈال دیا؟"

اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ پھٹ پڑا۔

"پھوہڑ..... جاہل..... گنوار....."

اس نے بہتیری معذرت کرنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ اس نے ایڈوانس سیلری لے کر وہ موبائل خریدا تھا۔ گھر کا بجٹ آج کل ویسے بھی محدود سا تھا۔ باپ کے علاج پر وہاں بہت خرچا ہورہا تھا۔ اس لیے اب وہ بھائی سے پیسے بھی نہیں منگوا سکتا تھا۔ اوپر سے اتنا بڑا نقصان ہوگیا۔ اس نے خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ فاریہ نے کچھ دیر تو برداشت کیا پھر وہ بھی مقابلے پر اتر آئی۔ ٹھیک ہے کہ اس کی غلطی تھی مگر ماضی میں وہ خود اس سے بھی زیادہ بھیانک غلطیوں کا ارتکاب کرچکا تھا۔ اس نے بھی اسے یاد دلایا کہ ایک دفعہ اس نے اپنی نئی ون ٹو فائیو موٹر سائیکل بغیر تالا چابی کے گھر سے باہر کھڑی کردی تھی اور وہ چوری ہوگئی تھی اور پھر ایک دفعہ جیولر سے اس کی گولڈ کی چین پالش کروا کر واپس لاتے ہوئے راستے میں ہی کہیں گرا آیا تھا۔

فاریہ کی ان باتوں نے مزید جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یعنی وہ اپنی غلطی ماننے کے بجائے ماضی میں ہونے والے حادثات کا قصہ لے کر بیٹھ گئی تھی۔ فاریہ نے بھی جتایا کہ اگر بیوی سے غلطی ہوجائے تو وہ پھوہڑ اور جاہل ہوجاتی ہے، ایسی ہی غلطی جب شوہر سے ہو

تو وہ حادثہ ہوتا ہے۔

پھر کیا تھا دونوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ہارون نے اسے فوراً گھر سے نکل جانے کا کہا اور خود بھی بکتا جھکتا ہوا باہر نکل گیا۔

فاریہ نے مارے صدمے اور رنج کے دو جوڑے بیگ میں ڈالے اور رکشہ کروا کر سیدھی آپا کے ہاں آ گئی۔

''کیا ہوا چندا!'' آپا اسے یوں بے وقت آتا دیکھ کر گھبرا گئیں۔ وہ ان کے گلے لگ کر دھواں دار رو پڑی اور پھر ساری داستان گوش گزار کر دی۔

''تم اتنی سی بات پر گھر چھوڑ کر آ گئیں؟'' آپا دہل گئیں۔

''آپا! یہ اتنی سی بات ہے؟ پھر اس نے مجھے خود گھر سے جانے کے لیے کہا تھا۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''ارے بٹیا! وہ تو غصے سے کہہ رہا تھا۔ کوئی سچ مچ تھوڑی نکال رہا تھا۔'' آپا نے رسان سے سمجھایا۔

''آپا! اب میں ہرگز وہاں نہیں جاؤں گی۔ آپ بس مجھے کچھ دن ٹھہرا لیں۔ پھر میں اپنا کوئی اور بندوبست کر لوں گی۔''

وہ کسی اڑیل گھوڑی کی طرح بدک گئی۔ آپا سمجھ گئیں کہ وہ فی الحال جذباتی کیفیت میں ہے اور کچھ نہیں سنے گی۔ اسے سمجھانا بے کار تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے آرام کرنے کے لیے کمرے میں بھیج دیا۔

☆☆☆

شام کو وہ اٹھی تو آپا اس کی اور اپنی افطاری بنا چکی تھیں۔ اعجاز بھائی دفتر میں ہی روزہ کھولتے تھے۔ اس نے شکر کیا، فی الحال وہ ان کا سامنا کرنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔ اگلے دن آپا سحری کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گئیں۔ انہوں نے نہایت اہتمام سے کھانے پینے کے تمام لوازمات ٹرے میں سجائے اور اعجاز بھائی کو ان کے کمرے میں دے کر آئیں اور پھر خود فاریہ کے ساتھ سحری کچن میں ہی کی۔ سحری کے بعد فاریہ تو نماز سے فارغ ہو کر روٹین کے مطابق دوبارہ لیٹ گئی جبکہ آپا نے دفتر جانے کے لیے میاں کے کپڑے، جوتے سب ہی تیار کیے۔ عین وقت پر ان کو اپنا استری شدہ سوٹ کچھ پسند نہ آیا تو آپا نے بغیر ناک بھوں چڑھائے فوراً دوسرا سوٹ استری کر کے دیا۔

پھر سارا دن بھی وہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف رہیں۔ شام میں روزہ کھلنے سے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جب وہ اپنی اور فاریہ کی افطاری تیار کر چکی تھیں تو اچانک دفتر سے اعجاز بھائی کا فون آ گیا کہ وہ بھی آج دفتر میں افطاری نہیں کریں گے بلکہ گھر آ رہے ہیں۔ چند دوست بھی ہمراہ ہیں۔

''اب کیا ہوگا آپا؟'' فاریہ نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوگا بٹیا! کچھ چیزیں فریزر میں تیار رکھی ہیں۔ کچھ ابھی تیار کر لیتے ہیں۔'' وہ اپنے ازلی پرسکون لہجے میں بولیں۔

''آپا! آپ اعجاز بھائی سے کہیں نا کہ وہ آتے ہوئے ہوٹل سے کچھ لیتے آئیں۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بولیں۔

پھر فاریہ نے دیکھا کہ انہوں نے فریزر سے یخنی نکال کر پلاؤ بنایا۔ قورمہ کا مسالا بھی تیار تھا۔ اس میں مرغی ڈال کر بھون لی۔ فاریہ نے رائتہ، سلاد تیار کیا۔ انہوں نے گھر میں پہلے سے موجود رس گلے ڈال کر کسٹرڈ بنا لیا۔ یوں جھٹ پٹ افطاری تیار ہو گئی تو فاریہ بولی۔

''آپا! ہم سب ہی سہیلیاں جب ڈائجسٹ میں کہانی پڑھتے تھے کہ ہیروئن فٹافٹ انواع و اقسام کے کھانے تیار کر لیتی ہے تو اتنا ہنستے تھے کہ ایسی ہیروئن صرف ڈائجسٹ میں ہی پائی جاتی ہے مگر آج معلوم ہوا کہ ویسی ہیروئن حقیقت میں بھی ہو سکتی ہے۔''

''اچھا.....'' وہ برتن سیٹ کرتے ہوئے

دھیرے سے مسکرائیں۔

''آپا! آپ نے ہوٹل سے افطاری کیوں نہیں منگوائی؟ کیا اعجاز بھائی پسند نہیں کرتے؟'' وہ ان کی مدد کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں چندا! وہ تو ہوٹل کے کھانوں کے دیوانے ہیں۔ مگر ان کو تیزابیت کی شکایت ہے۔ باہر کا کھانا نقصان دیتا ہے۔ پھر مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ وہ روزے کی حالت میں بازار سے کھانا خریدنے کے لیے خوار ہوتے پھریں۔''

افطاری بہت شاندار رہی۔ اس کا خیال تھا کہ اعجاز بھائی کو یوں ایمرجنسی میں افطاری تیار کرنے پر آپا کو کچھ انعام وغیرہ دینا چاہیے مگر وہ تو ایک لفظ نہ بولے۔ کہا تو فقط یہی کہا کہ رائتہ اور سلاد میں کچھ کمی رہ گئی تھی۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا کیونکہ یہ دونوں چیزیں اسی نے تیار کی تھیں۔

☆☆☆

اس دن جب ہارون واپس آیا تو بیرونی گیٹ لاکڈ تھا۔ ایک اضافی چابی اس کے پاس بھی موجود تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ فاریہ کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا اور بیڈ روم سے موبائل بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا اپنا موبائل تو غارت ہو چکا تھا۔ یہ فاریہ کا تھا غالباً وہ جاتے ہوئے غصے میں موبائل ادھر ہی چھوڑ گئی تھی۔ کال آپا کی تھی۔ انہوں نے اسے سخت سرزنش کی اور بتایا کہ فاریہ اب چند دن ان ہی کے ہاں رہے گی۔ اس کا غصہ بھی تازہ تھا۔ اس نے بھی زیادہ پروا نہیں کی۔ ایک تو اتنا بڑا نقصان کر دیا تھا، اوپر سے بجائے شرمندہ ہونے کے گھر ہی چھوڑ گئی تھی۔ اس وقت وہ بھول گیا کہ گھر سے نکل جانے کا اسی نے کہا تھا۔

چند روز نہایت سکون سے گزرے۔ وہ دودھ یا جوس پی کر روزہ رکھ لیتا۔ افطاری کے لیے بازار سے روٹی لے آتا اور آپا کے بھجوائے کباب فرائی کر کے روزہ افطار کر لیتا۔ فاریہ کی یاد تو ستاتی مگر ساتھ ہی اس کی ذات پر غصہ بھی نئے سرے سے امڈ امڈ آتا۔ اس کے خیال میں اس نے ہمیشہ اس کی ذات کی نفی کی تھی۔ اب تک بھی اگر اسے خود سے احساس نہیں تھا تو وہ کیوں اس کے پیچھے پاگل ہوا پھرتا۔

☆☆☆

فاریہ کو آپا کے ہاں آئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔ فی الحال اس کے واپس جانے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ آپا اس صورت حال سے سخت پریشان تھیں۔ اگر وہ ایسا کوئی تذکرہ بھی کرتیں تو فاریہ فوراً کسی ہوسٹل وغیرہ جانے کا عندیہ ظاہر کر دیتی اور آپا بے چاری وہیں سہم کر خاموش ہو جاتیں۔

دوسری طرف ہارون کو فون کرتیں تو اس کا بھی عجیب روکھا روکھا سا لہجہ ہوتا۔ نجانے اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ وہ سوچ سوچ کر دبلی رہتیں۔

☆☆☆

رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ گھر کی حالت بہت ابتر تھی۔ ہر طرف خاک اڑ رہی تھی۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے اس نے خود ہی کام والیوں کو چھٹی دے رکھی تھی۔ آج دفتر سے آ کر اس نے پائپ لگا کر سارا گھر دھویا۔ اپنے کپڑوں والی الماری درست کر رہا تھا کہ اچانک کہیں سے فاریہ کا گولڈن ریشمی دوپٹا پھسل کر نیچے آ گرا۔ اس نے دوپٹا اٹھایا تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس بے وفا کی یاد بے وقت اور بری طرح سے آئی۔

زندگی میں پہلی بار وہ دونوں اتنے دن کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ محسوس تو وہ اتنے دن سے کر رہا تھا مگر آج تو دل کا آنگن بہت سونا سونا سا لگا۔ در و دیوار پر عجیب بے رونقی سی چھائی تھی۔ ہر طرف بے ترتیبی سی بے ترتیبی تھی۔ وہ جو اکثر کہا کرتا تھا۔

''آخر تم سارا دن کرتی کیا رہتی ہو؟''

اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ کافی کچھ کرتی تھی۔ کچا پکا جیسا بھی تھا، کھانا تو ملتا تھا۔ اب تو آپا کے کبابوں کا اسٹاک بھی کب کا ختم ہو چکا تھا اور بازاری

اشیا پر گزارا چل رہا تھا۔ سامنے شیشے پر نظر پڑی تو اپنے چہرے پر عجیب وحشت اور مردنی سی چھائی دکھائی دی۔

کیا صرف فاریہ کے جانے سے.....؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

فاریہ کو آپا کے ہاں رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ اعجاز بھائی اتنے بھی بے ضرر اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی نہیں ہیں، جتنا وہ ان کو سمجھتی تھی۔

وہ بہت نکتہ چیں اور باریک بین تھے۔ اگر چیختے چلاتے نہیں تھے تو اس میں بھی کمال ان کا نہیں بلکہ آپا کا تھا جو اس کا موقع ہی نہیں آنے دیتی تھیں۔

وہ اتنے کم گو تھے کہ سارا دن میں بامشکل چند الفاظ ہی بولتے ہوں گے۔ مگر آپا بن کہے ہی ان کی ہر ضرورت بھانپ لیتی تھیں۔

وہ سوچتی کہ ایسے روبوٹ ٹائپ آدمی کے ساتھ گزارا کرنا بھی آپا کا ہی حوصلہ ہے۔ ایک دن وہ اس کا اظہار بھی کر بیٹھی۔

''آپا! میں تو سمجھتی تھی کہ آپ جنت میں رہ رہی ہیں.....''

''دیکھو چندا! گھر جنت ہوتے نہیں ہیں، ان کو جنت بنانا پڑتا ہے۔ اپنے حسن سلوک سے، صبر اور برداشت سے۔'' وہ نرم لہجے میں سمجھاتیں تو وہ نظریں چرا کر رہ جاتی۔

☆☆☆

اب تو ماہ رمضان فقط چند روز کا ہی مہمان رہ گیا تھا۔ روزہ داروں کی عبادت و اذکار میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ہر کوئی اجر و ثواب سے اپنی جھولی بھر لینا چاہتا تھا۔

ملک بھر میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے اس بار بھی عید الفطر سادگی سے منائی جا رہی تھی۔ مگر جوں جوں عید قریب آ رہی تھی، لوگوں کے جوش و خروش اور گہما گہمی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آپا نے فاریہ کو بھی عید کی شاپنگ کے لیے ساتھ لے جانا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا تو وہ میاں کے ساتھ مارکیٹ روانہ ہو گئیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انہوں نے فاریہ کے علاوہ ہارون کے بھی کپڑے جوتے خریدے۔

کافی دن سے اس کے ساتھ رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے کئی بار کوشش کی مگر ہر بار فون بند ملا۔ ورنہ پہلے تو وہ فون کر کے خیریت معلوم کر لیا کرتا تھا مگر اب اتنے روز سے خاموشی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر ملازم لڑکے کو گھر بھی دوڑایا۔ وہاں بھی تالا لگا تھا۔

وہ سخت پریشان تھیں۔ فاریہ اپنی جگہ پوری بنی پھرتی تھی۔ اس کی شادی کی یہ پہلی عید تھی۔ اس حوالے سے کتنے خواب بنے تھے، سب خاک میں مل گئے۔

اب تو اسے سراسر اپنا ہی قصور نظر آ رہا تھا۔ اگر اس دن وہ کھلے دل سے معافی مانگ لیتی تو شاید معاملہ اتنا نہ بگڑتا۔ اب ہارون نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ وہ اسے کہاں سے ڈھونڈے.....؟ اس کے سجدے طویل ہو گئے تھے۔ وہ اس کی خیریت کے لیے اللہ کے حضور دیر تک جھولی پھیلائے رکھتی۔

آخری روزہ افطار کرنے کے بعد جب عید کا چاند نظر آنے کا اعلان ہوا تو وہ دیر تک آپا کے گلے لگی رہی۔ دونوں کی آنکھیں پرنم تھیں۔ وہ عشا کی نماز ادا کرنے چھت پر چلی گئی اور آپا کچن میں صبح کے لیے شیر خرما بنانے کا سامان نکالنے لگیں۔

وہ اپنے دھیان میں میوہ جات صاف کر رہی تھیں جب کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ساکت رہ گئیں۔

ملگجے سے سفید شلوار سوٹ میں سامنے ہارون کھڑا تھا۔ اس کے سر پر بھی سفید ٹوپی تھی۔ چھوٹی سی داڑھی کے ساتھ وہ بہت کمزور اور زرد زرد سا دکھ رہا تھا۔ گلے میں گلاب کے پھولوں کا ایک ہار جھول رہا تھا۔

''ہارون..... میرے بچے.....!'' وہ فرط محبت سے اس سے لپٹ گئیں۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟'' وہ اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''آپا! میں اعتکاف میں بیٹھ گیا تھا۔'' وہ نظریں

pklibrary.com

جھکا کر دھیرے سے بولا۔
"ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... مبارک ہو۔ مجھے تو بتا دیتے، میں اعجاز کو مسجد بھیج دیتی۔" ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔
وہ چپ چاپ متلاشی نظروں سے سامنے آنگن میں دیکھتا رہا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔ وہ سمجھ گئیں کہ وہ فاریہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔
"وہ اوپر نماز پڑھ رہی ہے۔" انہوں نے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا تو وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اوپر وسیع و عریض چھت کی داہنی دیوار سے لٹکتا بلب ہلکی زرد روشنی پھیلا رہا تھا۔ مشرق کی جانب کونے میں جائے نماز بچھائے فاریہ نماز کے بعد دعا مانگ رہی تھی۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ بہت کملایا سا دکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے اپنے دونوں ہاتھ سامنے پھیلائے نجانے اللہ سے کیا مانگ رہی تھی۔
بند آنکھوں سے موتیوں کی مانند آنسو نکل نکل کر گالوں کو بھگو رہے تھے۔ کافی دیر بعد اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے تو اچانک پیچھے سے آ کر کسی نے اس کے دونوں ہاتھوں کو نرمی سے اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔
وہ کرنٹ کھا کر پلٹی تو سامنے زمین پر بیٹھے ہارون کو دیکھ کر گم صم سی رہ گئی۔ دونوں کے بیچ پراسرار سی خاموشی حائل تھی۔ فاریہ نظریں جھکائے ہوئے تھی اور وہ محویت سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔
"سوری فاریہ!" پھر اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔
"سوری ہارون!" وہ بھی سسکی۔
"غلطی میری تھی۔"
"نہیں..... غلطی میری تھی۔"
"میں نے آپ کا موبائل....."
"مجھے بھی تمہیں گھر سے جانے کا نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ نرمی سے اس کے ہاتھوں کو دبا رہا تھا۔
"مگر میں نے بھی تو آپ کا موبائل....."
"ارے، بھاڑ میں گیا موبائل..... چیزیں اہم نہیں ہوتیں فاریہ! چیزیں رشتوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتیں۔ چیزیں ٹوٹ جائیں تو دوبارہ مل جاتی ہیں لیکن اگر رشتے کھو جائیں تو وہ مشکل سے ملتے ہیں۔ میں نے اعتکاف میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے۔ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی کوتاہیوں کو درگزر کر دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بھی تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔"
وہ اس کے حلیے سے کچھ کچھ تو سمجھ ہی گئی تھی۔ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔
"آپ کو اعتکاف میں بیٹھنا مبارک ہو۔"
"تمہیں بھی چاند رات مبارک ہو۔"
"ہم نے سوچا تھا، عید کا چاند اکٹھے دیکھیں گے۔" اس نے یاد دلایا۔
"وہ تو ہم اب بھی دیکھ سکتے ہیں۔" وہ اس کے ہاتھوں کو تھامے ہوئے ہی اٹھا۔ وہ بھی ساتھ ہی اٹھ گئی۔
دونوں چلتے ہوئے مشرقی دیوار کے پاس آئے اور متلاشی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ سفید بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔
عید کا نخریلا سا چاند بھلا اتنی آسانی سے کہاں نظر آنے والا تھا۔ دونوں کی نظریں کافی دیر تک آسمان پر بھٹکتی رہیں۔ پھر آخر کار دونوں کو بیک وقت وہ نظر آ ہی گیا۔ ایک بدلی کی اوٹ سے چاندی کے باریک سی تار کی مانند عید کا چاند جھانک رہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر خوب صورت مسکراہٹ پھیل گئی اور چاند نے بھی دونوں سے شرما کر دوبارہ اسی بدلی کے پیچھے اپنا مکھڑا چھپا لیا۔

pklibrary.com
Monthly Shuaa July 2021

pklibrary.com

حسنہ حسین

عسر یسرا

خواب دیکھتے ہوئے جنت کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ خود کو برائڈل ڈریس میں دیکھ کر اسے یاد آتا ہے کہ اس کی شادی فارس وجدان سے ہو چکی ہے جو ''شیرازی انٹر پرائزز'' کا سی ای او ہے۔ وہ جنت کمال پر واضح کر دیتا ہے کہ یہ ایک کاغذی رشتہ ہے جو اس نے اپنی ماں کی خاطر بنایا ہے۔ جب تک ماں زندہ ہیں، یہ رشتہ رہے گا۔

جنت کی فارس سے شادی سائرہ خالہ نے کروائی ہے۔ ان کا بیٹا عمار اس شادی پر ناراض ہے۔ اس کا خیال ہے۔ میڈیا پر فارس سے متعلق جو خبریں گردش کرتی رہی ہیں، وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

فارس کی والدہ مسز شیرازی ایک نیک دل عورت ہیں جو چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ وہ ایک آرٹسٹ ہیں۔ ان کی پینٹنگ عسر یسرا جنت کو حیران کر دیتی ہے۔ دونوں اس پر بات کرتی ہیں۔ مسز شیرازی اسے ان لفظوں کے معنی تلاش کرنے کو کہتی ہیں۔

فارس کے مرحوم بھائی حماد کا یتیم بیٹا اپنے ننھیال میں رہتا ہے۔ فارس اس بچے کو وجدان ہاؤس میں لانے کو تیار نہیں۔

فارس کی تمام تر نفرتوں کے باوجود جنت اس کے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

آئمہ ظہیر فارس کی منہ بولی بہن جنت کو منگنی کی تقریب میں لے جاتی ہیں جہاں کچھ لڑکیوں کے تضحیک آمیز رویے سے جنت دل برداشتہ ہو جاتی ہے۔

فارس کے آفس میں بریان لغاری کا نام سن کر جنت متوحش ہو جاتی ہے۔ اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے۔

جنت عسر یسرا پر غور کرتی ہے اور اس کے کچھ معنی سمجھ جاتی ہے۔

مکمل ناول

pklibrary.com

جنت مسز شیرازی سے ان کے یتیم پوتے سے ملنے کی بات کرتی ہے۔ مسز شیرازی منع کر دیتی ہیں۔
اٹالین ریسٹورنٹ میں ڈنر کے دوران فارس جنت کی طلاق اور ماضی کا ذکر چھیڑ کر جنت کو پریشان کر دیتا ہے۔
جنت فارس کے ساتھ لندن جانا چاہتی ہے تاکہ وہ سائرہ خالہ کی بیٹی سدرہ کی شادی میں شرکت نہ کر سکے۔ فارس اسے ضد میں لاہور لے جاتا ہے۔
سدرہ کی شادی پر فارس کو علم ہوتا ہے کہ جنت کی پہلی شادی تایا کے اکلوتے بیٹے سے ہوئی تھی۔ پانچ سال تک رہی۔ بچہ نہ ہونے پر تایا کے بیٹے نے دوسری شادی کر لی۔ جنت کو اس کے بچے کو نقصان پہنچانے کی پاداش میں طلاق ہو گئی۔
فارس جنت کو وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لندن سے واپسی کے بعد وہ جنت کو لاہور سے لینے آتا ہے۔ جنت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی۔ راستے میں ایکسیڈنٹ ہوتا ہے۔ دونوں محفوظ رہتے ہیں۔ گاڑی کا نقصان ہو جاتا ہے۔
لاہور سے واپسی کے بعد جنت بدل جاتی ہے۔ وہ فارس وجدان کے معاملات میں مداخلت ترک کر دیتی ہے۔
فارس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اسے الرجی ری ایکشن ہوتا ہے۔ بروقت سی پی آر دے کر وہ اس کی جان بچاتی ہے۔ ڈاکٹر بخاری بتاتے ہیں اسے بی سے الرجی ہے جس کا ری ایکشن شدید ہوتا ہے۔
فارس کا بدلتا رویہ جنت کو خوف اور پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔
کراچی جانے سے پہلے فارس سرپرائز کی بات کرتا ہے۔
جنت مسز یزدانی کے نواسے کی سالگرہ پر جاتی ہے جہاں عدینہ زبیر اسے ملتی ہے۔ جو بتاتی ہے کہ وہ فارس وجدان کی پہلی بیوی ہے۔
جنت کی چچی وجدان ہاؤس میں آ کر مسز شیرازی کو جنت کے ماضی سے آگاہ کر دیتی ہے۔ خوف میں آ کر جنت گھر چھوڑ دیتی ہیں۔
جنت کو گھر سے گئے، سات دن ہو چکے تھے۔ فارس بہت پریشان ہے، وہ اس کے سامان کا جائزہ لیتا ہے۔
ایک لکڑی کا باکس کھلنے پر چند خطوط، کچھ تصاویر اور باکس پر بنی نقاشی دیکھنے پر فارس ماضی میں پہنچ جاتا ہے۔
فارس کی ماں آرزو جہانگیر ایک ماڈل گرل ہے۔ وہ اس کے باپ ہارون سے طلاق لے لیتی ہے اور فارس کو ہارون کے پاس چھوڑ جاتی ہے۔
آرزو جہانگیر کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی اور خاندانی بیوی جمیلہ داؤد ہیں۔
ہارون کے باپ اعظم شیرازی بہت بڑے بزنس ٹائیکون ہیں۔ جمیلہ داؤد سے ہارون کا بیٹا حماد اعظم شیرازی کہتے ہیں "میں اس طوائف کے بیٹے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا پوتا صرف حماد ہے۔"
ہارون اعظم شیرازی کی منت سماجت کرتا ہے۔ ان سے معافی مانگتا ہے تو وہ اس شرط پر معافی دیتے ہیں کہ ہارون اپنا بیٹا ان کے حوالے کر دے اور اس سے کوئی تعلق نہ رکھے اور نہ ہی اسے اپنا نام دے۔ اعظم شیرازی جمیلہ داؤد کے خاندان سے خوف زدہ ہیں۔
شیرازی اور لاشاری خاندان کے درمیان جڑنے والا یہ رشتہ ایک بزنس ڈیل کی طرح تھا لیکن جمیلہ ہارون سے محبت کرتی تھیں۔
ہارون فارس کو اعظم شیرازی کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔
ایک رات اسے روتے سسکتے دیکھ کر جمیلہ اسے گلے سے لگا لیتی ہے۔ فارس زخمی ہوتا ہے۔ جمیلہ اسے ڈاکٹر مصطفیٰ کے پاس لے جاتی ہے۔
جمیلہ فارس کو کھلونے، نئے کپڑے لا کر دیتی ہے۔ اس کا کمرہ بھی سیٹ کرتی ہے۔ جمیلہ آرزو جہانگیر سے بھی ملتی ہے لیکن وہ بھی فارس سے ملنے سے انکار کر دیتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ وہ شادی کر رہی ہے۔
جمیلہ فارس کو محبت اور توجہ دیتی ہے۔ وہ بہتر ہونے لگتا ہے لیکن اعظم شیرازی کو یہ گوارا نہیں ہے۔ وہ اسے منع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سے فارس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ حماد کا ایڈمیشن امریکہ میں ہوتا ہے تو اعظم شیرازی جمیلہ کو حماد کے پاس امریکہ بھجوا دیتے ہیں۔

فارس کے لیے جمیلہ داؤد کی جدائی آسان نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اسے پیار سے سمجھاتے ہیں۔

جمیلہ داؤد کے جانے کے فوراً بعد اعظم شیرازی اس کو بورڈنگ بھیج دیتے ہیں، وہ یہ سب برداشت نہیں کر پاتا۔ اس نفسیات پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اس کی کارکردگی صفر ہو جاتی ہے۔ وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ شیرازی مینشن اب کبھی نہیں جائے گا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ، آغا علی کے ساتھ اس سے ملنے آتے ہیں اور ہر ہفتے آتے ہیں۔ وہ ان سے دوستی ختم کرنے کا اعلان کرتا ہے لیکن وہ بضد رہتے ہیں۔ وہ اسے جمیلہ داؤد کی مجبوریاں بتاتے ہیں، ان کے سمجھانے پر وہ اپنے آپ کو تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف کر لیتا ہے اور ہر مقابلے میں پہلی پوزیشن ہوتی تھی۔ اعظم شیرازی جب بھی آتے اس سے حقارت آمیز لہجے میں بات کرتے اس کی ماں آرزو جہانگیر کا تذکرہ ضرور کرتے۔

وہ بیمار ہوتا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ اپنی نواسی کے ساتھ اسے لے آتے ہیں۔ ان کی نواسی ساتھ ہوتی ہے جو پورا راستہ سوال کرتی رہتی ہے۔ وہ فارس سے دوستی کرنا چاہتی ہے، اپنے دوستوں کے ساتھ اس سے ملنے آتی ہے۔

جنت کے جانے کے بعد وہ اس کی کمی محسوس کرنا لگتا ہے۔

ساتویں قسط

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ منظر دھندلا سا تھا۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے پیشانی کو چھوا۔ پھر آنکھوں کو مسلا۔

چند لمحوں کے بعد ہسپتال کا کمرہ مدھم نیلگوں روشنی میں نمایاں ہوا۔ قطرہ قطرہ رگوں میں سرایت کرتی ڈرپ۔ کئی خاموشیاں اور سناٹے لیے بند کھڑکیوں سے جھانکتی اداس شام۔

پلکیں جھپکا کر اس نے گہرا سانس لیا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں جلن تھی۔ سر بھاری تھا۔ سامنے ہی کرسی پر صابرہ بوا تسبیح ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھیں۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئیں۔ کسی قدر کوشش سے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

انہوں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھاما، پیشانی چومی۔ اسے بھینچ کر خود سے لگایا۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں ان کے سینے سے لگی سوچ رہی تھی تو بس یہی کہ وہ یہاں کیوں کر اور کیسے موجود تھی؟

دھند مٹ رہی تھی۔ اندھیرے چھٹ رہے تھے۔ منظر واضح ہو رہا تھا۔

دماغ کی تاریک سرنگوں میں ایک روشنی سی پھیلی۔ مین روڈ پر دوڑتی گاڑیوں کا شور اس کے حواسوں پر چھانے لگا۔ موسلا دھار بارش کے تصور سے وجود ایک بار پھر لرزیدہ ہوا۔

اس نے اسٹور پر کسی لڑکے سے موبائل لے کر سلیم کو فون کیا تھا۔ وہ اسلام آباد میں پوسٹڈ تھا۔ اس کی پکار پر بھاگا چلا آیا تھا۔ وہ پورا دن اس کے گھر اس کی بیوی کے پاس رہی تھی۔ طبیعت پہلے سے خراب تھی اور کچھ بارش کا بھی اثر تھا کہ اسے بخار نے آلیا تھا۔ مگر وہ ان کے بے حد اصرار پر بھی نہ ہاسپٹل جانے کو تیار ہوئی تھی۔ اور نہ ہی کچھ کھانے کو رضامند تھی۔ صورت حال کے پیش نظر سلیم نے صابرہ بوا سے فون پر رابطہ کر کے ان کی ٹکٹ شام تک کروا دی تھی۔

اسے بس کا وہ مشکل ترین سفر یاد آیا۔ تاریکیوں میں گھرا وہ شاق دن یاد آیا۔

انگاروں پر لوٹتا وجود، جلتی ہوئی ویران آنکھیں۔ کپکپاتی انگلیاں۔ روتا تڑپتا دل۔ انگ انگ میں اترتا اضطراب۔

صابرہ بوا کے گھر پہنچنے تک، ان کے سامنے آنے تک اور پھر کسی بے جان وجود کی طرح ان کی

بانہوں میں سمانے تک اسے سب یاد تھا۔

اس کے بعد جب سر چکرایا تھا اور اندھیرے چھائے تھے تو چیخ و پکار سنتے اسے گمان ہوا تو بس اس امر کا کہ اب وہ مرنے والی ہے۔ مگر وہ مری نہیں تھی۔ اس کی سانسیں ہنوز چل رہی تھیں۔ دل ہنوز دھڑک رہا تھا۔ کیفیت یوں ہو رہی تھی جیسے وہ لمبی بیماری سے اٹھی ہو۔

کیا انجام اب کسی نئے آغاز سے جڑ گیا؟

آنکھوں میں کرب لیے اس نے نظر اٹھا کر صابرہ بوا کو دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے لبوں کو جنبش دی۔ آواز حلق سے نہ نکلی۔ آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے۔

صابرہ بوا نے ایک دم سے آب دیدہ ہو کر اس کا زرد چہرہ ہتھیلیوں میں لے لیا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اب وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ سرخ پڑتی خالی ویران آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

سماعت میں پڑتے الفاظ اسے مجسم کرنے لگے، دھڑکن تھمنے لگی۔ تنفس بھاری ہوا۔ آنکھیں پتھرانے لگیں۔

ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کر کے، اسے کندھوں سے تھام کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے وہ اب اسے "رپورٹ" دکھا رہی تھیں۔

دماغ پہلے سے ماؤف تھا۔ حواس شل رہے۔ لفظ عدم اور آواز صامت رہی۔

محرومیوں کے بوجھ تلے فنا ہوتا وجود یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق ہو گیا۔

اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا۔ اس نے اپنا آپ چھڑا لیا۔ وہ گہرے صدمے سے گزر رہی تھی۔ صابرہ بوا کو ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے۔ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔

مگر وہ مذاق تھا، نہ مزاح۔ ایک خبر تھی۔ بشارت تھی۔ انہوں نے رپورٹ سامنے رکھی۔ کہ وہ خود دیکھے۔ خود سمجھے۔ یہ سراب نہیں تھا۔ خواب بھی نہیں تھا۔

اور اس نے دیکھا۔ اپنی ان ویران آنکھوں سے دیکھا۔ پلکیں جھپکا کر اور دھڑکنوں کو تھام کر دیکھا۔

پانچ سالوں تک جو رپورٹ "منفی" تھی وہ "مثبت" ہو کر سامنے تھی۔ پانچ سالوں تک جو محرومی "سائی" تھی وہ "انعام" ہو کر واضح تھی۔

وہ ساکت بیٹھی تھی۔ منجمد۔ بے حس! بے جان۔ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے زندگی کو کھوجے۔ سانسوں کو جوڑتے، ایک بے جان کاغذ کو کپکپاتی انگلیوں میں دباتے۔

"تم بانجھ ہو جنت! اور بانجھ عورت ایک مرد پر بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔"

گلدان ٹوٹ گیا تھا۔ کانچ کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔ وہ ایک مکمل تصویر پرزوں میں بٹ گئی تھی۔

"جنت نہیں۔ جنت میرا بچہ۔"

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

وقت پلٹنے لگا۔ صفحے الٹنے لگا۔ حکایتیں صبح ہو گئیں۔ دن تاریک۔ اور تاریک راتیں صفا ہو گئیں۔

"یہ ایک کاغذی شادی ہے جنت کمال! یہ صرف کاغذ تک محدود رہے گی۔"

"اب تم حق مہر کی رقم اپنے پاس رکھ سکو گی۔"

اس نے پلکیں جھپکائیں۔ سرخ ڈوروں میں کرب ہلکورے لے کر اٹھا، آنسو رواں ہو گئے۔

"کچھ محرومیاں عطا کا ایک روپ ہوتی ہیں جنت! اللہ کی "کن" کی منتظر۔ اپنا روپ بدلنے کو ہر لمحہ مستعد۔ اصل امتحان تو اس مدت کا ہے۔ جو اس محرومی میں گزاری جاتی ہے۔ اس دوران ہمارے صبر کو جانچا جاتا ہے۔ ہمارے شکر کو پرکھا جاتا ہے۔ پھر ایمان کا درجہ متعین ہوتا ہے۔"

"اللہ!" پورے وجود پر ایک لرزہ سا طاری ہوا۔ آنکھوں سے وحشت اتر گئی۔ سانسوں سے وزن

ہٹ گیا۔

"جنہ..... بچے....." صابرہ نے اسے کندھوں سے تھاما ہوا تھا۔ وہ اسے پکار رہی تھیں۔ مگر وہ ان کی سن نہیں رہی تھی۔

"مانگتی رہو اور دیکھتی جاؤ اللہ کی مرضی سے تمہاری جھولی میں کیا گرتا ہے، جو گرے اسے بخوشی اپنا لو، خواہ وہ نقطے جتنی خوشی یا ذرے جتنی برکت ہی کیوں نہ ہو۔" پردوں کی درز سے جھانکتی سورج کی تیز روشنی۔ مسز شیرازی کا مسکراتا چہرہ۔ بے شمار کلر ٹیوبز۔ کینوس۔ اور پینٹنگ۔ جنہ کی پینٹنگ۔ عسر یسرا کی پینٹنگ۔

"ہر عسر کے ساتھ یسرا ہے! اور یہ یسرا کیا ہے اگلی بار میں اس کا جواب دوں گی آپ کو۔"

یکا یک منظر بدلا تھا۔

"تمہاری فارس سے شادی میری وجہ سے نہیں ہوئی ہے، نہ ہی تمہاری خالہ کی وجہ سے..... یہ تمہارا نصیب ہے جو تمہیں یہاں لایا ہے۔"

نصیب! نصیب! ہر طرف ایک ہی گونج تھی۔ ایک ہی صدا۔ اس ایک لفظ نے اسے کتنا ڈرایا تھا۔ کتنا رلایا تھا۔ آن کی آن میں اب۔ کتنا معتبر۔ کتنا منفرد، کتنا بدیع (انوکھا) ہو گیا تھا۔

"جس وقت منفی سوچ جڑ پکڑے۔ اور مایوسی انتہا کی گہری ہو جائے تو سمجھ جاؤ۔ یہ شیطان کا آخری وار ہے۔ ٹھیک اس وقت پڑ رہا ہے جب وہ تمہارے "انعام" سے واقف ہو چکا ہے۔"

اور اس کا انعام کیا ہو سکتا تھا؟ اس نے تب بھی سوچا تھا۔ وہ اب بھی سوچ رہی تھی۔ اس وقت ایک لمحے کے لیے بھی یہ انعام اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ بالکل نہیں آ رہا تھا۔

"جنہ! بچے۔"

اس نے سر اٹھا کر روتی سسکتی نگاہوں سے صابرہ بوا کو دیکھا۔ یقین اور بے یقینی کے عالم میں۔ اندر ہی اندر ٹوٹتے بکھرتے ہوئے۔ خود اذیتی کی دلدل میں اترتے ہوئے۔ بار بار تاریک رات کا منظر آنکھوں آ رہا تھا۔ اپنا فیصلہ یاد آ رہا تھا۔ موت اور اس کے درمیان ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ چند لمحوں کی مسافت تھی۔

وہ خودکشی کرنے والی تھی۔ اپنی جان لینے والی تھی۔ اسے وہ آخری لمحہ یاد آیا۔ وہ آخری پل۔ جب فٹ پاتھ سے آگے سڑک پر قدم جماتے وہ ٹھہر گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی تو نہیں ہل سکی تھی۔ اسے نانا ابو یاد آئے تھے۔ ان سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا تھا۔

اذیت بھری زندگی تو گزار رہی تھی۔ آخرت برباد کرنے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔

اور وہ لمحہ ٹھہر گیا۔ وہ لمحہ رہ گیا۔

پوری دنیا میں خود کو تنہا تصور کرنے والی جنت کمال۔ اس لمحے "تنہا" نہیں تھی۔

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ صابرہ بوا نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ ان کے سینے میں سر دیے وہ چھوٹے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ساری محرومیاں، ساری اذیتیں، سارے کے سارے غم یکا یک عدم ہوئے۔ وہ ایک عطا۔ ہر مصیبت پر بھاری ہو گئی۔ وہ ایک انعام ہر درد کو فنا کر گیا۔

"دعائیں رد نہیں ہوتیں جنت!! محفوظ کر لی جاتی ہیں، جو آپ مانگ رہے ہوں وہ نہ ملے تب بھی۔ آپ کے ہاتھ خالی نہیں لوٹائے جاتے! اللہ ہمیشہ بڑھ کر عطا کرتا ہے، وہ آپ کو حیران کر دیتا ہے۔"

اور اس کے خدا نے اسے حیران کر دیا تھا۔

☆☆☆

"جنت کے شوہر نے بتایا نہیں اس نے گھر کیوں چھوڑا؟"

سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے ہوئے آواز سماعت سے ٹکرائی تو عمار اپنی جگہ تھم کر رہ گیا۔ بے ساختہ گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر آہستگی سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ ڈرائنگ روم کی نشستوں

پر خاندان کے بڑے سب براجمان تھے۔ سائرہ سامنے ہی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ جنت کے چچا، چچی، پھپھی، چھوٹی چچی وغیرہ سب موجود تھے۔

"کسی کے ساتھ کوئی چکر تو نہیں چل رہا تھا اس کا؟" کریمہ آنٹی اس کے باپ سے کہہ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ ساکت سا انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ وہ جنت کی نگی پھپھو تھیں۔

مجلس میں جنت کا کردار ڈسکس ہو رہا تھا۔ خاندان بھر میں طرح طرح کی باتیں پھیل گئی تھیں۔ اور طرح طرح کی پھیلی ہوئی ان باتوں کی تصدیق کے لیے ہی وہ لوگ یہاں جمع ہوئے تھے۔ کسی کو یہ خبر ملی تھی کہ وہ گھر کے کسی ملازم کے ساتھ بھاگی تھی اور کسی نے یہ سنا تھا کہ فارس وجدان کے کسی دوست کے ساتھ اس کا چکر چل رہا تھا تب ہی اسے گھر سے نکال دیا گیا۔

وہ اپنی جگہ ساکت سا، پتھرایا ہوا کھڑا تھا۔ کوئی اتنا بے حس، اتنا بے رحم کیسے ہو سکتا ہے؟ گردن موڑ کر اس نے حفصہ آپی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے شرمندہ سی بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ نہ جواب دینے کی ہمت تھی۔ نہ صفائی پیش کرنے کی سکت۔ جنت کمال ایک بار پھر ان کی ذاتی زندگیوں میں بھونچال لے آئی تھی۔ ایک بار پھر ان کی فیملی زبان زد عام آ گئی تھی۔ کمال کی بیٹی۔ کمال کی بیٹی۔ اب سب کہہ رہے تھے۔ اور وہ خاموش تھیں۔ ہمیشہ کی طرح۔ آج بھی ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

"حیرت ہے کسی نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ جنت نے اپنا گھر فائزہ آنٹی کی وجہ سے چھوڑا ہے جنہوں نے اس کے گھر جا کر اچھا خاصا تماشا کری ایٹ کیا۔" وہ اندر داخل ہوتے ہی بول پڑا تھا۔

"ہاں تو حرکتیں ہی اس کی ایسی تھیں، منہ دکھانے کے قابل جو نہیں رہی ہوگی۔" کریمہ آنٹی نے فوراً سے پینترا بدلا۔

"حرکتیں؟ کیسی تھیں اس کی حرکتیں؟" وہ آنکھوں میں غصہ لیے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"ایسی فتنہ پرور لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ پہلے اپنے بھائی کی جان لی، پھر ہمارے بھائی کا سر کھایا۔ برہان کی زندگی جہنم بنائے رکھی۔ ذرا پوچھو تو عالیہ سے۔ کیسے دن بھر فون سے چپکی رہتی تھی۔ عشق معشوقے سے فرصت ملتی تو گھر سنبھالتی۔ ایک تو بانجھ۔" انہوں نے حقارت سے سر اٹھایا۔ "اور اوپر سے ڈھٹائی الگ۔ ماہین کا بچہ مارنے کی کوشش تک کر ڈالی۔ نفیسہ بہن تو اس کی موت مارتی۔ میں بیچ میں نہ آتی۔ میں نے تو سجاد سے کہہ دیا تھا، غیروں کے لائق نہیں ہے یہ۔ اپنے زمان سے نکاح کر دو، وہی اسے سیدھا رکھے گا مگر نہیں۔"

وہ غصے اور حقارت سے بہت سی باتیں۔ بہت سے قصے۔ بہت سے واقعات سناتی جا رہی تھیں۔ اور کوئی بھی انہیں ٹوک نہیں رہا تھا۔

یہ سب ایسے ہی تھا۔ یہ سب شروع سے ایسے ہی چلتا آ رہا تھا۔

"بس کر دیں آنٹی فار گاڈ سیک۔" وہ سارا لحاظ اور مروت بالائے طاق رکھتے ہوئے چیخ پڑا۔

"ابراہیم صاحب! آپ کا بیٹا تو پورا باؤلا ہو گیا ہے، نہ چھوٹے بڑے کی تمیز ہے نہ لحاظ کر رہا ہے کسی کا۔"

ابراہیم صاحب نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے بڑوں کی محفل سے چلے جانے کا حکم دیا تھا مگر آج اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ نہ سائرہ۔ نہ ابراہیم۔ اور نہ خاندان کا کوئی فرد۔

"اگر پاگل کہہ ہی دیا ہے آپ نے مجھے۔ تو پھر میرے پورے پاگل پن کا مظاہرہ بھی دیکھ لیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے ہم کل کے بچے۔ بے وقوف اور ناسمجھ ہیں؟ ہمیں کچھ نظر نہیں آتا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟ نفیسہ آنٹی جنت کی وجہ سے نہیں۔ آپ سب کی وجہ سے مری ہیں۔" اس نے انگلی اٹھا کر سب کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "انہیں بیٹیوں کے طعنہ دینے والے آپ لوگ تھے۔ ان پر طنز و تشنیع کرنے والے آپ لوگ تھے۔ ان کی محرومی کا آپ لوگوں نے

pklibrary.com

سرعام مذاق اڑایا۔ انہیں ذہنی مریض بنا دیا۔ ذرا محاسبہ کرتے ہیں آنٹی۔ مجھے بتایئے صبا آپی نے حال ہی میں چوتھی بیٹی کو جنم دیا ہے۔ دن رات سسرالیوں کے طعنے سن رہی ہیں نا وہ۔ وہی لفظ جو کبھی آپ نے نفیسہ آنٹی کو سنائے تھے؟''

کریمہ آنٹی کے چہرے پر تاریک سایا لہرا گیا۔

''آپ کی اپنی اولاد آپ کے غرور اور تکبر کا خمیازہ بھگت رہی ہے اور آپ میں اب بھی جرأت باقی ہے کہ..... آپ اسی عورت کی بیٹی کو ایک بار پھر نشانہ بنا رہی ہیں؟''

ڈرائنگ روم میں خاموشی تھی۔ اب تو جیسے کوئی سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔

"روحینہ چچی کو ناز تھا وہ چار بیٹوں کی ماں ہیں۔ چار شیر جوان ان کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی نسلیں آگے چلیں گی۔ نفیسہ آنٹی ان کے سامنے سات بیٹیوں کی ماں۔ کوئی حقیر سی مخلوق تھیں۔ اور آج۔ ان کے وہ تمام کے تمام بیٹے۔ صرف "بیٹیوں'' کے باپ ہیں۔'' اس نے رخ بدل کر انہیں دیکھا۔ ''آپ اب اس بات کو زیر بحث کیوں نہیں لاتیں؟ سات بیٹیوں کی ماں ہونا نفیسہ آنٹی کا قصور تھا۔ اب اتنی ساری پوتیوں کی دادی ہونا کس کا قصور ہے؟''

اور روحینہ چچی کو یوں لگا تھا جیسے بھرے بازار میں کسی نے طمانچہ دے مارا ہو۔ سائرہ نے پہلی بار اپنے بیٹے کو نہیں ٹوکا تھا۔ حفصہ آنکھوں میں حیرت صدمہ لیے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"میں حیران ہوں، آپ لوگوں میں ابھی بھی ہمت ہے اس طرح اس عورت کی اولاد پر زبان درازی کرنے کی جس کی زندگی آپ لوگوں نے خود جہنم بنائی۔ اور اتنی بے حسی کہ ذرا فرق نہیں پڑا۔ اللہ تو اپنا حساب لے رہا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ سب اپنے حساب سے۔ اس طرح بے خبر رہیں؟ آپ لوگوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں تو اس کا مطلب ہے ہمیں بھی کچھ نظر نہیں آتا ہوگا؟''

ڈرائنگ روم میں اتنا سناٹا چھا گیا تھا کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی بھی آواز آتی۔ کسی بھی بڑے فرد کی سکت نہیں رہی تھی کچھ بھی بولنے کی۔ وہ سب جنت کے معاملے میں اکھٹے ہوئے تھے۔ اور عمار نے تو جیسے ان سب کے اجتماع کو نشانہ بنا کر سب کی حقیقتیں ان کے منہ پر دے ماری تھیں۔

وہ شدید غصے کے عالم میں بپھرا ہوا سا کھڑا تھا۔

"جنت کبھی اپنی اولاد کے لیے درباروں مزاروں پر نہیں گئی۔ اور آپ لوگ کہتے ہیں ماہین کا بچہ ضائع کرنے کے لیے اس نے تعویذ گنڈے کروائے ہیں؟''

وہ سراپا سوال بنا ان سب کو دیکھے جا رہا تھا۔

''اب برجان کے گھر جو بھی نقصان ہوگا تو اس کا الزام ساری عمر جنت کے سر ڈالتے رہیں گے آپ لوگ؟ جب اسے اپنی زندگی سے، خاندان سے بے دخل کر چکے ہیں تو پھر اسے ڈسکس کرنے کا مقصد؟ فائزہ چچی کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا اس طرح اس کے گھر جا کر، اس کے سسرالیوں کے سامنے بے عزت کرنے کا۔ اور خدا کے لیے۔'' اس نے ہاتھ جوڑے۔ ''اب بخش دیں جنت کو!''

بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس نے ختم کر دی۔ عکس ادھورے تھے۔ اور اس نے ادھورے رہنے دیے۔ آئینہ مکمل اور سلامت تھا۔ حقیقتیں بھی اتنی ہی تلخ اور نمایاں۔

جو خاموشی اس کی موجودگی میں چھائی ہوئی تھی، وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی ٹھہری رہی۔ کسی میں ہمت نہ رہی تھی مزید کوئی بات یا بحث کر سکے۔ کوئی دلیل دے سکے۔ یا کچھ تردید کر سکے۔

وہ مجلس، وہ اجتماع سب کا احتساب ہو گیا تھا۔ آئینے میں ہر کسی کا کریہہ چہرہ واضح تھا۔ اور اس چہرے سے تقریباً سب نے نظریں چرائی تھیں۔ کہ حقیقت کا سامنا تو پھر وہ لوگ کرتے ہیں جو خود کو بدلنا

pklibrary.com

چاہتے ہوں۔
ایک ایک کر کے سب اٹھتے چلے گئے۔ صرف حفصہ کمال ہی تھی جو اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ تین دن ہسپتال میں رہی۔ طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ صابرہ بوا اسے اپنے گھر لے آئیں۔ ان کا الگ پورشن تھا۔ وہ بیرونی دروازے سے ان کے ہمراہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی تھی۔ بیماری کا اثر ہنوز تھا۔ کمزوری اتنی ہو گئی تھی کہ ذرا سی سیڑھیاں چڑھنے پر اس کا سانس پھول گیا تھا۔

اوپر ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ بوا اسے کمرے میں لے آئیں۔

ہوادار لمبی کھڑکیاں جو پیچھے سرسبز کھیتوں کی طرف کھلتی تھیں۔ اور سامنے والی کھڑکیوں سے نیچے صحن کا پورا منظر نظر آتا تھا۔ جامن کا پھیلا ہوا درخت۔ سائے میں بچھی ہوئی چارپائی۔ سرخ اینٹوں کا پکا صحن۔ سفید دیواروں پر سرسبز بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ آہنی گیٹ بند تھا۔ نیچے تین کمرے تھے۔ کچن تھا۔ مردوں کے لیے الگ سے بیٹھک سامنے ہی بنی ہوئی تھی جس کا ایک دروازہ باہر سے کھلتا تھا۔

صابرہ بوا کی بھانجی نیچے مقیم تھی۔ اوپر کا کمرہ، واش روم اور چھوٹا سا کچن ان کے حوالے تھا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی نیچے دیکھنے لگی۔

بچوں کے شور کے ساتھ صندل آپا کی آواز واضح تھی۔ ان کا نو سالہ بیٹا پائپ ہاتھ میں پکڑے درختوں کو پانی دیتا اس کا رخ اپنی چھوٹی بہن کی طرف موڑ چکا تھا۔ اور اس شدید گرمی میں ٹھنڈک کے احساس سے خوش ہونے کے بجائے وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگی تھی۔

"علی۔" صندل آپا نے کچن سے ہی اسے کڑی نظروں سے دیکھا تھا۔ اور اس نے وہیں پائپ سر پر کیے خود کو مکمل بھگو لیا۔

"ایک تو گرمی میں کام کرواتی ہیں۔ اوپر سے ڈانٹتی بھی ہیں۔"

"یہ درختوں کو ذرا سا پانی دینے سے تمہاری کمر ٹوٹتی ہے؟"

"ذرا سا پانی دیتا ہوں؟" آنکھیں پھیلا کر وہ اپنی ماں کی طرف مڑا۔

"ابھی کہیں گی، پورے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرو۔ پھر یہاں سے ساری چارپائیاں اٹھوا کر وہاں رکھوائیں گی۔ اس کے بعد باہر بھیجیں گی۔ علی یہ لے آؤ۔ علی وہ لے آؤ۔ علی یہ کام کرو۔ علی وہ کام کرو۔"

شلوار اور بنیان میں وہ دھوپ میں کملایا ہوا سا کھڑا تھا۔ جنت کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری۔ صندل آپا اس سے ہسپتال میں ملنے آئی تھیں تو ان کے ساتھ وہ بھی تھا۔

"اللہ معاف کرے۔ کب تم سے چارپائیاں اٹھواتی ہوں میں؟"

"اس دن نہیں اٹھوائی تھیں جب یاور چاچو آئے تھے؟ یہاں رکھو۔ وہاں رکھو۔ اب وہاں رکھو۔"

"ایک ہی تو چارپائی تھی۔ وہ بھی فاطمہ کی۔ حد ہے۔ طعنے سن لو موصوف سے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ موٹر بند کر کے کچن کا رخ کیا تو وہ مکمل بھیگا ہوا کمر پر ہاتھ ٹکائے کھڑا تھا۔ دھوپ میں آنکھیں چندھیا کر یہاں وہاں دیکھتا۔ چھوٹی بہن اپنا منہ خشک کرتی، جامن کے ساتھ بندھے جھولے پر ٹک گئی تھی۔

اب وہ بہن کے سر پر کھڑا تھا۔ اور اسے جھولا چھوڑنے کا کہہ رہا تھا۔ بہن نے رسیوں پر گرفت جما کر نفی میں زور و شور سے سر ہلایا اور ایک بار پھر چلائی۔

"اماں۔"

"علی! مت تنگ کرو اسے۔" صندل آپا جھنجھلائیں۔

"اے ہے لڑکے! دو گھڑی سکون سے بیٹھ جا کہیں۔" صابرہ بوا کمرے سے باہر نکل کر سیڑھیوں

122

کی طرف جاتے ہوئے بولی تھیں۔ وہ پھر سے بگڑ گیا۔ دھپ دھپ پاؤں اٹھاتا آہنی گیٹ دھکیل کر باہر نکل گیا۔

پھر اسے آنگن میں دو سالہ بچی نظر آئی۔ فیڈر ہاتھ میں لیے وہ جھولا جھولتی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد کسی کونے سے تیسری بچی نمودار ہوئی۔ تقریباً چھ سال عمر ہوگی۔ ایک ہاتھ میں کاپی اور دوسرے ہاتھ میں پنسل لیے۔ سائے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرنے لگی۔

"یہ میں صندل کا سوٹ لے آئی ہوں۔ یہی پہن لو۔ کل بازار جاؤں گی تو گرمیوں کے سوٹ لے آؤں گی۔" بوا اندر داخل ہوتے ہی بولی تھیں۔ وہ مڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

الماری کھول کر انہوں نے ایک سوٹ اندر لٹکا دیا۔ اور دوسرا بیڈ پر رکھ دیا تھا۔

"نہا کر کپڑے بدل لو۔ میں تب تک کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔ صندل تو کہہ رہی ہے، آلو گوشت پکائے گی۔ میرا ارادہ ہے، ساتھ میں بریانی بنا لیتے ہیں۔ تمہیں ویسے بھی بریانی بہت پسند ہے۔" تیزی سے بیڈ شیٹ بدلتے ہوئے انہوں نے کہا اور جنت گم صم انہیں دیکھتی رہی۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے، خوراک کا بہت خیال رکھنا ہے۔ بالکل کمی نہیں ہونی چاہیے۔ اور تم تو ہو ہی سدا کی لاپروا۔ سب کچھ مجھے ہی دیکھنا ہوگا۔" ان کے لہجے اور انداز سے پیار، خفگی، تنبیہ خوشی نمایاں تھی۔ بات کرتے ہوئے وہ اشتیاق میں آجاتیں۔ کچھ سوچ کر بے ساختہ مسکرانے لگتیں۔ "ڈاکٹر صاب زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔"

"میرے لیے اتنا اہتمام نہ کریں۔" اس کے لب ہلے۔

بوا نے اب کے اسے ذرا خفگی سے دیکھا تھا۔

"کیوں اہتمام نہ کریں؟ میں تو کوئی کمی نہیں ہونے دوں گی۔ سلیم کو بتایا تو کہہ رہا تھا، پیسے بھیج دے گا۔ مجھے خاص تاکید کی جنت کا خیال رکھیے گا۔ کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ پھل فروٹ، سبزیاں۔ اب کل عامر سے کہہ کر منگواؤں گی سب۔"

وہ جیسے خود سے سب طے کر رہی تھیں۔ اسے اپنی ذمہ داری سمجھ کر۔ اس کے لیے ہر فیصلہ خود کر رہی تھیں۔

"میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتی بوا!" جو بات دل میں تھی۔ وہ لبوں پر آگئی۔

"چپ۔ ایک لفظ نہیں۔" انہوں نے جھڑک دیا۔ "یہ تیرا گھر ہے، تو میری بیٹی ہے، میں وہ دن کیسے بھول سکتی ہوں جب ڈاکٹر صاب نے مجھے اور سلیم کو اپنے گھر پناہ دی تھی۔ جب ہم بے سہارا تھے تو وہ ہمارا سہارا بنے۔ سلیم کو اس کے پیروں پر کھڑا کیا، اس کے سارے اخراجات خود اٹھائے۔ اور اب جب ان کی بیٹی پر وقت آیا ہے تو میں منہ موڑ لوں گی؟"

انہوں نے بہت محبت سے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ وہ نچلا لب دانتوں تلے دبائے رونے پر قابو پاتی رہی۔

"چل جلدی سے فریش ہو جا پھر کھانا بھی کھانا ہے۔"

وہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئی۔ شاور چلتا رہا تو آنسو بھی بہتے رہے۔ اپنی حالت سوچ سوچ کر اذیت بڑھتی رہی۔

کپڑے بدل کر وہ تولیے سے بال خشک کرتی باہر آئی تو دروازے کی درز سے جھانکتا سر یکا یک غائب ہوا۔

وہ علی تھا۔ یقیناً علی تھا۔ دروازہ کھول کر باہر آئی تو وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔

اس نے ظہر کی نماز پڑھی پھر کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر بال اچھی طرح خشک کیے۔ کنگھی کی۔ کچھ ہی دیر بعد بوا ٹرے ہاتھوں میں لیے اندر آگئی تھیں۔ ساتھ ہی صندل آپا بھی تھیں۔ دو سالہ بیٹی کو اٹھائے وہ اس سے بہت محبت سے ملیں۔

کھانا انہوں نے وہیں اکٹھے کھایا۔ یہ الگ

بات تھی کہ ان کی محبت اور اخلاق کے آگے وہ بار بار آنکھوں میں ابھرتی نمی کو پیچھے دھکیل رہی تھی۔

بمشکل آدھی روٹی اور بریانی کے کچھ چمچ لینے کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بوا اسے پیار بھری خفگی سے دیکھ کر رہ گئیں۔ ''ختم کرو اسے شاباش۔''

"بھوک نہیں ہے بوا!"

"اب تمہیں صرف اپنی بھوک کی فکر تھوڑی کرنی ہوگی۔" صندل آپا ہنسیں۔ وہ خفیف سا ہو کر سر جھکا گئی۔ اسے بہت سارا رونا آرہا تھا۔ شاید بیماری کا اثر زائل نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت حساس ہو رہی تھی۔

"بعد میں کھالوں گی بوا۔ ابھی اتنا ہی۔"

بوا نے مزید اصرار نہ کیا۔ میڈیسن لینے کے بعد وہ تیز پنکھا چلائے سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ بوا اس کی طرف سے تسلی کر کے نیچے چلی گئیں۔

صحن میں ایک بار پھر صندل آپا اور علی کی تکرار شروع ہو چکی تھی۔ مگر آواز مدھم تھی۔ اور کچھ دیر میں مدھم سے بالکل ختم ہو گئی تھی

☆☆☆

دیوار گیر کھڑکیوں سے پوری تاریخ کا چاند نظر آرہا تھا۔ پردے بندھے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔

کمرے میں ہر طرف اور ہر جگہ بے ترتیبی سی تھی۔ خود وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ پیچھے کی طرف سر گرائے۔ بازو پھیلائے۔ چھت پر کچھ دیکھتے۔ یادداشت کے کسی کونے میں کچھ کھوجتے۔ سکون اندر باہر اور آس پاس کہیں نہ تھا۔ راتوں کی نیند تو ویسے بھی اڑی ہوئی تھی۔ بھوک ختم۔ طلب تمام۔

سماعتیں فون پر ٹھہری تھیں۔ منتظر نگاہیں، اسکرین کو تکتی تھیں۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ کوشش تھی اور ناامیدی تھی۔

پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھا تھا۔ کافی کا خالی کپ اور نیند کی گولیاں بھی۔

اس نے اپنی آنکھوں کو مسل ڈالا۔

دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ ملازمہ ایک بار پھر اسے مسز شیرازی کا پیغام دینے آئی تھی۔ اس نے جواب دیا، نہ اٹھ کر نیچے گیا۔ قدموں کی چاپ ابھری۔ راہداری میں خاموشی چھا گئی۔

کچھ ہی دیر میں جنت کا موبائل بج اٹھا۔ مسز آفاق کے نمبر سے سات سالہ زید کے میسجز آنے لگے۔ وہ اپنی ممی کے ساتھ شاپنگ کر رہا تھا۔ اور اس نے جنت کے لیے ایک انگوٹھی رنگ بھی پسند کر لی تھی۔

ہر تھوڑی دیر بعد وہ اپنی ماں کے موبائل سے اپنی سیلفی بھیج دیتا۔ کہیں پر ہنستے۔ کہیں پر مسکراتے۔ کہیں پر سوزی کو گلے لگاتے ہوئے۔

اب کی بار نوٹیفکیشن میں دو تصویریں نظر آئیں۔ وہ جنت سے پوچھ رہا تھا ان دونوں میں سے کس رنگ کی انگوٹھی زیادہ پیاری ہے۔ فارس نے موبائل اٹھا کر تصویر دیکھی۔ اسے دونوں پسند نہیں آئیں۔

"وچ ون؟" جنت کا فیانسی پوچھ رہا تھا۔ اور شوہر لب بھینچ کر میسجز دیکھ رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد دو اور تصویریں بھیجی گئیں۔ بچوں کی کھلونا دکانوں میں نقلی میک اپ کٹس کے ہمراہ پلاسٹک جیولری سے منتخب کی جانے والی ایک ٹافی جتنی انگوٹھی۔

اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی گلابی رنگ کی انگوٹھی کو ڈن کر دیا۔ خیال تھا اب میسجز نہیں آئیں گے۔ میسج نہیں آئے۔ ریکارڈنگ آگئی۔

"زویا سے السلام وعلیکم ٹو یور فیوچر بھابھی!" وہ اپنی تین سالہ بہن کو سکھا رہا تھا۔ بہن کے حلق سے ہلکی سی اور کیوٹ سی آواز ابھری۔ ''اشا میکم بابی!''

یہ دونوں بچے پچھلے کئی دنوں سے اس کا دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ اس نے موبائل سائلنٹ کر کے خود سے پرے رکھ دیا۔ پانی کے ساتھ نیند کی گولی لینے کے بعد ایک بار پھر سونے کی کوشش کی۔

اندر کا اضطراب بڑھ گیا۔ شور بڑھ گیا۔ درد بڑھ گیا۔

pklibrary.com

دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ وہ سنی ان سنی کیے پڑا رہا۔

☆☆☆

وہ بیڈ سے ٹیک لگائے کارپٹ پر دو زانو بیٹھی تھی۔ چہرہ زرد تھا، آنکھیں سرخ اور بے تحاشا نم ہو رہی تھیں۔

زرکار روشنی میں کرب نمایاں تھا۔ تنہائی میں وہ سراپا غم ہوئی خالی ویران آنکھوں سے اندھیرے میں دیکھ رہی تھی۔

پانی کا گلاس پاس رکھا تھا۔ صرف دو گھونٹ لیے گئے تھے۔ زندگی اور نصیب کی دہشت ویسی ہی تھی۔ خوف وہیں ٹھہرا تھا۔ سانسیں وہیں اٹکی تھیں۔

رات کے آخری پہر بہت اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب تب سے وہ اسی حالت اور اسی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت سی باتیں تھیں جو یاد آ رہی تھیں۔ بہت سی حکایتیں تھیں جو واضح ہو رہی تھیں۔ بہت سے خیال، وسوسے، اندیشے۔ رہ رہ کر سر اٹھا رہے تھے۔ دل تڑپ رہا تھا۔ آنسو بہتے جا رہے تھے۔ اسے مسز شیرازی بہت شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ انہیں کھو دینے کا غم تڑپائے جا رہا تھا۔

اس نے وعدہ کیا تھا، وہ انہیں ان کے پوتے سے ضرور ملوائے گی اور یہ وعدہ اس گھر کی دہلیز پار کرتے ہی فنا ہو گیا تھا۔ سارے رشتے، سارے تعلق وہیں رہ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے چھوڑتیں، وہ خود انہیں چھوڑ آئی تھی۔ مگر دل وہیں رہ گیا تھا۔ روح یہاں بھٹک رہی تھی۔

محبت کو نفرت میں بدلتے وہ دیکھ چکی تھی۔ دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس اذیت سے دوبارہ گزرنے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔ اور اسے غم تھا۔ اور بہت بڑا غم تھا کہ وہ ان کی محبت سے محروم کر دی گئی تھی۔

مسز شیرازی اب ہاتھ اٹھاتی ہوں گی تو اس کا نام نہیں لیتی ہوں گی۔ اسے سوچ کر انہیں کراہت آتی ہوگی۔ وہ اس کے وجود سے نفرت کھاتی ہوں گی۔ کم الزام نہیں تھے جو فائزہ چچی نے اس کی ذات پر لگائے تھے۔ کسی گناہ، کسی غلطی، کسی جرم کا پردہ نہیں رکھا تھا انہوں نے۔ سب اگل دیا تھا۔ سب کہہ دیا تھا۔

کمرے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔ پنکھا بھی چل رہا تھا۔ موسم ٹھنڈا تھا اور اسے پھر بھی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

"ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے۔ کراچی سے آؤں گا تب۔"

حکایت لکھی جا چکی تھی۔ انجام سوچا جا چکا تھا۔ اور اسے پھر بھی رونا آ رہا تھا۔ یہ جدائی۔ یہ فاصلے۔ یہ سزا تو روز اول سے طے تھی۔ وہ ہر حقیقت کو تسلیم کر چکی تھی۔ ساتھ رہنے کی خواہش بدل چکی تھی۔ اس نے خواب نوچ کر پھینک دیے تھے۔ انتظار سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔ احساسات کو منجمد۔ اور جذبات کو فنا کر کے اس نے خود کو عدم کی وادیوں میں دفنا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا، ایسے درد کم ہوگا، دکھ کم ہوگا، رونا کم آئے گا۔

مگر اس کا خود ساختہ ڈیفنس میکینزم خسارے میں گیا تھا۔ اسے تکلیف زیادہ ہوئی تھی۔ اسے رونا زیادہ آ رہا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ وہ جل رہی تھی۔

"مجھے طلاق فوری چاہیے ہوگی۔ تمہیں ابھی سے ڈاکومنٹس کا انتظام کر لینا چاہیے تاکہ مناسب وقت پر بنا کسی تاخیر کے سائن کر کے ایک دوسرے سے جان خلاصی کی جا سکے! لیکن اگر کچھ وجوہات کی بنا پر۔ مجھے قبل از وقت یہ گھر چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ اور اس دوران میرا تم سے فی الفور رابطہ بھی ممکن نہیں ہو پاتا تو میں ایک ماہ تک کی مدت کو ذہن میں رکھوں گی اور اس کے بعد سمجھ جاؤں گی کہ مجھے طلاق ہو چکی ہے۔ سو تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ مجھے اس ایک ماہ کے اندر اندر طلاق ہو جانی چاہیے۔"

دو ہفتے گزر چکے تھے۔ تیسرا ہفتہ گزرنے والا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ایک بار پھر بے دردی سے رگڑ ڈالا۔ اب تک وہ یقیناً اسے طلاق دے چکا

pklibrary.com

ہوگا۔ عدینہ زبیر اس کی زندگی میں واپس آ چکی ہوگی۔ نفرتوں کے بادل چھٹ گئے ہوں گے۔ محبتوں کا نور پھیل گیا ہوگا۔ جو اس کے ساتھ ہوتے ہوئے ادھورا تھا، وہ من چاہے ساتھی کے ساتھ مکمل ہو گیا ہوگا۔ اس کی زندگی میں جنت کمال کی جگہ پہلے بھی نہیں تھی، اب بھی نہیں رہی ہوگی۔ گال صاف کر کے وہ اٹھ گئی۔ وضو کر کے جائے نماز بچھائے قبلہ رخ کھڑی ہوگئی۔

سجدوں میں وہ روتی رہی تھی۔ اور کچھ سجدوں میں ہمت اور آسانیاں مانگتی رہی تھی۔ اسے یہاں۔ اس نئی جگہ پر۔ اک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ وہ اپنا ماضی بھلا دینا چاہتی تھی۔

اور باہر دروازے کے پاس کھڑی صابرہ بوا آنکھوں میں رحم اور ہمدردی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

اقصیٰ نے ذرا دور سے ہی فارس کو دیکھا۔ کچن کاؤنٹر ٹیبل کے اس پار سیاہ ٹراؤزر پر فل سلیو سفید شرٹ میں ملبوس اپنے لیے قہوہ بنا رہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا، ماتھے پر بے ترتیبی سے بکھرے بال آنکھوں پر آ رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے پٹھانی نے کہا تھا، اسے صاحب بلا رہے ہیں۔ تب سے ہی وہ فکر میں تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ذہن دوڑا کر خود سے سرزد ہونے والی کسی ممکنہ غلطی یا کوتاہی کو یاد کرنا چاہا مگر ذہن ماؤف ہی رہا۔

بمشکل گلا کھنکھارتے ہوئے اس نے فارس وجدان کو اپنی موجودگی کا سگنل دینا چاہا۔ ساتھ ہی دوپٹے کو انگلیوں میں ڈال کر بے چینی سے گھمایا جا رہا تھا۔ ”آپ نے بلایا مجھے؟“

قہوہ کپ میں انڈیل کر وہ اس کی طرف مڑا۔ ”بیٹھو۔“

”جی؟“

گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے سامنے اسٹول چیئر کی طرف اشارہ کر دیا۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی وہ بیٹھ گئی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ذرا سی نگاہیں اٹھا کر اپنے صاحب کو دیکھنا چاہا۔

لاپروا سا حلیہ۔ بے خوابی کا شکار سرخ آنکھیں۔ بڑھی ہوئی شیو۔ زرد چہرہ۔ اس کی جنت آپی کی غیر موجودگی میں صاحب ”ایسے“ ہو گئے تھے۔

”پچھلے ماہ جنت تمہیں ساتھ لیے کافی گھومتی پھرتی رہی ہے۔“

”جی صاحب!“ پھانس کی طرح کوئی شے اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی۔ گزشتہ ایک ماہ کی روٹین ذہن میں دوڑ گئی۔ جنت کی باتیں، وعدے، ڈانٹ اور تنبیہہ سب یاد آ گیا۔

”ڈرائیور بتا رہا تھا، اس نے ایک بار جنت کے کہنے پر کسی رہائشی کالونی میں اسے اتارا تھا۔ تم بھی ساتھ تھیں۔ پھر واپسی پر وہیں سے چار گھنٹوں کے بعد پک کیا تھا۔“

اقصیٰ کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آیا۔ اقرار کرے یا انکار!

”کہاں گئی تھیں تم دونوں؟“

کچھ بتاتے بتاتے اس نے یکا یک نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔ ”جی..... وہ..... شاپنگ پر گئے تھے۔“

”رہائشی کالونی کی تنگ گلیوں میں شاپنگ ہو رہی تھی؟“

فارس نے بھاپ اڑاتا کپ رکھ دیا۔ اقصیٰ جی بھر کر پریشان اور شرمندہ ہوئی۔ اب کیا کرے؟ اسے جھوٹ بولنا واقعی میں نہیں آتا تھا۔

”کچھ پوچھ رہا ہوں میں تم سے اقصیٰ؟“

اس نے ذرا سی نظریں اٹھا کر اپنے صاحب کو دیکھا۔ وہ بہت تحمل سے پوچھ رہا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی مطلوبہ جواب نہ ملنے کی صورت میں یہ تحمل اس پر زلزلہ بن کر گر سکتا تھا۔

اس نے کچھ ہمت مجتمع کی۔ کچھ حوصلہ پیدا کیا۔ جو قسمیں کھا رکھی تھیں، ان کے ٹوٹنے پر کفارے کے

pklibrary.com

طور پر روزوں کا حساب کیا۔ ایک بار پھر پسینہ صاف کیا۔

"جنت آپی مجھے کسی کے گھر لے کر گئی تھیں۔" اس نے بتا دیا۔ حالانکہ جنت نے کہا تھا اس کا ہر راز قبر تک جانا چاہیے۔ اب راز چھپاتے چھپاتے وہ خود تو قبر میں نہیں اتر سکتی تھی نا؟

"اگر میں تمہیں وہاں لے جاؤں تو تمہیں گھر کا اندازہ ہو جائے گا؟"

اصی نے بڑے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ جنت آپی کی وجہ سے پورا گھر پریشان تھا۔ اگر اس طرح ان کا کوئی سراغ ملتا ہے تو اسے ہرگز ہرگز خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ ہمت کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک بار پھر قسم اور وعدوں کا غم کھانے لگا تھا۔ جنت آپی جب واپس آئیں گی تو اسے ہرگز ہرگز معاف نہیں کریں گی۔ لیکن کوئی نہیں۔ وہ روزے رکھ لے گی۔ اور روزوں کے تصور سے اسے ایک بار پھر رونا آیا۔

غٹاغٹ ایک پانی کا گلاس چڑھایا اور فارس کے حکم پر اپنے ابا سے اجازت لے کر اس کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ ڈرائیور کو جگہ کا علم تھا۔ گاڑی سڑک کنارے روک دی گئی۔

گاڑی سے اتر کر وہ پیدل اس کے پیچھے تنگ گلیوں میں چلتا رہا۔ کبھی دائیں طرف مڑتے۔ اور کبھی بائیں طرف رخ کرتے وہ تین منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ سامنے سے بالکونیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے یاد تھا، وہ دوسری منزل والے گھر میں گئی تھی۔ اور یہ بات اس نے فارس کو بتا بھی دی۔

"گھر میں کون کون تھا؟"

"ایک مرد تھا۔ اس کی بیوی۔ اور ایک بیٹا!"

فارس نے لمحے بھر کے لیے کچھ سوچا پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"آپ جائیں گے نہیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ جیسے یہ جگہ۔ یہ گھر ہی دیکھنے آیا تھا۔ اور شاید ملاقات کے لیے وہ کسی اور کو بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ڈرائیور نے اسے گھر ڈراپ کر دیا۔ بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہوتے اس نے گاڑی کی پچھلی نشست کی طرف دیکھا۔

فارس موبائل فون کان سے لگائے کسی سے بات کرتے ہوئے مسلسل اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ وہ گہرا سانس لے کر اندر چلی گئی۔ گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔

صندل آپا کی چھوٹی بیٹی مروہ کو پہلو میں سلائے وہ چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ دوسری چارپائی پر صابرہ بوا ابھی آ کر بیٹھی تھیں۔ پر سوچ نگاہوں میں بہت سے سوال اور فکر لیے وہ جنت کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں جانتی ہوں، یہ ایک مشکل بات ہے۔ لیکن کرنا بھی ضروری ہے۔" یونہی بیٹھے بیٹھے وہ کچھ سوچ کر مخاطب ہوئی تھیں۔

"اس نے تجھے ڈھونڈا تو ضرور ہوگا۔"

جنت کی آنکھیں دھیرے سے کھل گئیں۔ سوال غیر متوقع تھا۔

"کیوں ڈھونڈے گا وہ مجھے؟" اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"بیوی ہے تو اس کی۔"

لمحے بھر کے لیے ایک سکوت سا اس پر طاری ہوا۔ برہان کی بھی وہ بیوی تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ فارس شیرازی کے ساتھ تو یہ ایک زبردستی کا ان چاہا رشتہ تھا۔ جس کے آغاز سے پہلے ہی انجام طے کر دیا گیا تھا۔ وہ بھلا اس کے پیچھے کیسے آ سکتا تھا؟ اسے کیسے ڈھونڈ سکتا تھا؟

وہ بوا کو بتانا چاہتی تھی، انسان انہیں ڈھونڈتا ہے جو گم ہو جائیں۔ انہیں نہیں جنہیں وہ خود گم کر دے۔

"جنہ۔" اس کی خاموشی پر وہ ذرا بے قرار

pklibrary.com

ہوئیں۔

"اب تک وہ اپنی پہلی بیوی کو واپس بھی لے آیا ہوگا بوا۔" اس نے اتنے عام لہجے میں اس انداز میں بات کی جیسے وہ اپنے شوہر کی نہیں محلے کے کسی دوسرے مرد کی بات کر رہی ہو۔ بوا تحیر سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"اور تو..... تجھے واپس نہیں لانا چاہے گا؟"

اور بات تو "چاہت" کی تھی۔

"خواہش" کی تھی۔

اور "محبت" کی بھی۔

اور وہ نہ چاہت تھی۔ نہ خواہش۔ اور نہ محبت۔

"ہوسکتا ہے اس نے اب تک مجھے طلاق بھی دے دی ہو۔" اس نے مبہم لفظوں میں بہت نارمل سے لہجے میں طلاق کا اشارہ دے دیا۔ وہ چاہتی تھی بوا سمجھ لیں اختلاف کوئی چھوٹا موٹا نہیں۔

"اگر دے بھی دے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ طلاق تو نہیں ہوسکتی۔ تو حمل سے جو ہے۔"

جنت کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ اندر باہر سناٹا چھا گیا۔ یہ خیال تو ایک لمحے کے لیے بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

"کیا بہت ظلم کرتا تھا؟ مارتا پیٹتا تھا؟" آنکھوں میں فکرمندی سموئے انہوں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد تشویش سے پوچھا۔

لفظوں کی مار کے آگے۔ جسمانی تشدد کی کیا اوقات؟ اسے برہان سے پڑنے والا وہ تھپڑ یاد آیا۔ تکلیف اس تھپڑ کی زیادہ تھی۔ اور بہت زیادہ تھی۔

"نہیں۔"

بوا کی اٹکی ہوئی سانسیں یکا یک بحال ہوئیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ چلو تشدد کا مسئلہ نہیں۔

ایک بار پھر خاموشی حائل ہوگئی۔ آنکھیں موند کر جنت نے دل سے دعا کی بوا اور کچھ نہ پوچھیں۔

"جنہ۔ بچے! کیا صلح کا کوئی راستہ نہیں نکلتا؟" اب وہ محتاط لہجے میں بہت نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔ اور یہ فقط سوال نہیں تھا۔ وہ اسے پلٹنے کا راستہ دکھا رہی تھیں۔ جنت دم سادھے رہی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو اس کے ہونے والے بچے کی ماں ہے! مرد لاکھ پتھر دل سہی۔ کم از کم اپنی اولاد کے لیے تو نرم پڑ ہی جاتا ہے۔"

اس کا چہرہ اوجھل رہا۔ نم آنکھیں بند رہیں۔ اپنی سسکیاں دبائے وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔

وہ اٹھ کر اس کی چارپائی پر آگئیں۔ نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"میں جانتی ہوں، یہ تیرے لیے بہت مشکل ہے مگر..... تو خود سوچ۔ اس طرح تنہا زندگی کیسے گزارے گی؟ پھر تجھ پر ایک بچے کی ذمہ داری آنے والی ہے۔ اس لیے اگر صلح صفائی کا کوئی بھی حل نکلتا ہو تو تجھے اس حل پر واقعی غور کرنا چاہیے۔"

اپنی بات ختم کر کے انہوں نے چند لمحوں تک اس کے جواب کا انتظار کیا۔ مگر جنت نے گویا لب سی لیے تھے، سانسوں کو روک لیا تھا۔

"سوچنا ضرور۔" آنکھوں میں فکر لیے، اس کی پشت تھپتھپا کر وہ اپنی چارپائی پر چلی گئیں۔

جنت نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا پورا کا پورا وجود درد کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

اس نے ابھی تک بوا کو اپنے مسئلوں سے آگاہی نہیں دی تھی۔ فارس کی نفرت اور ان چاہے رشتے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ بوا پانچ سالوں کا عذاب جانتی تھیں۔ پانچ ماہ کی اذیت سے ناواقف تھیں۔

انہیں اس کے درد کا، اس کی بے کسی اور بے بسی کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک اس پوشیدہ اختلاف کو معمولی نوعیت کا سمجھ کر اسے فائزہ بچی کی حرکت سے جوڑ رہی تھیں۔ انہیں اس کے معاملات اتنے صاف اور سیدھے لگتے تھے کہ ان کا خیال تھا اس کا شوہر اولاد کی خبر ملتے ہی اسے بخوشی اپنا لے گا۔ وہ اس کے اس طرح اچانک گھر چھوڑنے پر بھی بہت فکرمند ہوگا۔

بوا حل کی بات کرتی تھیں۔ صلح کی راہ دیکھتی تھیں۔ احساس کا ذکر کرتی تھیں۔ معافی پر یقین رکھتی تھیں۔ وہ فارس وجدان کو نہیں جانتی تھیں۔ جان بھی نہیں سکتی تھیں۔ مگر وہ تو جانتی تھی اسے۔ اور بہت اچھی طرح سے جانتی تھی۔

اس کی ناک گال اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ آنکھوں پر بازو رکھے وہ بے آواز رونے لگی۔

وہ فارس کے گھر سنز شیرازی کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ اور سنز شیرازی کی ہی وجہ سے اب واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اور یہ بات وہ چاہ کر بھی بوا کو نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ انہیں فارس وجدان کی نفرت کی وجہ نہیں سمجھا سکتی تھی۔ سارے لفظ، ساری دلیلیں، ساری کی ساری وضاحتیں ختم ہو جاتی تھیں۔ ایک خاموشی ہی تھی جو رہ جاتی تھی۔ ایک جمود ہی تھا جو طاری ہو جاتا تھا۔

اس نے پہلے بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب بھی نہیں بتانا چاہتی تھی۔

لیکن بوا ان سب باتوں سے بے خبر ان راستوں کو ڈھونڈ رہی تھیں جو اذیت بھرے اور پر خار تھے۔ ان خوشیوں کو تلاش رہی تھیں جن پر اس کا حق تھا ہی نہیں۔

بات نصیب کی تھی۔

اور اب بھی۔ نصیب کی ہی تھی۔

☆☆☆

کہاں آ کے رکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا، اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ جو نہیں ملا، اسے بھول جا

رنگ برنگے غبارے اڑا دیے گئے۔ ٹب میں پانی بھرا گیا، کاغذ کی کشتیاں بنائی گئیں۔ رنگوں سے کئی لکیریں صفحوں پر لگائی گئیں، کئی پھول بنائے گئے، کئی گھر سجائے گئے۔ اور کئی خوشیاں سبز درختوں کی شاخوں پر پرندوں کی صورت بٹھا دی گئیں تھیں

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دل بے خبر مری بات سن اسے بھول جا، اسے بھول جا

فاطمہ کی دو گڑیاں تھیں۔ ایک کو دلہن اور دوسری کے بال چھپا کر، مار کر سے مونچھیں ڈاڑھی بنا کر، سفید شلوار سوٹ پہنا کر زبردستی کا گڈا بنا دیا گیا۔ شام تک شادی سرانجام پانا تھی۔ اس کے کمرے میں، الماری کے ایک خانے میں دلہن کا پورا کمرہ سیٹ کیا جانے لگا۔ ننھے ننھے شادی کارڈ چھوٹی چھوٹی بچیوں میں بانٹے گئے۔

میں تو گم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی مرے کان میں، مرے ساتھ آ اسے بھول جا

مغرب تک صحن میں چبوترے جاگتے پھول سج ہو گئے۔ گڑیا کا کمرہ، اس کا سامان، اس کا جوڑا دیکھا گیا، دولہا کو بڑی شرارتی نگاہوں سے پرکھا گیا، ہنسی دبائی گئی۔ پھر رخصتی ملاحظہ کی گئی۔ نیچے صحن سے اوپر اس کے کمرے تک بارات آئی۔ پھر پلاؤ کھایا گیا۔ ہنستے مسکراتے پھول خوشی خوشی چلے گئے مگر ان کی آمد سے جو سکون اترا وہ وہیں ٹھہر گیا۔

کسی آنکھ میں نہیں اشک غم ترے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بھلا دیا، تو بھی مسکرا، اسے بھول جا

کمرے کی صفائی کرتے، اپنے کپڑے دھو کر تار پر پھیلاتے، تیز دھوپ میں گلابی رنگت لیے منڈیر سے آگے دور دور تک پھیلے سرسبز کھیتوں کو دیکھتی وہ۔

کیوں اٹا ہوا ہے غبار میں، غم زندگی کے فشار میں
وہ جو درد تھا ترے بخت میں، سو وہ ہو گیا اسے بھول جا

اور نیچے اپنی بہنوں کی غیر موجودگی میں جھولے پر بیٹھا علی۔ ذرا سی خفگی سے اسے دور سے دیکھتا ہوا۔ کہ اس کی آمد کے بعد سے اس کی تین عدد شرارتی بہنیں اب ہر وقت آپی آپی کرتی اوپر ہی پائی جاتی تھیں۔

اب نہ کسی سے پائپ چھیننے پر لڑائی ہوتی۔ نہ جھولا ہتھیانے پر شور مچتا۔ نہ چھوٹی چارپائی کے لیے رونا دھونا ہوتا۔

کتنا سکون۔ اور کتنی خاموشی تھی گھر میں۔ اس کی اماں اب آرام سے ہر کام کرتی تھیں۔ پڑوسیوں کے گھر چکر بھی لگا آتی تھیں۔ شاپنگ پر بھی بغیر فکر

کے چلی جاتی تھیں۔اب وہ اس سے یہ نہیں کہتی تھیں علی تم ان کا خیال رکھنا، اور ایسے خیال رکھنا! اور اس طرح خیال رکھنا۔ دور سے ہی اس غاصب لڑکی نے اسے دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا تو دادی، نانی کے لاڈلے نے نخوت سے چہرے کا رخ موڑا۔

تجھے چاند بن کے ملا تھا جو، ترے ساحلوں پہ کھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا سو اتر گیا، اسے بھول جا

اجالے آسمانوں پر سمٹ گئے، اندھیرا دھرتی پر اتر آیا۔ چہار سو سکون بھری خاموشیاں چھا گئیں۔ اور بہت اوپر سے مدھم روشنی میں وہ منظر نمایاں ہوا۔

سلیم سے ویڈیو کال کرتی بوا۔ اور سامنے ہی وہ بیٹھی تھی۔ فاطمہ، عیشا، اور ننھی مروہ کو ساتھ لیے۔ آج صبح ہی بوا نے لوڈو منگوا کر دی تھی۔ اور اب ہنستے مسکراتے وہی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

وہ جیت رہی تھی۔ بچیاں ہار رہی تھیں۔ سلیم کو پتا چلا تو خوب ہنسا۔

"یہ ویسی کی ویسی ہے اماں! ذرا نہیں بدلی۔"

وہ مسکرائیں۔ اور یہی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کی نمی بن گئی۔

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دل منتظر تو یہ کس لیے ترا جاگنا، اسے بھول جا، اسے بھول جا

وہ نیچے علی کے پاس گئی۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر، سر اٹھا کر فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔

"تمھاری بہنیں مجھ سے ہار گئیں، تم جیت کر دکھاؤ تو بات بنے۔"

اتنے دنوں تک اسے نظر انداز کرتا علی یک ٹک اسے دیکھ کر رہ گیا، اس کی ننھی سی غیرت کو بہنوں کی شکست گوارا نہ ہوئی۔ چیلنج قبول کر کے فورا اوپر آ گیا۔ ایک بار پھر محفل جمی۔ اور وہ نو سالہ بچے سے ہار گئی۔

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ، اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل سر آئینہ، اسے بھول جا، اسے بھول جا

"آپ کو نہیں پتا لیکن میں بہت ذہین ہوں۔"

اس نے سر اٹھا کر فاتحانہ انداز میں جتایا۔ بہنیں اس کے ساتھ جڑی بیٹھی تھیں اور اتنا خوش ہو رہی تھیں جیسے ان کے بھائی کو ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ ایک مروہ ہی تھی جو فیڈر منہ میں ڈالے اس کی گود میں بیٹھی، اس کی خاموش ساتھی بنی ہوئی تھی۔

جو بساط جاں ہی الٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اسے روکنے سے حصول کیا، اسے مت بلا، اسے بھول جا

اس کی آنکھیں دھندلائیں۔ تبسم ہونٹوں پر ٹھہر گیا۔ دن بے دار ہوا، شام آنکھوں میں اتر آئی۔ وقت گزرا، چند دن گزر کر ایک بار پھر رک گیا۔

وہ صندل آپا کے بچوں کو اب شہزادیوں کی کہانیاں سنا رہی تھی، علی ناک بھوں چڑھا رہا تھا۔ اسے تو کسی بھوت، کسی جن، کسی طاقت ور شہزادے کی کہانی سننی تھی۔ جس نے کئی لوگوں کے سر پھاڑے ہوں، دیو بھگائے ہوں، پہاڑ گرائے ہوں، تباہیاں مچائی ہوں۔

"مجھے نہیں آتیں ایسی کہانیاں۔" وہ اسے گھور کر کہہ رہی تھی۔

"آپ بہت بور کرتی ہیں۔" رخ بدل کے اس نے کان پر ہاتھ رکھا تھا۔

تو یہ کس کیے شب ہجر کے اسے ہر ستارے میں دیکھنا
وہ فلک کہ جس پہ ملے تھے ہم، کوئی اور تھا، اسے بھول جا

سفیدے کے پتوں سے ہوائیں سرسرا کر گزریں۔ بادلوں کی اوٹ سے نکلتی چاندنی صحن میں اتر آئی۔

اس کے آس پاس ہر طرف امید کے نقرئی ذرے بکھر گئے۔ اس نے دعا مانگتے ہوئے ان ذروں کو انگلی کی پور پر چنا۔

آنکھوں میں ننھی جان خواب ہو کر بس گئی۔ قلب سرور کی لے میں ڈوبا تو انگ انگ میں سکون ٹھہر گیا۔

کہاں آ کے رکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا، اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا

آسمان کو دیکھتے اس نے آنکھیں موند لیں۔

تکیہ پھر سے بھیگنے لگا۔ مگر لبوں پر مسکراہٹ ٹھہری رہی۔ اور کافی دیر تک ٹھہری رہی۔

☆☆☆

مطلع ابر آلود تھا۔ فضا میں حبس کے ساتھ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شدید گرمی سے اکتائے ہوئے علی کا خیال تھا آج بارش ضرور ہوگی۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی لیکن گھر پہنچنے سے پہلے تک نہیں۔

صندل آپا کسی مردہ کو لیے اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ صابرہ بوا نے اپنی ہمسائی کے یہاں دعوت پر اسے اور بچیوں کو بھیج دیا تھا۔ خود وہ گھر میں سلیم کی بیوی انعم کی کسی رشتہ دار کی وجہ سے رک گئی تھیں جو آج صبح ہی ان سے ملنے آگئی تھی۔

صابرہ بوا کی ہمسائی کا گھر ہرے بھرے کھیتوں اور وسیع سبزہ زار کے اس پار تھا۔ دعوت سے چار بجے تک فارغ ہو کر اس نے واپسی کا رخ کیا تو اس وقت آسمان سیاہ بادلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔

فاطمہ، عیشا اور علی پگڈنڈی پر شور مچاتے بھاگے چلے جارہے تھے اور وہ سر پر دوپٹہ لیے احتیاط سے قدم اٹھاتی ان کے پیچھے چل رہی تھی۔ شہد بالوں کی کچھ لٹیں پیشانی سے چپکی ہوئی تھیں۔ گرمی کی شدت سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"آج تو طوفان آئے گا۔" علی نے ہاتھ اٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہی کہہ دیا۔

"اللہ نہ کرے علی۔" وہ دہل کر بولی۔ اسے بارش ضرور چاہیے تھی مگر طوفان کے ساتھ ہرگز نہیں۔

علی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ پھر رک گیا۔ "آپ یہاں نئی آئی ہونا۔ اس لیے آپ کو نہیں پتا۔ ہمیں پتا ہے۔ یہاں ساری ہوائیں رک جاتی ہیں۔ پھر بادل آتے ہیں۔ وہ بالکل کالے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہوائیں چلتی ہیں۔ اور بہت زور سے چلتی ہیں۔ اتنی زور سے کہ اگر آپ کمرے میں نہیں چھپیں گی تو اڑ جائیں گی۔"

جنت نے رک کر پسینہ صاف کیا۔ گہرا سانس لے کر پھر سے قدم اٹھائے۔ پتا نہیں علی کو یہ کیوں لگتا تھا کہ وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھی جسے بارش، آندھی اور طوفان کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔

"اس کے بعد بارش آتی ہے۔ بہت تیز۔" علی نے دونوں ہاتھ چہرے کے قریب لاکر، آنکھیں میچیں "اتنی تیز۔ اتنی تیز کہ۔۔۔"

"کہ اگر میں کمرے میں نہیں چھپوں گی تو بہہ جاؤں گی۔" بقیہ جملہ اس نے بیزار ہو کر مکمل کیا۔

"بالکل۔" علی اترایا۔ پھر تیزی سے بھاگا۔ فاطمہ نے اس کے دیکھا دیکھی رفتار پکڑی۔ البتہ عیشا پگڈنڈی سے گزرتی کہیں سے پھول، کہیں سے پتے، کہیں سے کوئی کلی توڑتی جارہی تھی۔ اور اس عمل کی وجہ سے وہ جنت سے بھی پیچھے رہ گئی تھی۔

"عیشا۔" ہر تھوڑی دیر بعد وہ رک کر اسے پکارنے لگتی۔ اور عیشا سرعت پکڑ کر پھر سے ست ہو جاتی۔

کھیتوں کے اس پار مضبوط راستے پر قدم جماتے ہی اسے فضا میں یکا یک ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ہوائیں چل گئی تھیں۔ مگر اتنی تیز نہیں تھیں کہ اسے اڑا لے جائیں۔

عیشا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی رفتار بڑھاتے ہوئے وہ دائیں طرف گلی میں داخل ہو گئی۔ بالکل سامنے سڑک واضح نظر آتی تھی۔ جس پر اکا دکا گاڑیاں گزرتی ہوئی دکھائی دے جاتی تھیں ورنہ موٹر سائیکل یا پھر رکشے نظر آتے رہتے۔

ایک سیاہ لینڈ روور اسے سڑک کنارے ہی کھڑی دکھائی دے گئی تھی۔ شاید کوئی جاگیردار اپنی زمینوں کے دورے پر تھا۔

گردن موڑ کر اسی طرف دیکھتے وہ دوسری گلی میں داخل ہوئی اور اگلے ہی لمحے اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہو گئی۔

علی نے بھاگ کر آہنی دروازہ اندر کی جانب دھکیل دیا تھا۔ فاطمہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ عیشا کو گلی میں ہی کوئی چیز نیچے گری ہوئی ملی تھی جسے اٹھانے کے لیے وہ جھک گئی تھی۔

pklibrary.com

وقت لمحے بھر کے لیے رکا تھا۔ اور پھر جیسے رکا رہ گیا تھا۔ بارش کے قطرے فضا میں معلق ہوئے، ہوائیں رک گئیں، شور تھم گیا۔

سیاہی مائل جینز پر خاکی کاٹن آف وائٹ شرٹ میں ملبوس فارس وجدان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کشادہ پیشانی پر بال بکھرے تھے۔ ہیزل آنکھوں کی سرخی میں نمی ٹھہری تھی۔

بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ یقین اور بے یقینی میں مدغم ہوتے تاثرات میں ایک پوشیدہ کرب لیے وہ وہم سے خیال، اور پھر خیال سے ایک حقیقت ہو گیا تھا۔

بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ بارش شروع ہوئی۔

اسے گھر چھوڑے ہوئے پچیس دن ہو چکے تھے، چھبیسویں دن وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے وہ مدت پوری ہونے نہیں دی تھی۔ اسے وقت کی حد سے نکلنے نہیں دیا تھا۔

جنت کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ فارس وجدان یہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے پیچھے یہاں نہیں آ سکتا تھا۔

ایک نکاح ہی تو تھا۔ اور اس نکاح کی تو فارس وجدان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ وہ کسی بزنس ڈیل کی طرح اس رشتے کو ایک عام سا کانٹریکٹ سمجھتا تھا۔ اور اس عام سے کانٹریکٹ کے لیے وہ اتنا سفر طے کر کے یہاں تک نہیں آ سکتا تھا۔ اس کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن جو فارس اس کے سامنے کھڑا تھا، اس نے ایسا کر دیا تھا۔

وہ اب قدم اٹھا رہا تھا تو اس کی چال غیر متوازن تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کسی لمبے سفر سے شکست خوردہ سا لوٹا ہو۔ منزل اب بھی اس کے لیے بے نام، اور راستہ ابھی بھی اس کے لیے مشکل رہا ہو۔ جانے وہ بارش تھی جس نے اس کا چہرہ تر کر دیا تھا یا وہ آنسو تھے جو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے؟ وہ سمجھ نہ سکی۔

فارس کے ساتھ اس کے معاملات اس نوعیت کے ہرگز نہیں تھے کہ وہ اس لمحے کمزور پڑتی یا حساس ہو جاتی۔ وہ اس کا سہارا نہیں تھا کہ اس کے بنا وہ ٹوٹ کر ریزہ ہوتی۔ لیکن اسے رونا آیا تھا۔ اور جانے کیوں شدت سے رونا آیا تھا مگر وہ ساری سیپیاں آنکھوں میں لیے ضبط کیے کھڑی تھی۔ وہ زندگی کی طرف بہت مشکلوں سے پلٹی تھی۔ دوبارہ فنا نہیں ہونا چاہتی تھی۔

وہ وہیں کھڑی تھی، جہاں وہ تھی، مگر فارس وہاں نہیں تھا، جہاں وہ ہوا کرتا تھا۔ وہ پہلے کسی اور مقام پر تھا۔ اب کسی اور مقام پر نظر آ رہا تھا۔

فاصلہ ختم ہوا۔ اور وقت رک گیا۔ قریب پہنچ کر اس نے آہستگی سے ہاتھ اٹھایا۔ کپکپاتی انگلیوں سے اس کا گال چھوا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا جنت خیال نہیں تھی، ایک حقیقت ہو چکی تھی۔

اس کے چہرے کے تاثرات یکا یک یوں ہوئے جیسے اس میں ابھی ابھی زندگی کی اک نئی لہر دوڑی ہو۔ یا جیسے اس کی تھمی ہوئی سانسیں نئے سرے سے بحال ہو گئی ہوں۔ وہ پھر سے جی اٹھا ہو۔ وہ اس کی ہر کیفیت اور احساس سے بے خبر اسے بہت صدمے سے دیکھ رہی تھی۔

علی کہہ رہا تھا، آج طوفان آئے گا۔ علی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

جنت کمال کی زندگی میں طوفان آ چکا تھا۔

یکا یک وہ اپنے سکتے سے باہر آئی۔ اس نے فارس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اسی سرعت سے رخ بدل کر گھر میں داخل ہوئی، اور اسی تیز بوچھاڑ میں بھیگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

☆☆☆

بارش نے زور پکڑ لیا تھا۔ آندھی شدت اختیار کر گئی تھی۔ سفیدے کے درخت ہوا کے زور سے گویا صحن کی دیواروں پر جھکے چلے آ رہے تھے۔ دور کہیں بجلی چمکی تھی۔ بادل گرجے تھے۔ اندر اور باہر کا موسم ایک سا ہو گیا تھا۔

فضا کا سکوت طوفان نے درہم برہم کیا تھا اور اس کے اندر کا سکون فارس وجدان نے ختم کر دیا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑکی کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ لب بھنچے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نمی ٹھہری تھی۔

فارس وجدان کسی کے بلانے پر یہاں نہیں آیا تھا۔ بوا جی کچھ دیر پہلے ہی اپنی پوزیشن کلیئر کر کے گئی تھیں۔ انہوں نے فارس سے رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں سلیم سے کوئی بات کی تھی۔ وہ یہ ضرور چاہتی تھیں، جنت اپنے شوہر کے پاس چلی جائے مگر اس کے لیے انہوں نے خود سے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے اعتماد میں لیے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

تو کیا مسز شیرازی نے اسے بھیجا تھا؟ کیا وہ ان کے کہنے پر یہاں آیا تھا؟ اس کا دل چاہا، وہ ابھی نیچے جائے اور اس سے مسز شیرازی کے بارے میں پوچھے۔ مگر وہ نہیں گئی۔ ذہن کو، ہر طرح کے خوف اور وسوسے کی گرفت سے چھڑائی وہیں بیٹھی رہی۔

جانے کتنے غم تھے جو یاد آئے جا رہے تھے۔ اپنی ریاضتیں، صبر، برداشت اور فارس وجدان کی نفرت، دھمکیاں اور طلاق۔ ایک وعدہ تھا جو اس نے خود سے کیا تھا۔ اور اپنے اس وعدے پر اسے ہر صورت قائم رہنا تھا۔ واپسی کی ہر راہ اس پر پہلے سے مسدود تھی۔ دل کا ہر دروازہ اس پر بہت پہلے سے بند تھا۔ اب اسے کوئی حماقت نہیں کرنی تھی۔ اور کسی صورت نہیں کرنی تھی۔ نہ سر جھکانا تھا۔ نہ منت کرنی تھی اور نہ کسی دباؤ میں آ کر کوئی قدم اٹھانا تھا۔ بات اب اس کے بچے کی تھی۔ اور صرف بچے کی ہی رہ گئی تھی۔ وہ عدم تھی تو اب اسے منظر نہیں ہونا تھا۔ تصور تھی۔ تو اب اسے حقیقت نہیں ہونا تھا۔

بوا اسے ارسلان بھائی کا سوٹ دے کر اوپر آئیں تو آنکھوں میں خوش گوار سا تاثر ٹھہرا تھا۔ وہ فارس کی آمد پر اتنی خوش تھیں کہ پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ایسے جیسے وہ ان کا سچ مچ کا داماد ہو۔

"میں سوچ رہی ہوں، تیرے گھر والے کو خوش خبری سنا دوں۔ یا تو خود سنا دے گی؟" انہوں نے پوچھا۔ وہ گم صم سی انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ بوا اس کے لیے سب کتنا مشکل کر رہی تھیں۔

"اور یہ کیا تو اندر چھپ کے بیٹھ گئی ہے۔ کیا سوچے کا راہ؟"

بوا اس پر خفا ہوئیں۔ انہیں فارس کی کتنی فکر ہونے لگی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کی آمد کا مقصد، اس کا ارادہ جانے بغیر صرف اس لیے کہ وہ اس کی تھی۔ تو وہ اہم ہو گیا تھا۔

"ویسے ماشاء اللہ تیرا گھر والا ہے بڑا سوہنا۔" لگے ہاتھوں تعریف بھی کر ڈالی۔

"کوئی سوہنا ودہنا نہیں ہے وہ۔" وہ جو اتنی دیر سے صبر کیے بیٹھی تھی، بول پڑی۔

بوا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ خفا خفا سی چہرے کا رخ بدل گئی۔ انہوں نے الماری سے ایک مردانہ شال نکالی اور جانے کیوں مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ مدھم پھوار ہنوز برس رہی تھی۔ اس نے دوسری موم بتی جلائی۔ پھر تیسری۔ پھر چوتھی۔ مگر اندھیرا ٹھہرا رہا۔ الجھن بڑھتی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد علی آ گیا۔

"وہ آپ کے شوہر ہیں؟" پتا نہیں علی پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔

"ٹھنڈ لگ گئی ہے انہیں۔ چھینکیں آئی جا رہی ہیں۔ اتنی دیر تک تو وہ دروازے میں کھڑے بارش میں بھیگتے رہے۔" وہ اس کے برابر میں تخت پر ٹک گیا۔ ٹارچ ہاتھ میں تھی۔

اماں نے ابو کے کپڑے دیے ہیں انہیں۔ بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔"

"کپڑے؟" اب کے ذرا سا رخ موڑا۔

"نہیں وہ خود....."

اس نے نگاہیں موم بتی پر جما لیں۔ لائٹ جانے کب آنا تھی۔

"ان کی گاڑی اچھی ہے۔ اور موبائل بھی۔"

پھر جیسے کام کی بات یاد آئی تو فوراً نیچے اترا۔
اماں کہہ رہی ہیں، سر درد کی گولی دے دیں۔"
"کس کو چاہیے؟"
"جن کو چھینکیں آئے جا رہی ہیں انہیں۔"
اب کے وہ ذرا سا چونک کر اس کی طرف مڑی۔ "بوا نے کہاں بٹھایا ہے اسے؟"
"بیٹھک میں۔"
اسے یاد آیا، بیٹھک کے بیرونی دروازے سے اکثر ایک بلی اندر آ جایا کرتی تھی۔ بارش کے موسم میں تو لازمی ایسا ہوتا تھا۔
سب کچھ چھوڑ چھاڑ وہ تیزی سے نیچے آئی۔
عیشا اور فاطمہ برآمدے میں رکھی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ بوا نے ڈانٹ کر بٹھایا تھا کہ عیشا بھاگتے ہوئے دو بار پھسل کر گر چکی تھی۔
"بوا!" وہ سیدھا کچن میں آ گئی۔
بوا نے کھانا گرم کرتے ہوئے اس کی طرف ذرا سی خفگی سے دیکھا کہ محترمہ کو نیچے آنا یاد آ گیا؟
"آپ اسے کسی اور کمرے میں بٹھا دیں۔" انگلیاں مسلتے ہوئے وہ پریشانی سے بولی۔
"جنہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔" بوا کو باقاعدہ غصہ آ گیا۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا، اسے گھر سے نکال دیں۔" وہ احتجاجاً دبی آواز میں چلائی۔
"ایک ہی بات ہے۔" ان کا پارہ چڑھ گیا۔
"میں دیکھ رہی ہوں جب سے وہ بے چارہ آیا ہے تجھے آرام نہیں مل رہا۔"
"بے چارہ؟" جنت کی آنکھوں میں اس ناانصافی پر آنسو آ گئے۔
"اسے بلیوں سے الرجی ہے بوا! بیٹھک میں بیٹھا رہا تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔"
"طبیعت تو اس کی پہلے سے خراب ہے، پتا نہیں کیسے گاڑی چلا کر یہاں آیا ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے برتن میں سالن نکالنے لگیں۔
"تو جا، جہاں بٹھانا ہے بٹھا دے۔" انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔
"بوا!" وہ روہانسی ہوئی۔ بوا نے خود کو سخت پتھر کر لیا۔ اس کا شوہر، اس کا فرض، اس کی ذمہ داری۔
وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ باہر نکل گئی۔ علی کو آواز دے کر بیٹھک میں بھیجا اور خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔
بیڈ پر سے کچھ رسالے غصے سے اکٹھے کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھے۔ تکیے وغیرہ درست کیے۔ چند مزید موم بتیوں کا اضافہ کر کے روشنی بڑھانا چاہی۔
عین اسی لمحے علی کمرے میں داخل ہوا۔
"انہوں نے کہا میں یہیں ٹھیک ہوں۔"
"کیا مطلب، یہیں ٹھیک ہوں۔ تم نے بتایا نہیں انہیں، کمرے میں بلی آتی رہتی ہے؟"
"یہ کیوں بتانا تھا؟" علی سراپا سوال بن گیا۔
"اف!" اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ پھر ضبط کر کے سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی۔ علی بڑے مزے سے ٹہلتا اس کے پیچھے تھا۔ "بتایا تھا میں نے۔ بتایا تھا بلی آتی ہے کمرے میں۔ لیکن وہ پھر بھی نہیں اٹھے۔"
اس نے مڑ کر علی کو دیکھا پھر دانت کچکچاتے ہوئے ڈرائنگ روم کا ادھ کھلا دروازہ پورا کھول دیا۔
دروازے کے بالکل قریب وہ صوفے پر شلوار سوٹ میں ملبوس بیٹھا تھا۔ چھینکوں سے کچھ عاجز ہو کر اس نے سر اٹھایا۔ آنکھوں میں خفگی، غصہ ناراضی اور جانے کیا کچھ لیے جنت کمال ایک بار پھر اس کے سامنے کھڑی تھی۔
"اگر اب تمہیں ری ایکشن ہوا تو میں تمہیں سی بی آر نہیں دوں گی۔ ہاسپٹل بھی کافی دوری پر ہے۔ ابھی سے بتا رہی ہوں تمہیں۔" لہجے کو حتی الامکان سخت رکھتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص لہجے اور انداز میں اس پر واضح کر دیا۔
اور جانے کیسے، اور جانے کس طرح فارس وجدان کے لبوں پر تبسم بکھرا۔ آنکھوں کی نمی یکا یک بڑھ گئی۔ بے نام سا حزن سرخ ڈوروں میں ٹھہر گیا۔
"اپنی زندگی پیاری ہے تو اوپر کمرے میں آ

pklibrary.com

جاؤ۔"

وہ کہہ کر پلٹ گئی۔ فارس اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی خاموشی کے ساتھ وہ اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا چھت والے کمرے تک آ گیا۔ دروازہ کھول کر اسے اندر داخل ہونے کا راستہ دیتی وہ خود باہر ہی رہی۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ پھر سے نیچے تھی۔

بوا کے ہاتھوں میں لیے باہر آئیں تو اس نے چہرے کا رخ پورا کا پورا موڑ لیا کہ مبادا اب وہ اس سے یہ نہ کہہ دیں کہ کھانا بھی وہ لے جائے۔ صد شکر کہ بوا نے ایسا کچھ نہ کہا۔

وہ کھانا دینے گئیں تو کچھ دیر تک اوپر بیٹھی رہیں۔ اور نیچے وہ جلے پیر بلی کی طرح چکراتی رہی۔ یہاں سے وہاں۔ اور پھر وہاں سے یہاں۔

لائٹ آ چکی تھی۔ بچے سو گئے تھے۔ صندل آپا نے فون کر کے کہہ دیا، موسم خرابی کی وجہ سے وہ کل ہی آئیں گی۔ اور اسے کسی صورت نہ نیند آ رہی تھی اور نہ سکون مل رہا تھا۔ عجیب سی ٹینشن تھی جس نے اسے گھیر لیا تھا۔

جانے بوا کیا بات کر رہی ہوں گی۔ وہ ان سے کیا کہہ رہا ہوگا؟ ایسا نہ ہو بوا منت سماجت کرنے لگ جائیں اس کی؟ اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔

کچھ ہی دیر میں اس نے بوا کو سیڑھیاں اترتے دیکھا۔

"زیادہ تو کچھ نہیں کھایا۔" وہ کچن میں ٹرے رکھ کر اس کے پاس آ گئیں۔

"تو..... پھر....." وہ خود سے کچھ پوچھ بھی نہیں رہی تھی، اور چاہتی تھی بوا سب بتا دیں۔

"طبیعت نہیں ٹھیک۔ گولی دی ہے میں نے۔ کوئی بات بھی نہیں کر رہا۔ تم جاؤ اوپر۔ اس سے پوچھو، کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ میرے سامنے جھجک رہا تھا تمہیں بتا دے گا۔"

"بوا۔" اس نے روہانسا ہو کر سر اٹھایا۔

"آپ۔"

"جنہ....." انہوں نے خفگی سے ٹوکا۔ "شوہر ہے وہ تیرا، کوئی اجنبی نہیں ہے۔ جا شاباش!" انہوں نے محبت سے پچکارا تو آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی لیے وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ اوپر آ گئی

"ایک تو بوا....." آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ "کچھ سمجھتی ہی نہیں ہیں۔" بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

سامنے ہی وہ اسے بیڈ پر نیم دراز دکھائی دیا۔ وہ جانتی تھی، اسے اپنے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ پر ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر وہ بیڈ پر ایک ہی پوزیشن میں اتنی گہری نیند سو رہا تھا کہ وہ چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے سے نظر نہ ہٹا سکی۔

اسے بے سکون کر کے وہ ہمیشہ کتنے سکون سے سوتا تھا۔ تپ کر لب بھینچے۔ آنکھیں رگڑیں۔ ایک بار پھر اسے دیکھا۔

بارش سے موسم کافی سے زیادہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ہلکا سا پنکھا بھی چل رہا تھا تو کچھ سوچ کر کمبل پھیلا دیا کہ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔

پاس ہی موبائل رکھا تھا۔ جھک کر اٹھا لیا۔ موبائل آف تھا۔ بیٹری تقریباً ختم۔ اس موبائل کی چارجر والی پن پورے گھر میں کسی کے پاس نہیں تھی۔ اسے بے اختیار مسز شیرازی کا خیال آیا۔ جب بھی وہ رابطہ نہیں کر پاتا تھا تو وہ اس کے لیے بہت پریشان ہو جایا کرتی تھیں۔ اب بھی ہو رہی ہوں گی۔

گہری سانس لے کر موبائل رکھ دیا۔ بلب بجھا کر اس نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا اور خود شال اوڑھے باہر آ گئی۔ منڈیر کے پاس رک کر اس نے تاریکی میں دور تک دیکھا۔

طوفان گزر چکا تھا۔ مگر اس کے آثار رہ گئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

وِدیہ بخاری

ساتھ نبھانا ہے

pklibrary.com

اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے یونی ورسٹی کے سنسان گراؤنڈ کو دیکھا۔ پتا نہیں آج وین والا کہاں رہ گیا تھا۔ اب تو اکا دکا اسٹوڈنٹس ہی رہ گئے تھے۔

''بھائی کو فون ملاؤں۔'' موبائل کی اسکرین پر فاران بھائی کا چمکتا نام آیا ہی تھا کہ اس نے جانی بیل کاٹ دی۔ ''کیا فائدہ وہ ڈسٹرب ہو جائیں گے۔''

فاران بھائی کی جب سے شادی ہوئی تھی، وہ مکمل طور پر بھابھی کے ہو رہے تھے۔ بہن اور ماں کا کوئی کام ہوتا تو ان کے ماتھے پر ہزاروں بل آجاتے۔ منہ سے کچھ نہ کہتے مگر انداز چیخ چیخ کر بتاتا کہ فالتو کی بیگار (بیوی کے علاوہ ہر کام کو وہ فالتو ہی گردانتے) کس قدر گراں گزر رہی ہے۔

عنایا جو شادی سے پہلے فاران کی نہایت چہیتی بہن تھی، اب کسی گنتی میں ہی نہ تھی۔ بیوی اور پھر بچوں کی ذمہ داریوں میں فاران کچھ ایسا گھرا کہ ماں بہن کے ضروری کام بھی توجہ کے قابل نہ رہے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد عنایا نے باقاعدہ جاب شروع کر دی تھی اور ساتھ ہی ایسا ہر کام خود سے کرنا بھی۔ تو ایسے میں فاران پر جو رہی سہی ذمہ داری تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ ماں جی بیوگی کے بعد زیادہ تر عبادت میں مصروف رہتیں۔

لیکن عنایا کتنی بھی خود اعتماد سہی..... تھی تو ایک نازک لڑکی ہی۔ جس کا چڑیا سا دل تھا اور کچھ آج کل کے حالات..... اس نے سراسیمہ ہو کر کچھ فاصلے پر کھڑے لڑکوں کے گروپ کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی کسی بات پر زور سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے تھے اور عنایا کو یوں محسوس ہوا گویا اسی پر ہنس رہے ہوں۔ بے اختیار موبائل پرس سے نکال کر فاران بھائی کا نمبر پریس کر ہی دیا۔

☆☆☆

فاران بہت خوش گوار موڈ میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ آج کافی دن کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام بنا تھا۔ سو دفتر سے کچھ جلدی نکل آیا تھا کہ یکا یک عنایا کا نام موبائل اسکرین پر چمکا۔

''اونہہ!'' طبیعت میں بے اختیار بے زاری عود آئی تھی۔ ''ضرور کوئی کام ہوگا اسے۔ آج کی آؤٹنگ تو گئی۔'' بالکل اپنی بیوی کے انداز میں سوچتے ہوئے وہ یہ یکسر فراموش کر چکا تھا کہ صرف بیوی ہی نہیں، بہن بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

''ہیلو بھائی! آپ مجھے پک کر سکتے ہیں۔ آج وین والا نہیں آیا اور شہر کے حالات آپ کو پتا ہیں۔ آج ٹرانسپورٹ کی بھی ہڑتال ہے۔'' عنایا گھبرائی ہوئی آواز میں ایک سانس میں بولتی چلی گئی کہ مبادا بھائی منع نہ کر دیں۔

''اوکے، میں آرہا ہوں۔'' فاران کی بے زار سی آواز آئی۔ کچھ بھی تھا بہن کو اس حال میں وہ اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ دل ہی دل میں بیوی کو منانے کے بہانے سوچتے ہوئے اس نے گاڑی عنایا کی یونی ورسٹی کی طرف موڑ دی تھی۔

☆☆☆

ہنستے بولتے بابا ایک رات ایسے سوئے کہ عنایا کے ہزار پکارنے پر بھی واپس نہ لوٹے۔ کچھ عرصہ عنایا اور فاران کو لگا کہ دنیا ہی ویران ہوگئی لیکن پھر قدرت کا قانون کہ گزرتے وقت کے ساتھ صبر آتا گیا۔ خود فراموشی سے زندگی کی طرف لوٹتے جو پہلی بات عنایا نے محسوس کی وہ گھر کا بڑھتا ہوا خرچ تھا۔

گھر میں تھی سارہ کے اضافے کے بعد فاران اکثر ہی ۔ خرچا پورا کرنے کی تگ ودو میں مصروف رہتا۔ تو اس نے بھائی کا ہاتھ بٹانے کی ٹھانی اور ایک اسکول میں نوکری کرلی۔

کچھ ہی عرصے میں اسے احساس ہوا کہ صرف بی اے کی تعلیم ناکافی ہے۔ سو کچھ مخلص دوستوں اور کولیگز کے مشورے پر اس نے آگے پڑھنے کا ارادہ کیا۔ والد صاحب نے نجانے کس خدشے کے تحت اس کے اکاؤنٹ میں اس کی شادی کے لیے پیسے جمع کروا رکھے تھے، وہی پیسے اس کا سہارا تھے۔ یونی ورسٹی کی فیس اور دیگر اخراجات وہیں سے پورے کیے گئے۔

ماں جی اس معاملے میں اس کے ساتھ تھیں کہ تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھیں۔ بابا کے جانے کے بعد زندگی تلخ ضرور ہوئی تھی مگر ماں جی ہر آفت میں اس کا بڑا سہارا تھیں۔

☆☆☆

فاران تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا کہ عنایا کی یونی ورسٹی گھر کے بالکل مخالف سمت میں تھی۔

''ایک تو لوگوں کو گاڑی چلانے کی بالکل تمیز نہیں۔'' جھنجلا کر اس نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ شارع فیصل کھچا کھچ گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں کسی کو راستہ دینے کا رواج نہ تھا۔ اپنی لین میں گاڑی چلانا محال تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنی گاڑی آگے بڑھانے کے لیے ہر آدمی دوسرے کی گاڑی کو پیچھے کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ فاران نے اشارہ کھلنے پر جیسے ہی گاڑی آگے بڑھائی، ایک موٹر سائیکل سوار نے اپنی جان پر کھیلتے ہوئے بائیں جانب سے اسے کراس کیا تھا۔ بے اختیار بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے فاران نے اسے صلواتیں سنانی شروع کی تھیں اور گاڑی فل اسپیڈ میں آگے بڑھادی۔ نتیجتاً اگلی گاڑی سے فاصلہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا اور برا ہوا اگلی گاڑی والے کا جس کو اچانک یاد آیا تھا کہ اسے دائیں طرف ذیلی سڑک پر مڑنا تھا۔ بریک لگاتے لگاتے بھی فاران کی گاڑی پجارو سے جا ٹکرائی تھی۔

''اوہ نو.....'' گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکلا۔ نہ نہ کرتے بھی گاڑی کا کافی نقصان ہوگیا تھا۔ اوپر سے اگلی گاڑی والا اپنی غلطی ماننے پر بھی تیار نہ تھا۔ اچھی خاصی بحث کے بعد لوگوں نے بیچ بچاؤ کروایا اور فاران غصے سے بھرا ہوا عنایا کی یونی ورسٹی پہنچا۔

''کہاں ہے یار یہ؟'' بے زاری سے سر گاڑی کی سیٹ سے لگاتے اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ یونی

pklibrary.com

ورسٹی کے باہر اور اندر کچھ اسٹوڈنٹس نظر آرہے تھے۔
''کہاں سے ہے یہ یونیورسٹی سنسان۔'' اس نے استہزائیہ سوچا۔ ''مدیحہ (بیوی) ٹھیک ہی کہتی ہے۔ عنایا خواہ مخواہ کی توجہ تلاشتی ہے یا اسے کہیں ہمارے جانے کا پتا تو نہیں چل گیا کہ جان کے ڈرامے کررہی ہو۔'' زہریلی سوچ دل میں لہرائی تو چہرے کی تلخی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔
اسی وقت عنایا گھبرائی گھبرائی سی یونی ورسٹی سے نکلتی دکھائی دی۔
''سوری بھائی!'' وہ گاڑی کا دروازہ کھولتی ہوئی بولی۔ ''میں آپ کو تکلیف نہ دیتی اگر آج ٹرانسپورٹ کی ہڑتال نہ ہوتی۔''
''اب تو دے دی تکلیف۔ بیٹھو شاباش۔'' وہ طنزیہ بولا اور عنایا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔
پورا رستہ بھائی نے عنایا سے کوئی بات نہ کی تھی اور عنایا ڈبڈبائی آنکھوں سے کھڑکی سے باہر دیکھتی سوچے گئی کہ کیا یہ وہی فاران بھائی ہے جو بابا کی زندگی میں اس سے ڈھیروں باتیں کیا کرتے تھے۔
ادھر فاران بیوی کے موڈ اور گاڑی کے ہونے والے نقصان کا تخمینہ لگاتے ہوئے اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں گھر آ گیا اور وہ اجنبیوں کی طرح اپنے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

☆☆☆

''آپ ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔ میرے اور میرے بچوں کا تو آپ کو احساس ہی نہیں۔'' مدیحہ منہ بنائے پوری طرح لڑنے کے موڈ تھی۔
''خدا کے لیے چپ ہوجاؤ، بہن ہے وہ میری۔ اسے اس طرح سڑک پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔'' فاران بھی پوری آواز سے چلایا تھا۔
ماں جی سوتے سے اٹھ بیٹھی تھیں۔ ''کیا ہوا؟ کون چیخ رہا ہے؟''
''کچھ نہیں امی! آپ سوجائیں۔'' عنایا دزدیدہ نظروں سے دروازے کو دیکھتے ہوئے بولی۔
''نہیں، پتا کرو۔ کیوں اس طرح جھگڑ رہے ہیں دونوں۔'' اب کے ماں جی نے اصرار کیا تھا اور عنایا بے بسی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔
فاران کے اس طرح بہن کی حمایت کرنے پر مدیحہ کے اندر تو بھانبھڑ جل اٹھے تھے۔ دن رات میاں کو عنایا اور ماں جی کے خلاف بھڑکاتے بھڑکاتے وہ سمجھنے لگی تھی کہ بہن بھائی کا رشتہ ہی ختم ہوگیا۔ لیکن فاران تو..... تو تو میں میں حد سے بڑھی تو مدیحہ نے بیگ اٹھایا اور بچوں کو لے کر گھر سے چلی گئی۔

☆☆☆

صبح سے شام ہوگئی۔ عنایا نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانکا تھا۔ فاران آڑا ترچھا بیڈ پر لیٹا تھا اور کمرے کی ساری چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ عنایا ماں جی کو بلا لائی تھی جنہوں نے پیار محبت سے فاران کو اس کی زیادتی کا احساس دلایا کہ اسے بیوی پر اس طرح چلانا نہیں چاہیے تھا۔
''پتا نہیں امی! میں آج بہت ٹینس تھا۔ گاڑی بھی لگ گئی تھی تو غصہ زیادہ ہی آ گیا اور پھر میں نے تو عنایا سے بھی اسی لہجے میں بات کی تھی، اس نے تو مائنڈ نہیں کیا۔''
یکا یک فاران کے منہ سے نکلا تھا۔ ساتھ ہی نگاہ عنایا کے بجھے ہوئے چہرے پر پڑی تھی۔ دور کہیں دل میں پشیمانی نے سر اٹھایا تھا۔ نگاہوں میں کتنے ہی موقع لہرا گئے جب اس نے اپنے سخت لہجے سے بہن کا چہرہ مرجھاتے ہوئے دیکھا۔
''یہ کیا ہوگیا ہے مجھے۔ کیوں میں نے اپنے سگے رشتوں کو ٹینشن نکالنے کی جگہ سمجھ لیا ہے۔ بیوی پر تو اسے بہت کم غصہ آتا تھا اور اگر آتا بھی تھا تو وہ دبا جاتا تھا لیکن بہن تو ہر وقت اسے پرائی ذمہ داری محسوس ہوتی۔ اوپر سے مدیحہ ہر وقت اس کی شادی پر ہونے والے خرچوں کا ذکر کر کے دہلاتی رہتی۔ اسے عنایا کے یونی ورسٹی جانے پر بھی اعتراض تھا۔
عنایا چپ چاپ کمرے کی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ ماں جی تسبیح پڑھ رہی تھیں اور فاران اپنا محاسبہ کررہا تھا۔ بہن اور بیوی کے رشتے میں وہ کہاں تک

انصاف کر پایا تھا۔ عنایا اب کوئی ضد کیوں نہیں کرتی۔ پورا رستہ اس نے کوئی بات نہیں کی بلکہ کتنا عرصہ گزر گیا۔ فاران کی عنایا سے کسی قسم کی بات ہوئی ہی نہیں۔ ماں جائے ہوتے ہوئے ایک گھر میں رہتے ہوئے اس قدر دوریاں ہو گئیں، کچھ تو غلط تھا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ چونکا تھا۔ عنایا اور ماں جی اسے سوچوں میں گم دیکھ کر جا چکی تھیں۔

وہ بے آرام سا بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بہت سے منظر اس کے ذہن پر فلم کی طرح چلنے لگے۔

☆☆☆

''بھائی! کل میرے کالج میں فن فیئر ہے۔ مجھے نئے کپڑوں کے لیے پیسے چاہئیں۔'' عنایا آ کر اس کے کندھے پر جھولی تھی۔ یہ اس کی شادی کا نیا نیا زمانہ تھا۔

''ارے عنایا، گڑیا! تمہیں پتا تو ہے، یہ مہینے کا آخر ہے اور تم اپنے بھائی سے ایسی فرمائشیں کر رہی ہو۔''

عنایا کے چہرے پر پھیلی شرمندگی سے اس نے نظریں چرائی تھیں۔

''ٹھیک تو کہہ رہی ہے مدیحہ! ہمارے اپنے بھی تو خرچے ہیں۔ ابھی کل ہی تو مدیحہ نے سردیوں کے کپڑے نہ ہونے کا رونا رویا تھا۔'' اس نے سنگ دلی سے سوچا۔

دوسرے منظر میں مدیحہ بنی سنوری سہیلی کی شادی میں جانے کو تیار کھڑی تھی۔ اور فاران اسے نثار ہوتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دونوں کمرے سے نکلے ہی تھے کہ سامنے عنایا آ گئی۔

''بھائی! امی کی طبیعت صبح سے خراب ہے آپ باہر.....'' بھابھی کے تیکھے چتون دیکھتے ہوئے عنایا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیوں..... کیا ہوا ہے آنٹی کو۔ میں نے خود بخار چیک کر کے دوائی دی ہے۔ سو بخار تھا جو اب اتر چکا ہے۔''

مدیحہ 'فاران کی طرف دیکھتی جلدی جلدی بولی۔

''اور تمہیں برا لگ رہا ہے میرا اور فاران کا باہر جانا تو صاف صاف کہہ دو عنایا! یہ گھما پھرا کر باتیں مت کرو۔''

''نہیں بھابھی! میں تو بس.....''

''کیا بس..... کیا میں جانتی نہیں کہ صبح سے تم نے منہ بنایا ہوا ہے کہ فاران تمہیں ساتھ نہیں لے کے جا رہے۔ نئے کپل کی پرائیوسی تمہیں سمجھنا چاہیے۔ اتنی بچی بھی نہیں ہو اب۔'' وہ طنزیہ بولی تھی۔

''بھابھی! میں تو بس امی کی وجہ سے کہہ رہی تھی ورنہ بخدا میرا اور کوئی مطلب نہیں تھا۔'' عنایا روہانسی ہو گئی۔

فاران بے بسی سے بیوی اور بہن کو دیکھ رہا تھا۔ بحث بڑھتی ہوئی دیکھ کر بے اختیار عنایا کو ڈانٹ دیا۔

''یار عنایا! تم زیادہ بڑی نہ بنو۔ امی کو اعتراض نہیں ہے تو تم بھی رہنے دو۔''

''بھائی! میں تو بس امی کے ہائی بی پی کی وجہ سے پریشان تھی۔''

وہ آہستہ سے کہہ کر رہ گئی کہ مدیحہ فاران کا ہاتھ پکڑے کب کی وہاں سے جا چکی تھی۔

آہستہ آہستہ عنایا نے کسی بھی معاملے میں بولنا چھوڑ دیا۔ سیاست اسے آتی نہیں تھی اور صاف بات یہاں کوئی سننے کو تیار نہیں تھا۔ فاران کو پتا بھی نہ چلا کہ کب وہ اپنی بھولی بھالی بہن کو ایک خرانٹ اور تیز طرار عورت کے روپ میں دیکھنے لگا۔ مدیحہ 'عنایا کی ہر سیدھی بات کو ایسا رنگ دیتی کہ عنایا دیکھتی رہ جاتی۔

شروع شروع میں عنایا — وضاحت کرنے کی کوشش کرتی مگر اب وہ بے حس ہو چکی تھی۔ بھائی بے پروا ہو جائیں تو خاموشی میں ہی عافیت ہے۔

☆☆☆

فاران 'بیوی کو منا لایا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے جیسے کوئی پردہ ہٹ گیا تھا۔ وہ اب باریک بینی سے گھر کا جائزہ لینے لگا تھا بہت کچھ ایسا تھا جو اسے

pklibrary.com

چونکا رہا تھا۔
''یا اللہ! وہ اتنا ناسمجھ ہو گیا کہ اپنی بہن کے صبر کو نہ پہچان سکا۔'' اس دن وہ فاسٹ فوڈ گھر لے آیا۔ مدیحہ کو شاپر پکڑا کے اس نے امی اور عنایا کو بلانے کا کہا۔
''وہ تو نہیں آ رہیں۔'' کچھ دیر بعد مدیحہ نے بتایا۔ ''میں نے ان کا حصہ انہیں دے دیا۔''
''اچھا!'' اس کے دل پر بوجھ سا گرا۔ اب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا بھی مشکل ہو گیا۔
کھانے کے بعد مدیحہ بچوں کے ساتھ مصروف ہو گئی تو اسے یاد آیا کہ کل خاندان میں ایک شادی تھی۔ وہ امی کو یاد دہانی کروانے کے خیال سے امی کے کمرے کی طرف آیا تو دیکھا کہ عنایا اور امی کھانا کھا رہے تھے۔
''یہ کیا آپ لوگ دال چاول کیوں کھا رہے ہیں؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
''کیوں بھائی! کیا ہوا؟ آئیں، آپ بھی کھائیں۔'' عنایا نے سادگی سے بولتے ہوئے اس کے لیے جگہ چھوڑی تھی۔
''نہیں..... میرا مطلب تھا، بچے فاسٹ فوڈ کی فرمائش کر رہے تھے تو میں نے سوچا کہ آپ کے لیے بھی لاؤں۔'' وہ مدیحہ اور فاسٹ فوڈ والی بات چھپا گیا تھا۔
''نہیں بیٹا! اپنے لیے لے آؤ۔ ہم نے تو کھا ہی لیا ہے۔ کیوں عنایا؟'' ماں جی مسکرائی تھیں۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں چمکتا ہوا پرنور چہرہ۔ عنایا نے بے اختیار تائید کی۔
''جی بالکل بھائی! آپ لوگ کھائیں۔ ہمارے لیے نہ لائیے گا۔''
''اچھا۔''
فاران بوجھل قدموں سے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ جو بات کرنے آیا تھا، وہ ذہن سے نکل چکی تھی۔ دل کو لگنے والا دھچکا بہت زوردار تھا جو یہ ماننے پر تیار ہی نہیں تھا کہ جان سے پیاری بیوی اس سے جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔ ساتھ ہی کہیں شک اور پشیمانی نے سر اٹھایا تھا کہ نجانے اس سے پہلے کتنی بار اسے بے وقوف بنایا گیا ہو۔ کیا تھی حقیقت؟ اس نے مٹھی میں اپنے بال جکڑے تھے۔
''کیا ہوا فاران! کیا پریشانی ہے؟'' مدیحہ نے پاس آ کر پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا۔
''آہ!'' کبھی اس ہاتھ کی سجائی پر وہ قصیدہ پڑھا کرتا تھا مگر آج اس نے انتہائی بیزاری سے وہ ہاتھ ہٹایا تھا۔
''کچھ نہیں۔ مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔''
''مگر ہوا کیا؟'' وہ حیران تھی۔
''میں نے کہا ناں، کچھ دیر کے لیے جاؤ اس کمرے سے۔'' مدیحہ کی آنکھیں پھیلی تھیں مگر بہرحال وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔
اس وقت جھٹکے سے دروازہ کھول کر عمر (بیٹا) اندر آیا تھا۔
''پاپا! یہ دو برگرز ایکسٹرا ہیں اور ماما ہمیں یہ کھانے پر فورس کر رہی ہیں۔ پلیز آپ رکھ لیں، ویسے آپ ہمیشہ اتنا زیادہ کھانا کیوں لاتے ہیں کہ ماما کو کام والی آنٹی کو دینا پڑتا ہے۔''
ابھی وہ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس کی آٹھ سالہ بیٹی سارہ روتی ہوئی آئی۔
''پاپا! دیکھیں عمر نے میرا فولڈر خراب کر دیا ہے۔''
وہ عمر کو تنبیہ کرنے ہی والا تھا کہ نگاہ فولڈر پر جم گئی۔
ارے یہ فولڈر تو وہ عنایا کے لیے لایا تھا۔ فولڈر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے وہ حیران تھا۔
''حرا بیٹا! یہ تو پھوپھو کا فولڈر ہے۔''
اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے مہینے گروسری کرتے ہوئے یہ فولڈر دیکھتے ہی اسے عنایا کا خیال آیا تھا۔ نہایت ہی دیدہ زیب رنگوں سے مزین وہ بہت نفیس فولڈر تھا۔ عنایا کو شروع سے ہی مختلف قسم کے قلم اور فولڈر جمع کرنے کا شوق تھا۔ فاران نے وہ فولڈر پیک کروالیا اور مدیحہ کو عنایا کو دینے کا کہا تھا۔
''نہیں پاپا! یہ تو آپ میرے لیے لائے تھے۔

pklibrary.com

مامانے مجھے خود دیا تھا۔'' حرا نے یقین دلایا۔

''اچھا تو یہ فولڈر عنایا کو ملا ہی نہیں۔'' وہ کئی دنوں تک اس کے ایک تھینک یو کا انتظار کرتا رہا اور پھر مایوس ہو کر بددل ہو گیا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے بیڈ پر گر سا گیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم مدیحہ! اور کیوں کر رہی ہو۔ میرے پیار میں کہاں کمی رہ گئی؟''

''مدیحہ!'' یکا یک وہ دھاڑا تھا۔

''جی فاران! کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' مدیحہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''ابھی تو طبیعت واقعی میں ٹھیک ہو گئی ہے۔ یہ بتاؤ تم نے ماں جی اور مدیحہ کو فاسٹ فوڈ کیوں نہیں دیا۔''

''فاران! میں نے دیا.....''

''بس.....'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے دھاڑا تھا۔ ''تم نے نہیں دیا اور اب بتاؤ کیوں؟''

''یہ کس لہجے میں آپ مجھ سے بات کر رہے ہیں۔ بچوں میں لگ گئی تھی، اب بس دینے ہی والی تھی۔'' مدیحہ نے بے اختیار پینترا بدلا تھا۔

''یہ برگر اٹھاؤ اور نیچے دے کر آؤ۔'' وہ حکمیہ بولا تھا۔

''جی اچھا۔'' مدیحہ برگر اٹھائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی ٹیبل پر مدیحہ اس کا فیورٹ ناشتہ تیار کیے اس کی منتظر تھی۔ کچھ بھی تھا مدیحہ کو فاران سے بہت محبت تھی مگر تنگ دلی ایسی کہ وہ اس محبت میں کسی کو شریک نہ کر سکتی تھی۔

''عنایا کو بلاؤ۔ ہمارے ساتھ ناشتہ کرے۔'' فاران کرسی کھینچتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہوا تھا۔

''جی اچھا۔'' مدیحہ فی الحال مزید کوئی جھگڑا نہیں چاہتی تھی، اس لیے اندر کی طرف بڑھی۔

''جی بھائی! آپ نے بلایا تھا۔'' عنایا کچھ حیران سی باہر آئی تھی۔

مدت ہو گئی، وہ اور امی اکیلے کمرے میں ناشتہ کرتے تھے۔ وجہ مدیحہ کا ہر وقت پرائیویسی نہ ہونے کا رونا تھا۔ وہ اکثر باتوں میں لپیٹ کر عنایا اور ماں جی کو سنایا کرتی تھی نتیجتاً وہ دونوں آہستہ آہستہ کمرے تک محدود ہوتی چلی گئیں۔

''ہاں بیٹا! آؤ بیٹھو۔ ناشتہ کرو میرے ساتھ۔'' بھائی کے بیٹا کہنے پر بے اختیار عنایا کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ مدت ہوئی بھائی نے اس دلار سے مخاطب نہیں کیا تھا۔

فاران اس کی آنکھوں کی بے یقینی دیکھ کر شرمندہ ہو رہا تھا اور ایک کے بعد ایک چیز اسے اٹھا کر دے رہا تھا۔

ناشتے کے بعد فاران نے خود عنایا کو پوائنٹ تک چھوڑا اور وعدہ لیا کہ اسے کوئی بھی مسئلہ ہو، سب سے پہلے وہ اپنے بڑے بھائی کو بتائے گی۔

عنایا بے حد خوش تھی۔ اسے لگا اس کے بابا واپس آ گئے۔ فاران یہ سب کر کے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آج گاڑی چلاتے ہوئے اسے کسی پر غصہ نہیں آیا۔ جب دل پرسکون ہو تو باہر کی چھوٹی موٹی پریشانی اثر نہیں کیا کرتی۔ آج اس نے پہلی بار عنایا کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھا تھا۔

اسے احساس تھا کہ اگر وہ اپنی بہن کا ساتھ نہیں دے گا تو دنیا اسے ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں دے گی۔

مدیحہ کے لیے اب بھی اس کے دل میں بہت محبت تھی۔ وہ اس کی اولین چاہت اور اس کے بچوں کی ماں بھی لیکن اب اسے رشتوں میں توازن کرنا تھا۔ اسے کسی کی بھی حق تلفی سے بچنا تھا۔ مرد خاندان کا سربراہ ہے اور قیامت والے دن اس سے اس کے کنبے کے بارے میں سوال ہوگا۔

اسے بابا کی بات یاد آئی تھی۔ سب کچھ بیوی اور بچوں کا ہی ہوتا ہے اور بہنیں ساری زندگی ساتھ نہیں رہتیں۔ رشتوں میں توازن ہی زندگی کا حسن ہے اور یہی زندگی کا امتحان بھی ہے۔ اور وہ اس امتحان میں ناکام نہیں ہوگا۔ فاران نے پرعزم ہو کر سوچا تھا اور قدم آفس کی طرف بڑھا دیے تھے۔

☆

pklibrary.com

عابدہ یونس

خزاں رسیدہ پتے

pklibrary.com

''کیا کر رہے ہیں آپ؟'' عابدہ بیگم نے چہرے پہ نائٹ کریم کا مساج کرتے ہوئے اپنے شوہر کو پکارا۔

حسین صاحب نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''کہ کچھ نہیں فارغ ہوں۔'' ان کی نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھیں۔

''مجھے لگتا ہے ہمیں برہان کی منگنی کر دینی چاہیے۔'' وہ اسی طرح آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''کس سے؟'' ان کی بات پہ وہ چونکے تھے۔ آنکھوں میں حیرانی واضح تھی۔

''رامین سے اور کس سے؟'' عام سے انداز میں کہتی وہ ان کے پاس ہی بیڈ پہ ٹک گئیں۔

''آپ کو میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ میں نے زاہدہ آپا سے رامین کے بارے میں بات کی تھی اور میں رامین کو ہی اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔ برہان بھی یہی چاہتا ہے۔'' وہ کام روک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ عابدہ بیگم لفظ لفظ پر زور دیتے ہوئے تحمل سے بولیں تھیں۔

''تم نے بات کی تھی یا انہوں نے؟'' وہ وقفے سے بولے۔ آنکھوں میں کچھ چبھن تھی۔

''ارے ہم دونوں نے ہی کی تھی اور برہان بھی تو خوش ہے۔'' وہ کڑبڑا گئیں۔

''لیکن میں کچھ اور چاہتا ہوں۔'' وہ مسکرائے اور ان کی طرف دیکھا۔

''میں زینب کو اپنی بیٹی بنانا چاہتا ہوں۔ مجھے زینب سے بہت محبت ہے یہ بات تم بھی جانتی ہو ہے نا!'' حسین صاحب کی بات سن کر عابدہ بیگم کے

مکمل ناول

pklibrary.com

چہرے اور آنکھوں میں غصہ و نفرت ایک ساتھ در آئے۔

''لیکن میں ایسا نہیں چاہتی اور ہاں! میں اپنی بہن کو زبان دے چکی ہوں اور اب میں مکرنا نہیں چاہتی۔'' وہ تنفر سے کہہ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئیں۔

''چلو پھر وقت آنے پر دیکھتے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

حسین صاحب اب شاید کام نہیں کر سکتے تھے اس لیے اٹھ کر بالکونی میں آ گئے، وہاں ہر سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ رات اپنے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ خاموش، پرسکون، اداس۔

ان کے چار بچے تھے۔ برہان، سمیرا، ارمان اور انابیہ۔ انہیں اپنے بچوں سے بہت زیادہ محبت تھی ہر باپ کی طرح۔ لیکن کچھ تھا جو وہ اس معصوم پری زینب کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتے تھے وہ کیا تھا جو اپنے بھائی کی بیٹی سے وہ کرتے تھے۔ محبت یا محبت کی انتہا۔

برہان ڈی ایس پی آف پولیس تھا۔ سنجیدہ، اکھڑ مزاج اور کسی حد تک لاپرواہ۔ وہ باپ کا فرماں بردار تھا لیکن اپنی ماں کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ سمیرا کا گریجویشن مکمل تھا اور وہ فی الحال گھر تھی باقی دونوں بچے ارمان اور انابیہ زیر تعلیم تھے۔

☆☆☆

حسین صاحب کے بڑے بھائی داؤد صاحب اپنے دو بچوں حمزہ اور زینب کے ساتھ گاؤں میں حویلی میں رہتے تھے۔ گاؤں میں رہ کر زمینوں کی دیکھ بھال سب ان کے ذمے تھی اور حسین خود اپنے بچوں کے ساتھ شہر میں رہتے تھے۔

اگلی صبح ..... ناشتے کی میز پر برہان اور عابدہ دونوں بیٹھے تھے۔ حسین کام پر چلے گئے تھے اور باقی تینوں بچے ابھی سو رہے تھے۔ پورے گھر میں قریباً خاموشی کا راج تھا۔

''برہان تمہیں رامین کیسی لگتی ہے؟'' شیریں لہجے میں اپنے لخت جگر کو مخاطب کیا۔

''کیا مطلب ممی؟'' چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ کچھ الجھ کر بولا۔

''میرا مطلب ..... میں رامین سے تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔'' ان کی بات سن کر ایک خوب صورت مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ یعنی کہ سب عابدہ کی مرضی کے مطابق تھا۔

''لو یو ممی ..... آپ ہمیشہ میرے دل کی بات جان جاتی ہیں۔'' وہ ان سے لپٹتے ہوئے بولا۔ پھر سنجیدگی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''ویسے ممی۔ کیا پاپا مان جائیں گے؟'' کسی اندیشے کے تحت وہ بولا۔

''یہی تو ساری پرابلم ہے۔ وہ زینی کو پسند کرتے ہیں اور تم جانتے ہو، مجھے زینی زہر لگتی ہے۔'' ان کے لہجے میں حقارت تھی۔

''ایسے تو مت کہیں ممی! زینی ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ بالکل معصوم سی۔'' سمیرا پتا نہیں کب وہاں آن پہنچی اور انہیں ٹوکا۔

''تم کیوں اس کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو؟ اور کم از کم میرے سامنے اس بے کار لڑکی کی تعریفیں مت کیا کرو۔'' برہان نے انتہائی حقارت سے اس سے کہا۔ سمیرا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اور دوسری طرف عابدہ کا اطمینان دوگنا ہو گیا۔ زینی کی انسلٹ اور وہ بھی سمیرا کے سامنے۔

''بھائی! آپ بھی .....'' وہ غصے سے کہہ کر وہاں سے بنا ناشتہ کیے ہی چلی گئی۔

☆☆☆

پوری حویلی میں صبح کی پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سورج کی سنہری کرنوں نے پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ملازمین اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ زینب اپنے کمرے میں آئینے کے

سامنے کھڑی بالوں میں جلدی جلدی برش پھیر رہی تھی۔ داؤد صاحب ناشتے کے لیے اسے دو تین آوازیں لگا چکے تھے۔ وہ نماز ادا کر کے اب بالوں کو سنوار رہی تھی جلدی جلدی بالوں کی سادہ سی چٹیا بنا کر دوپٹہ شانوں پہ پھیلا کر وہ ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گئی۔ حویلی گاؤں میں تھی لیکن جدید طرز سے بنائی گئی تھی۔ اندر سے وہ بالکل بھی کسی گاؤں کی عمارت نہیں لگتی تھی۔ ڈائننگ ہال بھی جدید طرز سے بنایا گیا تھا۔ داؤد صاحب سربراہی کرسی پر بیٹھے تھے اور دائیں طرف حمزہ بیٹھا تھا۔ زبیدہ خاتون میز پہ ناشتے کے لوازمات سیٹ کر رہی تھیں۔ وہ داؤد صاحب کے بائیں طرف بیٹھ گئی اور نیپکن درست کرنے لگی۔

''دیر تو نہیں کی نا میں نے!'' وہ چہرے پر مسکراہٹ سجا کر بشاشت سے بولی۔

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔ آج تو صرف تین ہی آوازوں پر آ گئی ہو۔'' داؤد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زینب! اوپر والے پورشن کی صفائی کروا دینا۔ اپنی نگرانی میں اوکے!'' انہوں نے نیپکین سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ حمزہ جو وہاں سے جانے لگا تھا ٹھٹھک کر وہاں رک گیا۔ ابرو سوالیہ انداز میں اٹھائے۔

''خیریت بابا۔'' دونوں نے ہم آواز پوچھا۔

''ہاں یار! خیریت ہی ہے۔ بس تمہاری پھپھو عائشہ کچھ مہینوں کے لیے یہاں شفٹ ہو رہی ہیں۔ کیونکہ تمہارے پھوپھا کام کے سلسلے میں لندن جا رہے ہیں۔'' انہوں نے سرسری انداز میں وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ زینب کی تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں کہ مزہ آئے گا۔

''اوکے بابا! پھر میں کورٹ جا رہا ہوں۔ مجھے ضروری کام ہے وہاں اور ہاں میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا ٹھیک!'' حمزہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ زینب اٹھ کر ملازمین کی زیر نگرانی اوپر کے پورشن کی صفائی کروانے لگی اور داؤد صاحب کھیتوں کی طرف چلے گئے۔

☆☆☆

پھپھو بھی گاؤں کی حویلی میں شفٹ ہو گئی تھیں۔ ان کے تین بچے بڑی بیٹی اریشہ، بیٹا حماد اور چھوٹی بیٹی علیشا تھی۔ پھپھو دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھیں۔ اسی لیے ان کی بڑی بیٹی اریشہ زینب کی ہم عمر تھی۔ باقی دونوں بچے چھوٹے تھے۔

''بھائی آپ نے زینب کی شادی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔'' عائشہ پھپھو نے گفتگو کا آغاز کیا۔ مقصد کچھ اور تھا شاید۔

''کیا مطلب؟'' انہوں نے ابرو اٹھائے۔

''میرا مطلب، ہمارے بچے اب بڑے ہو گئے ہیں۔ میں نے اریشہ کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔ زوہیب بھی میری پسند سے اتفاق کرتے ہیں۔ آپ کو بتاؤں وہ کون ہے؟'' وہ رسان سے بولیں۔ داؤد صاحب نے ابرو سوالیہ انداز میں چڑھائے۔

''حمزہ۔'' عائشہ پھپھو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''بھائی میں حمزہ سے اریشہ کی شادی کرنا چاہتی ہوں کیا آپ .....'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ داؤد صاحب مسکرا دیے۔

''عائشہ! تم جانتی ہو، میں بھی تم سے حمزہ کی رائے پوچھ کر ہی بات کرنے ہی والا تھا۔'' خوشی ان کے چہرے سے چھلک رہی تھی، وہ واقعی خوش تھے۔

''اور رہی بات زینب کی تو زینب کے لیے مجھے برہان پسند ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

''لیکن بھائی، عابدہ بھابھی؟ وہ کبھی نہیں مانیں گی۔'' عائشہ نے اندیشہ ظاہر کیا جو واقعی تھا۔

''یہی سوچ کر تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔'' داؤد صاحب سنجیدہ تھا۔

''بھائی! عابدہ نے آپ دونوں بھائیوں کو ساتھ نہیں رہنے دیا۔ حسین کو لے کر شہر چلی گئی، اپنے بچوں کی تربیت میں اس نے ننھیال کے لیے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ کیسے زینب کو قبول کرے

Monthly Shuaa July 2021

گی جس نے کبھی اپنے سسرال کو قبول نہیں کیا۔ اس طرح اگر ہم زبردستی کریں گے تو زینب کو بہت مشکل ہوگی۔'' عائشہ جو کہہ رہی تھیں وہ سو فیصد سچ تھا۔ داؤد صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ یقیناً یہ گفتگو دونوں بہن بھائی رازداری سے آپس میں کر رہے تھے مگر وہاں کھڑی زینب نے یہ لفظ غور سے سنا تھا۔ وہ کچن میں سوئٹ پھلی کا پیکٹ لینے آئی تھی کہ وہ اور اریشہ باتیں کریں گی مگر اریشہ کے ذکر پہ ٹھہر گئی۔ برہان کے ذکر پہ ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیل گئی۔ سیاہ آنکھیں بھی ویران سی ہوگئی تھیں۔

پھپھو کی اپنے دیور یا جیٹھ میں سے کسی کے بھی گھر نہ جانے کی وجہ تو وہ جانتی تھی کہ وہ کیوں وہاں نہیں گئیں۔ پر ایک بات اسے پریشان کر رہی تھی وہ تھی اریشہ اور حمزہ کے رشتے کی بات.....!

کسی بھی ماں کے لیے اس کی اولاد بوجھ نہیں ہوتی پھر پھپھو خود اپنے منہ سے اپنی بیٹی کا رشتہ..... عجیب بات تھی۔ وہ قدم قدم زینے عبور کر رہی تھی اسے ضرور اریشہ سے یہ بات کلیئر کرنی چاہیے، ہوسکتا ہے اریشہ خوش نہ ہو، وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو؟ ہو بھی سکتا ہے؟

اس نے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ اجازت پا کر وہ اندر داخل ہوئی اریشہ بیڈ پہ لیپ ٹاپ سامنے کیے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی اور لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ کچھ دیر تو وہ آپس کی باتیں کرتی رہیں پھر زینی اپنی بات کی طرف آئی۔

''اریشہ! وہ میں نے پوچھنا تھا کہ.....'' وہ اٹک رہی تھی۔

''کیا بات ہے زینی! بے فکر ہو کے پوچھو جو پوچھنا ہے تم نے۔'' اریشہ نے اس کو اطمینان دلایا۔

''اریشہ! کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟'' اس کی بات سن کر اریشہ کا رنگ اڑ گیا۔ اتنا بے تکا سوال اور وہ بھی..... اتنی اچانک۔

''کیا مطلب.....؟'' وہ ہونق ہوئی پوچھ رہی تھی۔

''میرا مطلب..... اگر پھپھو تم سے پوچھے بنا ہی تمہارا کسی سے رشتہ طے کر دیں تو تمہیں کیسا لگے گا؟'' زینب اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے تحمل سے بولی۔

اریشہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

''زینی! ممی نے ایک دفعہ مجھے موقع دیا تھا کہ میں اپنی زندگی کے اس فیصلے کے بارے میں سوچوں۔ میں نے ممی کے کہنے کے مطابق سوچا تو..... وہ رکی۔ ''مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے کزن عمر کے بنا زندگی نہیں گزار سکوں گی۔ عمر کا والہانہ پن دیکھ کر بھی مجھے ایسا ہی لگتا تھا کہ ہم دونوں کی کنڈیشن سیم ہے۔ پھر ایک دن اچانک جانتی ہو، کیا ہوا؟''

وہ جو خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی چونکی۔ اریشہ اس کے پاس سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس رکھے میرون صوفے پہ بیٹھ گئی۔ آنسو اس کی آنکھ کے کنارے پہ اٹکا تھا۔ زینب کا دل اداس ہوگیا۔ (اسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔) وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

''پھر ایک دن اچانک ہمیں خبر ملی کی دادا کے نام تمام جائیداد میرے چچاؤں نے بیچ دی ہے اور میرے دونوں چچا اب بیرون ملک شفٹ ہو رہے تھے۔ انہوں نے اس جائیداد میں سے ہمیں کچھ نہیں دیا، تینوں بھائیوں کا کاروبار بھی مشترکہ تھا۔ انہوں نے وہ سارا کاروبار دوسرے ملک شفٹ کر دیا۔ وہ دن ہمارے لیے سوگ کا دن تھا۔ ماتم کا دن..... عمر نے مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا تھا۔ پاپا، ممی، میرے بہن بھائی دونوں چچا اور ان کی فیملیاں سب وہاں تھے۔ اس نے پاپا کو کیا پتا ہے کیا کہا تھا۔

''سنبھالیں اپنی بیٹی کو۔ پیچھے پڑی ہوئی ہے میرے۔ ارے، وہ تو میں ہی اسے گھاس نہیں ڈالتا ورنہ یہ تو اب تک پتا نہیں کیا کچھ چکی ہوتی۔ پھر پتا ہے میں نے کیا کیا تھا؟'' وہ خاموش ہوئی تو دو آنسو لڑھک کر گالوں پہ بہہ نکلے زینی اٹھ کر اس کے پاس

pklibrary.com

بیٹھ گئی۔

''میں نے اسے ایک تھپڑ مارا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کا فیصلہ اپنی ممی اور پاپا پہ چھوڑ دیا۔ والدین جو کرتے ہیں کم از کم ہم اولاد سے بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔''

اریشہ کے ہاتھ زینی کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ بے یقین نگاہوں سے اس بہادر لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس نے اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی خود کو ٹوٹنے نہیں دیا تھا، لہجہ وہی تھا شیریں، محبت بھرا... نرم گرم سا۔ پھپھو بھی بہت بہادر تھیں جنہوں نے سخت حالات میں ہمت نہیں ہاری اور اپنا سارا زیور بیچ کر اپنے شوہر کو دوبارہ کاروبار کرادیا۔ بلاشبہ آج زوہیب پھوپھا ایک کامیاب بزنس میں تھے اور اس کے پیچھے ایک مضبوط عورت کا ہاتھ تھا۔

☆☆☆

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ پھپھو کو آئے ایک ماہ ہوگیا تھا اور انہیں پتا بھی نہیں چلا تھا۔ گھر میں اب رونق لگی رہتی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پہ اب تین افراد کے بجائے سات افراد ہوگئے تھے۔ حمزہ اپنی مصروفیات میں رہتا تھا اور اس کے ساتھ ہی حماد بھی.....

زینی، اریشہ اور علیشا کو کہیں نہ کہیں لے کر جاتی ہی رہتی تھی کہ کہیں وہ بور ہی نہ ہوجائیں۔ آج بھی وہ ابھی گھر آئی تھیں۔ شام اتر رہی تھی باغیچے میں ہر سو گلابی پن چھایا ہوا تھا۔ آج پھر اس نے پاپا اور پھپھو کو برہان کے بارے میں بات کرتے سنا تھا۔ بابا کو اپنے بھتیجے سے بہت سی امیدیں تھیں۔ شاید.....

جب بھی وہ اس شخص کا ذکر سنتی اس کا دل اداسی کے سمندر میں غوطے لگانا شروع کردیتا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے کبھی اسے خود سے مخاطب نہیں کیا تھا اور اگر وہ کرتی تب بھی خشک مزاجی سے جواب دیتا۔ کیوں کرتا تھا وہ ایسا؟ زینی کبھی نہیں جان پائی تھی۔ کتنی ہی دیر سے کھڑی وہ یہی سوچے جارہی تھی بے وجہ..... خیالات کو جھٹک کر وہ وارڈروب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹانے لگا زور زور سے۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی دروازے کی طرف بڑھی۔

''کیا بات ہے پھپھو! آپ.....'' وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔ پھپھو کے چہرے پہ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

''زینی! جلدی آؤ۔ تمہارے بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' وہ انتہائی عجلت میں باہر کی سمت بھاگی۔ خوف، ڈر، دہشت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ گھر میں مرد کوئی بھی نہیں تھا سوائے داؤد صاحب کے۔

☆☆☆

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ ہاسپٹل کے کوریڈور میں سر ہاتھوں میں دیے بس خاموش آنسو بہائے جارہی تھی۔ حمزہ کو فون کر کے اس نے وہیں بلالیا تھا، کیا ہو رہا تھا، کیا کرنا تھا اسے کچھ علم نہیں تھا بس وہ یہ جانتی تھی کہ داؤد صاحب کو سی سی یو میں ایڈمٹ کیا گیا تھا۔ باقی کی بھاگ دوڑ حمزہ کر رہا تھا۔ رات گہری ہوتی جارہی تھی۔ چچا کو فون کردیا گیا تھا لیکن وہ ابھی تک پہنچے نہیں تھے۔ پھپھو اس کے ساتھ ہی بینچ پہ بیٹھی اسے حوصلہ و ہمت کرنے کی نصیحت کر رہی تھیں۔ حماد کو گھر اریشہ اور علیشا کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا، شیشے کے اس پار داؤد صاحب کا وجود بے حس و حرکت پڑا تھا۔

کتنی گھڑیاں بیتیں، کتنے گھنٹے گزرے اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ بس اندھیرا چھا رہا تھا، وہ واپس بینچ پہ آ بیٹھی تھی۔ وہ سن دماغ کے ساتھ بیٹھی تھی جب اسے چچا صاحب تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دکھائی دیے وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھپھو وہاں نہیں تھیں شاید کہیں گئی تھیں۔ حمزہ ڈاکٹروں سے الجھ رہا تھا۔ وہ حسین صاحب کے سینے پہ سر رکھ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رودی۔ چچا اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہے تھے۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اب کیسے ہیں بھائی۔ کچھ بتایا نہیں ڈاکٹرز نے؟'' حسین

pklibrary.com

صاحب اس سے الگ ہوئے اور حمزہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ حسین صاحب کے جانے کے بعد ان کے عقب میں کھڑے برہان پہ نظر پڑی تو وہ دنگ رہ گئی۔ خونی رشتوں سے محبت فطری بات ہوتی ہے۔ خون جو واقعی پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے تایا ابا کی محبت میں چلا آیا تھا، توقع کے خلاف بچی نہیں آئی تھیں۔ برہان نے اس سے کوئی بات نہیں کی نہ ہی اس نے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ وہ خاموشی سے وہاں بنچ پر بیٹھ گئی۔

"عابدہ نہیں آئی؟"

"میکے میں کوئی فنکشن ہے اسے اٹینڈ کرنا تھا اس لیے۔"

"لیکن اسے آنا چاہیے تھا۔" وہ چونکی، اس کے ساتھ بیٹھی عائشہ کو عابدہ چچی کے نہ آنے کا دکھ تھا۔ ان کی بات سن کر دل اور بھی ویران ہوگیا۔

صبح کے قریب داؤد صاحب خطرے سے باہر آ گئے تھے۔ ہر طرف جیسے روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ خوش تھی بے حد خوش۔ داؤد صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی روتی رہی۔ حسین صاحب نے اسے اور حمزہ کو گھر بھیج دیا کہ رات کے تھکے ہوئے تھے۔ گھر آ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ وہ فجر کے وقت سوئی تھی سو جلدی آنکھ نہ کھل سکی۔ وہ صبح بہت سنہری، نرم گرم سی طلوع ہوئی تھی۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر ہسپتال چلی گئی کہ جا کر پھپھو اور چچا کو گھر بھیجنا تھا۔ حمزہ اس کے ساتھ تھا۔ ہسپتال میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ ڈاکٹرز اور نرسیں ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ داؤد صاحب کو پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ حسین چچا، عائشہ پھپھو اور داؤد صاحب حتی کہ برہان بھی وہاں خاموش بیٹھے تھے۔ برہان ابھی تک یہیں تھا وہ گیا نہیں؟ اسے حیرانی ہوئی۔

داؤد صاحب بہت کمزور اور بوڑھے لگنے لگے تھے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا کیوں؟ عام طور پر کسی بڑی پریشانی کے باعث ہارٹ اٹیک ہوتا ہے لیکن انہیں کیا پریشانی تھی؟ وہ بس سوچ رہی تھی۔ پھر وہ ہوا جس کا اس نے گمان بھی نہ کیا تھا۔ برہان سے نکاح اوہ خدایا! لمحے بھر میں سب کچھ بدل گیا۔ برہان کی چبھتی نگاہیں، سب کی خاموشی اسے سب سمجھ میں آنے لگا۔ "داؤد صاحب کی یہ پریشانی تھی اس کے دل نے کہا۔ یہ رکھ دیا۔ وہ رونا چاہ رہی تھی لیکن رو نہیں سکتی تھی۔ بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن بھاگ نہیں سکتی تھی کیا کرے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہسپتال میں ہی نکاح ہوگیا۔

وہ ایک پل میں ہی زینب داؤد سے زینب برہان ہوگئی۔ وہ ابا سے ملنے ان کے کمرے میں گئی۔ برہان اب بھی اسے ایسے ہی گھور رہا تھا جیسے زبردستی یہ سب کروایا ہو۔ البتہ ابا، چچا اور پھپھو کی خوشی چہرے سے ہی چھلک رہی تھی۔ یہاں تک کہ حمزہ بھی بہت خوش تھا۔ وہ حمزہ کے ساتھ واپس گاڑی میں آ بیٹھی اسے گھر جانا تھا اب۔

"برہان خوش نہیں ہے لیکن آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اپنی خالہ زاد سے منسوب تھا شاید اس لیے۔" اس نے پوچھا نہیں تھا حمزہ خود ہی بتانے لگا۔ آخری بات پہ چونک کے اس نے اسے دیکھا۔ پھر گردن موڑ کے باہر دیکھنے لگی۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

"کیا ہوا؟ تم خوش نہیں ہو؟" حمزہ اس کی خاموشی پر فکر سے پوچھنے لگا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" کئی آنسو اپنے اندر اتارے۔ مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔ زبردستی کسی کے نام کے ساتھ اس کا نام جوڑ دیا گیا تھا خوش کیسے ہوتی بھلا! خیر! سچ وہ بول نہیں سکتی تھی اور جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی الٹا سوال کر دیا۔

"دیکھو زینی! میں تمہارا بھائی ہوں۔ لیکن بھائی سے پہلے میں تمہارا دوست ہوں۔ گہرا دوست۔ بیسٹ فرینڈ۔ تم پہلے بھی مجھ سے باتیں شیئر کرتی تھیں

اور اب کی بھی پہ یقین کرنے مجھے سب بتا دی ہو بوم کہنا چاہتی ہو۔ بولو! کیا بات ہے۔"

وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ اس نے گردن موڑ کے حمزہ کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہا تھا اسے کچھ تسلی ہوئی۔

"حمزہ! برہان کے دل میں ہمیشہ ہمارے خلاف نفرت ہی پیدا کی ہے چچی نے۔ وہ اب بھی ہم سے نفرت ہی کرتا ہے اور تم دیکھنا وہ ہمیشہ مجھ سے نفرت کرتا رہے گا۔" لاکھ ضبط کے باوجود بھی اس کے آنسو بہہ نکلے۔ حمزہ نے جیسے افسوس سے اسے دیکھا۔

"احمق لڑکی۔"

"اوہ زینی! اگر ایسی بات ہوتی تو وہ تایا ابا کی طبیعت خرابی کا سن کر دوڑا نہ چلا آتا بھی تو چچی کے ساتھ جا سکتا تھا فنکشن میں۔ پر وہ نہیں گیا اسے فکر تھی ابا کی، اسی لیے وہ یہاں آ گیا۔" حمزہ نے تفصیل سے اسے سمجھایا۔

"حمزہ! چچی نے ہمیشہ ان کو ہم سب سے دور رکھا ہے۔ اور تم دیکھنا اب بھی وہ ایسا ہی کریں گی۔ وہ اپنی بھانجی کی جگہ مجھے کبھی قبول نہیں کریں گی اور اب تم یہ مت کہنا کہ برہان کے ساتھ زبردستی نہیں کی گئی۔" وہ گھر پہنچ گئے تھے۔

"زینی! چچی نے ہمیشہ انہیں دور رکھا یہ بات میں مانتا ہوں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہ لوگ بمع فیملی یہاں گاؤں میں اس حویلی میں شفٹ ہو رہے ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتا گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے لگا۔ اس کی بات نے زینب کو چونکایا۔ وہ گاڑی سے اتری اور اندر جانے کے لیے مڑی۔ حمزہ نے اسے عقب سے پکارا۔

"رہی بات برہان کی۔" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تحمل سے بولنے لگا۔ "تو تم ایک بہت اچھی اور بہادر لڑکی ہو۔ اس کی ناپسندیدگی و نفرت کا آسانی سے مقابلہ کر لوگی۔"

چاروں طرف شام اتر رہی تھی لیکن ابھی کچھ اجالا باقی تھا اس نے دل میں۔

حمزہ کو کتنا یقین تھا اس پہ۔ اتنا تو خود اسے نہیں تھا۔ ایک دو دن میں داؤد صاحب بھی ڈسچارج ہو جائیں گے چلو خیر! ابا آ جائیں گے تو چچی کے طنز و طعنے کا مقابلہ بھی کر ہی لے گی۔ تمام سوچوں کو جھٹک کر وہ زینے چڑھنے لگی۔ دو دن سے ٹھیک سے اریشہ سے بات بھی نہیں ہو سکی تھی آخر کو ہونے والی بھابھی تھی۔

☆☆☆

عابدہ بیگم اپنے بھتیجے کی منگنی کے فنکشن سے رات گئے واپس آئی تھیں۔ داؤد صاحب کو ایک دن بعد ڈسچارج کیا جانا تھا۔ برہان اور حسین صاحب گھر آ گئے تھے۔

برہان قدرے مضطرب تھا اور حسین صاحب مطمئن، وہ دونوں آتے ہی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ عابدہ بیگم کو جب سے نکاح کا علم ہوا تھا وہ پورے گھر میں غصے سے دندناتی پھر رہی تھیں۔ سمیرا دل ہی دل میں خوش تھی لیکن ماں کے غصے سے خائف اپنی خوشی ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ نے اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بنا کیا بھی کیسے؟ آپ کو میرا ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ آپ کی ایک بیوی بھی ہے، اس کی رائے بھی اہم ہے۔ لیکن نہیں جو دل کرتا ہے وہ کرتے ہیں آپ!" وہ انتہائی غصے سے ہاتھ نچا نچا کر بول رہی تھیں، آواز قدرے اونچی تھی۔ حسین صاحب نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر لیپ ٹاپ پہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

"اور آپ کو میں نے بتایا تھا نا کہ میں نے زاہدہ آپا کو زبان دی ہوئی ہے اس کے باوجود آپ نے اس اسٹوپڈ لڑکی سے برہان کا نکاح کر دیا جسے میں تو کیا برہان بھی ناپسند کرتا ہے۔" وہ غصے سے نفرت میں ڈوبے لہجے سے کہہ رہی تھیں۔ وہ اس وقت سب بھول گئی تھیں۔ شوہر کا ادب، عزت و احترام سب کچھ یاد تھا تو صرف اپنی بہن سے کیا وعدہ....."اور میں

pklibrary.com

نے بھی یہ کہا تھا کہ میں زینب کو پسند کرتا ہوں برہان کے لیے۔'' وہ انتہائی ضبط سے بولے نگاہیں اب بھی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ ان کا یہ انداز..... عابدہ بیگم کے تو تلوؤں پہ لگی سر پہ بجھی۔

''اور میں اس جاہل لڑکی کو اپنی بہو قبول نہیں کر سکتی فار گاڈ سیک!'' انتہائی بدتمیزی سے چلاتے ہوئے کہا۔

''بس! خاموش ہو جاؤ۔ تم نے ہمیشہ اپنی مرضی کی ہے وہ کیا جس میں تمہیں خوشی ملے۔ میرا کا رشتہ اپنے بھائی حمید کے بیٹے ارسل سے طے کر دیا۔ میں نے اعتراض کیا؟ تم مجھے میرے بھائی سے دور شہر اپنے میکے کے قریب لے آئیں، اپنے بچوں کو میرے بھائی، بچوں سے دور رکھا۔ کبھی میں نے اس بات پر اعتراض کیا بتاؤ! نہیں کیا ناں، تو پھر اب تم میرے فیصلے پر کیوں کر اعتراض کر سکتی ہو۔'' وہ چلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عابدہ سہم سی گئیں۔ اپنے شوہر کو پہلی بار اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

''آپ..... آپ کی جاب بھی شہر میں..... میرا مطلب یہاں تھی اور برہان کی جاب بھی اسی علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ہے۔'' تر زبان خشک ہونٹوں پر پھیرتے وہ بمشکل کہہ پائیں۔ حسین صاحب نے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

''میں نے ریزائن دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہاں بھائی کا کاروبار سنبھالوں گا جا کر۔'' وہ چبا چبا کر بولے۔ عابدہ کے چہرے کی رنگت پہلے بھی زیادہ پھیکی پڑ گئی۔

''ہم گاؤں نہیں جائیں گے۔ پہلے ہی اس Mess کی وجہ سے ہماری اچھی بھلی زندگی ڈسٹرب ہو کے رہ گئی ہے، اب رہی کسر یہاں سے وہاں شفٹ ہو جانے سے پوری ہو جائے گی۔ میں اور بگاڑ نہیں چاہتی اپنی زندگی میں۔'' وہ انتہائی ضبط سے قدرے اونچی آواز میں بولیں۔ برہان اور زینب کا نکاح عابدہ کی نظر میں کھٹکا تھا یہ بات حسین کا دماغ گھمانے کے لیے کافی تھی۔

''تم چاہو تو یہاں رہ سکتی ہو اپنے میکے میں۔ میں اور میرے بچے کل ان شاء اللہ گاؤں شفٹ ہو جائیں گے۔'' انتہائی حقارت سے کہتے وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔

عابدہ جو وہاں صوفے کے پاس کھڑی تھیں کھڑی نہیں رہ سکیں۔ بیٹھ گئیں۔ آنسو رخساروں پر بہہ نکلے۔

☆☆☆

صبح کی شفاف کرنوں نے پورے حسین ہاؤس کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ گھر کے تمام افراد اپنے اپنے معمول کے کاموں میں مشغول تھے۔ عابدہ بیگم کا چہرہ ستا ہوا تھا یقیناً رات کی تمام باتیں انہیں ازبر تھیں۔ حسین صاحب خاموشی سے ناشتہ کر رہے تھے۔ انابیہ اور ارمان اپنے اپنے اسکول جا چکے تھے۔ برہان شاید ابھی تیار ہو رہا تھا۔ سمیرا اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئی وہ آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں برش پھیر رہا تھا۔

''ہائے برہان! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کتنی خوش ہوں۔ پاپا نے بہت اچھا فیصلہ کیا تم دونوں کا نکاح کر کے۔ یو نو برہان! زینی ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہیں کبھی مایوس.....'' برہان نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے اور یہ بات بھی تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ میں رامین میں انٹرسٹڈ ہوں۔ ہے نا! جلد یا بدیر رامین میری زندگی میں شامل ہو جائے گی۔ آئندہ میرے سامنے یہ زینب نامہ مت شروع کرنا۔'' وہ غصے میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ غصہ برہان کی آنکھوں میں واضح تھا۔

''کیا مطلب؟ تم..... زینی کو..... اپنی زندگی سے.....'' بے یقینی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''نکال دوں گا۔ بالکل نکال دوں گا۔'' اس کا ادھورا جملہ برہان نے ادا کیا۔ اتنی نفرت کرتا تھا وہ زینب سے.....

لہجہ کمزور تھا۔ برہان خاموش رہا۔ وہ اب الماری سے اپنے ضروری کاغذات نکال رہا تھا۔

''تمہیں اور پاپا کو کیا لگتا ہے کہ میں ایک جاہل اور اسٹوپڈ لڑکی کے ساتھ پوری زندگی گزار لوں گا وہ بھی آپ دونوں کو خوش کرنے کے لیے۔ نہیں سمیرا پلیز میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' وہ انتہائی بدتمیزی سے کہتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ اتنی نفرت کیوں کرتا ہے زینب سے کیوں؟ یہ سوال وہ خود سے پوچھتی الجھ رہی تھی۔ ہر چیز پر جیسے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ وہیں الماری کے پاس کھڑی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔

☆☆☆

''عابدہ! جب ایک لڑکی کی شادی ہوجاتی ہے تو وہ صبر کے ساتھ اپنے ماں باپ کے گھر کو چھوڑ کر ایک بالکل پرائے گھر میں آجاتی ہے۔ صرف اور صرف اپنے شوہر کے لیے جس سے اسے جوڑ دیا دیا جاتا ہے۔ وہ وقت ایسا ہوتا ہے جب سب اس کے لیے اجنبی ہوتے ہیں وہ جانتی ہے تو صرف اپنے شوہر کو۔'' عابدہ بیگم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں تھامے وہ اس قدر نرمی سے بول رہے تھے کہ جیسے ایک دن پہلے کوئی تلخ کلامی نہ ہوئی ہو۔

''تب اس عورت کو چاہیے کہ وہ صرف اور صرف اپنے شوہر سے محبت کرے میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اسے اپنے والدین بہن بھائیوں سے نفرت کرنی چاہیے۔ بلکہ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اسے اپنے سسرال میں تعلقات بڑھانے چاہئیں۔'' ڈائننگ روم کی ایک کھڑکی جو ان کی طرف کھلتی تھی اس سے روشنی چھلک رہی تھی۔ عابدہ بیگم خاموشی سے اپنے شوہر کو سن رہی تھیں۔

''ہم آج شام کو گاؤں چلے جائیں گے۔ میں نے ایک غلطی کی تھی اب اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتا۔ وہاں تمہیں اور بچوں کو ہر آسائش ملے گی جو یہاں ملتی ہے۔ ٹھیک!'' وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر کی رہیں کہا کچھ نہیں۔

''میں امید کرتا ہوں کہ مسز عابدہ حسین میرے اس فیصلے سے اختلاف نہیں کریں گی۔'' چوکھٹ پر کھڑے ہوکر وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔ انہوں نے بھی پھیکی مسکراہٹ سے شوہر کا ساتھ دیا۔

☆☆☆

شام کا گلابی پن ہر سو اتر آیا تھا۔ سورج کا گولا بس ڈوبنے کو ہی تھا۔ حسین صاحب اور ان کی فیملی اپنے ساز و سامان کے ساتھ سرخ حویلی کے سامنے بنی اینٹوں کی سڑک پر کھڑی تھی۔ چوکیدار نے جھٹ سے تابعداری کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ گھر کے تمام مکین استقبال کے لیے تیار تھے ماسوائے زینب کے، طبیعت کی خرابی کے باعث وہ اپنے کمرے میں آرام کررہی تھی۔ اریشہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچی۔

''زینی! اٹھو جلدی سے، چھوٹی ممانی اور ماموں آگئے ہیں۔'' وہ اسے جھنجوڑ کے اٹھا رہی تھی۔ زینب ہربڑا کے اٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نکلی تو چہرہ دھلا ہوا اور آنکھیں خمار آلود تھیں۔

''کہاں ہیں؟'' آہستہ آواز میں اریشہ سے پوچھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''آؤ جلدی سے، وہ ابھی تو پورچ میں ہی ہوں گے۔'' وہ اسے لیے تیزی سے باہر نکلی۔

''زینی! تم جانتی ہو نا کہ اب تمہارا ان سے رشتہ بدل گیا ہے۔ تمہیں ان کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا ہوگا ورنہ.....'' زینب تو اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی بات پر سر ہلا کر رہ گئی۔

''زینی! طبیعت کیسی ہے اب تمہاری، آنکھیں بھی سرخ ہورہی ہیں۔'' اریشہ ٹھہر کے اس سے پوچھنے لگی۔ زینب جانتی تھی کہ وہ موضوع بدلنے کے لیے ایسا کہہ رہی ہے۔

''ہاں، پہلے سے کافی بہتر ہے۔ بس سر میں ہلکا درد ہے۔ بخار تو تقریباً اتر گیا ہے۔'' اس نے تفصیلا

pklibrary.com

کہا۔ دونوں اب ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی تھیں۔ سب سے ملنے کے بعد وہ دونوں بھی ایک طرف سمیرا کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''آپ کا سفر کیسا رہا بھابھی!'' پھپھو، عابدہ بیگم سے مخاطب تھیں۔ جواب قدرے پرسکون لگ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں آنے سے پہلے ان کے چہرے پر موجود بے زاری غائب ہو چکی تھی۔

''پھپھو میں آتی ہوں ابھی۔'' وہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھی۔ جس کا انتظار تھا وہ شاید باہر ہو۔

''بھائی! ابھی تک کیوں نہیں آیا۔'' پھپھو نے اس کے دل کی بات کہی تھی۔

اس کے قدم آہستہ ہو گئے۔

''عائشہ! وہ رات کو آئے گا۔'' چوکھٹ عبور کرتے ہوئے اسے چچا کی آواز سنائی دی۔ وہ کچن میں آ گئی جہاں زبیدہ خاتون مہمانوں کے لیے مختلف لوازمات ٹرالی میں سجا رہی تھیں۔ وہ ٹرالی دھکیلتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

ان ہی سوچوں میں غلطاں وہ اندر داخل ہوئی۔ چچا بابا کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور چچی خاموش ہی تھیں۔ سمیرا اور اریشہ دونوں محو گفتگو تھیں جبکہ انابیہ خاموش..... ارمان حمزہ کی بغل میں بیٹھا تھا اور اس کے بائیں جانب حماد، صرف دو افراد وہاں نہیں تھے۔

''عائشہ! تمہاری بات ہوئی زوہیب بھائی سے کب آئیں گے وہ۔''

وہ چائے دے رہی تھی سب کو، تب اس کے کانوں سے عابدہ چچی کی آواز ٹکرائی۔ ان کا لہجہ عجیب تھا وہاں بیٹھا ہر شخص ان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھپھو کچھ شرمندہ سی بھی تھیں۔ اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔

''چچی! وہ چار ماہ بعد آئیں گے اور بابا نے کہا ہے تب تک یہ یہیں رہیں گی۔ ان کے یہاں رہنے سے ہمارا گھر پررونق ہو گیا ہے۔'' اس نے چائے کا کپ ان کے سامنے کرتے ہوئے تحمل سے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ عابدہ پھیکا سا مسکرائیں۔

''زینب بیٹا! داؤد بھائی اپنے کمرے میں سو رہے ہیں؟'' حسین صاحب نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کے لیے زینب کو مخاطب کیا۔

''نہیں شاید وہ جاگ رہے ہیں۔'' وہ ان کی طرف گھومی۔

''ٹھیک ہے پھر میں ان کے کمرے میں جا رہوں۔ آپ لوگ بھی چائے ختم کر کے وہیں آ جاؤ۔'' وہ باہر کی طرف بڑھ گئے۔ پھپھو بھی اٹھ کر کچن میں آ گئیں۔ ان کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ سب وہاں سے چلے گئے۔ وہ بھی اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ جانتی تھی پھپھو کام کر رہی ہوں گی۔

''پھپھو پلیز۔ آپ مما کی باتوں کا برا مت مانیے گا۔'' وہ ابھی باہر ہی تھی جب اس کے کانوں سے سمیرا کی آواز ٹکرائی جو پھپھو کے ہاتھ تھامے شرمندگی سے کہہ رہی تھی۔ پھپھو مسکرا دیں۔

''نہیں میرے بچے! برا ماننے والی تو کوئی بات نہیں کہی تھی انہوں نے اور تم بالکل بھی شرمندہ مت ہو۔ جاؤ اپ اپنے بابا کے کمرے میں جا کر بیٹھو۔'' پھپھو نے اس کا گال تھپتھپایا۔ زینب اسی وقت اندر داخل ہوئی۔

''پھپھو! آپ یہاں کیوں کام کر رہی ہیں؟'' آپ بابا کے کمرے میں جائیں، سب وہاں بیٹھے ہیں گپ شپ لگائیں۔ کھانا زبیدہ خاتون خود بنا لیں گی۔'' وہ پھپھو کے پاس جا کر کھڑی ہوئی جو چاول دم پر رکھ رہی تھیں۔ پھپھو نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

''بیٹا! میں تو صرف دیکھ رہی ہوں۔ کھانا تو زبیدہ نے ہی بنایا ہے اور ویسے بھی عورت جب تک کھانے میں چمچ نہ ہلائے اس کے بچوں کو کھانے میں ذائقہ نہیں آتا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہا۔ زینب اب شیلف پر سلاد کے لیے رکھی سبزیاں کاٹ رہی تھی۔

''پھپھو! زبیدہ بھی تو عورت ہے۔'' اس نے جیسے پھپھو کو یاد دلایا۔

pklibrary.com

"نہیں میرے بچے! زبیدہ کے ہاتھ کے بنے کھانوں کا ذائقہ اس کے بچوں کو آئے گا۔ میرے ہاتھ کے بنے کھانوں کا ذائقہ آپ لوگوں کو آئے گا۔" پھپھو اب اس کے ساتھ سبزیاں کٹوانے لگی تھیں۔ وہ جو توجہ سے ان کی بات سن رہی تھی سر ہلا کر رہ گئی۔

جلدی جلدی سلاد بنا کر وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل پر برتن سیٹ کرنے لگیں۔ اسی اثنا میں گاڑی کے ہارن کی آواز آئی اور پھر..... گیٹ کے کھلنے کی۔ اس کا دل اس پل زور سے دھڑکا۔ گھر کے تمام افراد بابا کے کمرے میں تھے تو آنے والا یقیناً برہان تھا۔

کچن اور لاؤنج کے درمیان تقریباً تین فٹ کی دیوار تھی (آدھی کھلی) اور کچن سے ملحقہ ہی ڈائننگ روم تھا جہاں وہ ٹیبل پر برتن لگا رہی تھی۔ لاؤنج سے گزر کر ڈرائنگ روم اور باقی کمروں میں جایا جاتا تھا۔ گاڑی اب پورچ میں پہنچ گئی۔ وہ ساتھ ساتھ کام کرتی اور کن انکھیوں سے لاؤنج کی طرف بھی دیکھتی۔ عین اسی وقت شیشم کی لکڑی کے بنے لاؤنج کے بھاری دروازے میں چرچراہٹ پیدا ہوئی اور اس کا دل زور سے دھڑکا۔ پھپھو بھی آواز کو لاؤنج میں چلی آئیں اور خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا۔ زینب وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ نظروں کی تپش محسوس کر کے برہان نے بھی اس کی طرف دیکھا اور بے زاری سے منہ پھیر لیا۔ زینی گڑبڑا کر جلدی جلدی کھانا لگانے لگی۔

وہ پولیس یونیفارم میں اس کی سوچ سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس کی سیاہ خوب صورت گہری آنکھیں۔ اٹھی ہوئی مغرور ناک چہرے کے واضح نقوش وہ واقعی بہت ہینڈسم تھا۔ زینب نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ اس کی بے زاری جانچ چکی تھی۔

کچھ دیر بعد سب ڈائننگ روم میں آنا شروع ہو گئے سب اپنی اپنی کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ داؤد صاحب کو بھی لایا گیا تھا۔ وہ سربراہی کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں طرف حسین صاحب اور بائیں طرف عابدہ بیگم، پھپھو کچن پچائے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ زینب آداب میزبانی ادا کر رہی تھی۔ جس کو بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی وہ اسے دیتی۔ کچھ دیر بعد وہ آتا دکھائی دیا۔ اب اس نے نیلی جینز کے اوپر گہرا نیلا سوئیٹر پہنا ہوا تھا۔ بال سلیقے سے ماتھے پر جمائے ہوئے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے داؤد صاحب کی طرف بڑھا یقیناً وہ ان سب سے اب مل رہا تھا۔

"زینب! اس جگ میں پانی لے کر آنا۔" ابھی اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سالن کے باؤل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ پپی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ سر ہلا کر جگ لیے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پھپھو اٹھ کر برہان کو کھانا پیش کرنے لگیں۔ عابدہ نے جان بوجھ کر اسے بھیجا تھا وہاں بیٹھے ہر سمجھ دار شخص نے اس بات کو نوٹ کیا تھا۔ وہ خاموشی سے جگ میں پانی ڈالنے لگی۔ آج ٹھنڈ ضرورت سے زیادہ تھی ہڈیوں کو چٹخا دینے والی۔

☆☆☆

"رات کی ڈوز نہیں لی نا آپ نے بابا!" وہ داؤد صاحب کے پاس کھڑی ان کی دوائیاں چیک کر رہی تھی۔

"زینب! میری جان! ادھر آؤ میرے پاس۔" داؤد صاحب محبت سے چور لہجے میں اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔

"ڈیرسٹ فادر! پہلے آپ اپنی دوائی لیں۔ پھر میں آپ کی پوری بات توجہ اور مکمل یکسوئی سے سنوں گی ٹھیک!" ایک گلاس میں پانی انڈیل کر انہیں دیا اور دوسرے میں دوائی۔

"بولیں بابا! کیا بات ہے۔" گلاس ان سے لیتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔ "اپنے چچا کی فیملی کو ان کے کمرے دکھا دیے تھے۔" وہ فکرمندی سے بولے۔ زینب جانتی تھی کہ یہ ان کا موضوع گفتگو نہیں ہے۔ تمہید ہے۔

"تمہید کو کٹ کریں بابا! مدعے پر آئیں جو آپ کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔" اس نے ان

کے کمزور ہاتھ اپنے نرم ہاتھوں میں تھام لیے۔

''زینب! کچھ دن پہلے میں نے تمہاری رضا مندی پوچھے بغیر ہی تمہاری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا تھا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ.....''

''مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ ہے ناں!'' ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ سنجیدگی سے بولی۔

''بابا! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے آپ ہی کو اپنے لیے پریشان اور فکر مند ہوتے دیکھا ہے۔ میری کل کائنات آپ اور حمزہ ہیں۔ آپ کا ہر فیصلہ مجھے قبول ہے۔'' وہ سنجیدگی سے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بول رہی تھی۔

''میری بیٹی تو بہت سمجھ دار ہوگئی ہے میں خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہا تھا۔'' انہوں نے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو حلق میں اتارتے ہوئے نم لہجے میں کہا۔

''بابا! جو میرے حق میں بہتر ہوگا اللہ تعالیٰ وہی کرے گا کیونکہ وہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور آپ بھی میرے لیے زیادہ پریشان مت ہوا کریں مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

لاؤنج اور برآمدے کی ساری بتیاں گل تھیں صرف ایک جل رہی تھی۔ وہ اندھیرے میں چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ داؤد صاحب کے کمرے کے دائیں طرف حمزہ کا کمرہ تھا اور بائیں طرف حسین صاحب کا۔ حسین چچا کے کمرے کے ساتھ والا برہان کا تھا۔ برہان کے کمرے کے بعد اس کے کمرے کا نمبر تھا۔ اسے اس کے کمرے کے سامنے سے گزر کر جانا تھا۔ وہ سست روی سے چلتی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اس سے ٹکرائی۔ سامنے برہان تھا۔

''اوہ! سوری۔ میں آپ کو دیکھ نہیں سکی۔'' وہ معذرت کرتی اس کے پہلو سے نکل کر آگے جانے لگی تب اپنے عقب سے اس کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''رات کو پہرے داری کی جارہی تھی ہماری؟'' وہ سخت لہجے میں چبا چبا کر بول رہا تھا۔ زینب کو اپنا اعتماد دھواں ہوتا نظر آیا پھر بھی خود اعتمادی سے پلٹی۔

''میں ابھی بابا کے پاس سے آئی ہوں۔ ویسے اتنی رات کو آپ کو کچھ چاہیے تھا۔'' وہ بھی زینب داؤد تھی سوجتا گئی کہ وہ اتنی رات کو کمرے سے باہر کیا لینے نکلا تھا۔ وہ سر جھکا گیا۔

''کیا چاہیے آپ کو؟'' اس کی خاموشی پر زینب نے دوبارہ پوچھا۔ لہجہ البتہ نرم تھا۔

''مجھے پانی چاہیے تھا۔ میں خود لے لوں گا۔ کچن سے۔'' سنجیدگی سے کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔ زینب کو ڈھیروں شرمندگی ہوئی اسے پانی رکھنا چاہیے تھا برہان کے کمرے میں۔

''برہان! میں ابھی لاتی ہوں پلیز۔'' تیزی سے آگے بڑھی اور قریباً دوڑتے ہوئے نیم اندھیرے میں آگے بڑھ گئی وہ پلٹا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دستک کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ لیپ ٹاپ میں کچھ کام کر رہا تھا پانی کا جگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

''تھینکس! ویسے تم Courteous ہو یا.....'' وہ اسکرین پر نظریں مرکوز کیے مصروف انداز میں بولا۔ اسے غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کر گئی۔ شاید اب ہمیشہ اسے اس شخص کے سامنے جھکنا تھا اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اسی خاموشی سے چوکھٹ پار کر گئی۔

☆☆☆

صبح کا دودھیا پن ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ وہ نماز پڑھ کر ابھی اپنے کمرے میں واپس آیا تھا۔ ہر سو دھند بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ جاگنگ سوٹ پہن کر وہ کھڑکیوں کے پردے ہٹانے لگا تب اچانک بائیں طرف بنے باغیچے میں اس کی نظر پڑی۔ سیاہ لمبی قمیص کے نیچے چوڑی دار پاجامہ پہنے۔ اوپر سیاہ سوئیٹر پہنے، دوپٹہ نماز کی شکل میں چہرے کے گرد لپیٹے اس کی دودھیا رنگت اور بھی اجلی لگ رہی تھی۔ دھند تھی لیکن پھر بھی وہ شیشے کے اس پار ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری لیے الجھی ہوئی چینی کی مورت کو بغور دیکھ سکتا تھا۔ وہ

آگے پیچھے پینڈولم کی طرح کیاری کے ساتھ پھر رہی تھی۔ بے اختیار وہ کئی لمحے اسے دیکھے گیا۔ وہ خوب صورت تھی واقعی خوب صورت تھی۔

"واؤ!" بے اختیار برہان کے لبوں سے نکلا۔ پردے برابر کر کے وہ باہر کی طرف بڑھا۔

وہ اس کی خوب صورتی کو ماننے پر مجبور تھا۔ وہ شائستہ مزاج بھی تھی لیکن پھر بھی دل کے کسی کونے میں اس کے لیے ناپسندیدگی بھی موجود تھی، یہ اس کے خلاف کی گئی برین واشنگ تھی۔ وہ اب کانوں میں پینڈ فری لگا رہا تھا۔ گاؤں شہر سے زیادہ دور نہیں تھا تقریباً تمام سہولیات ہی میسر آ گئی تھیں یہاں پھر بھی وہ گاؤں ہی تھا۔

سرخ ٹائلوں کی بنی روش پر اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے اور دوسری طرف زینب ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکری اٹھائے اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے جاتا دیکھ کر ٹھٹک کر رکی اس کی ایک اور عادت کا پتا چل گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے لابی میں آ گئی جہاں ٹیبل پر صراحی کی شکل کے کئی گل دان رکھے ہوئے تھے۔ ان گل دانوں پر سنہری رنگت کا پینٹ کیا ہوا تھا۔ تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر ٹہنیوں سمیت پھول ان میں ڈالنے لگی۔ پھر ٹوکری اٹھائے لاؤنج میں آ گئی وہاں ٹیبل پر رکھے گل دان میں پھول رکھنے لگی۔ وہ اپنے کام میں پوری طرح سے منہمک تھی۔

"واؤ زینی! یہ تو بہت پیارا لگ رہا ہے۔ تم روز ایسے ہی بناتی ہو؟" سمیرا پیچھے کھڑی تحیر سے پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ستائش نمایاں تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"صبح صبح اٹھ کر تازہ گلاب دیکھے جائیں تو یہ کتنا اچھا احساس ہوتا ہے اسی لیے میں یہ روز ہی کرتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی اور مصروف سے انداز میں ٹوکری اٹھائے ڈائننگ روم میں چلی آئی۔

"یہ والے میں کرتی ہوں۔" سمیرا جھٹ سے آگے ہوئی اور ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے گلدانوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے بھی ٹوکری اسے تھما دی اور فریج سے سیب نکالنے لگی۔ زبیدہ ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔ اور وہ سیب چھیلنے میں۔ جبکہ تیسری لڑکی اپنی مکمل خوب صورتی کے ساتھ اپنے کام میں مگن تھی۔ جس نے کھلے سفید ٹراؤزر کے اوپر کھلی قمیص پہن رکھی تھی۔

"ہو گیا۔ یہ دیکھو ٹھیک کیا ہے ناں میں نے؟" سمیرا اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی اس نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"اب کیا کرنے لگی ہو؟" وہ اس کے پاس ہی آ کھڑی ہوئی۔

"سلش (Slush) بنا رہی ہو؟" اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں ویسے اب بھائی کے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے؟ یقیناً وہ جاگنگ پر گئے ہوں گے؟" سمیرا جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ برہان کے آنے سے پہلے ہی سمیرا کے ہاتھ اس کے کمرے میں جوس بھجوا چکی تھی۔ اور اب سب تقریباً جاگ چکے تھے۔ وہ پرہیزی ناشتے کی ٹرے اٹھائے داؤد صاحب کے کمرے میں چلی آئی۔

"زینی بیٹا! تم باہر ہی چلو، میں وہیں لے کر آ رہا ہوں بھائی کو۔" بابا کے کمرے دروازے پر ہی اسے حسین صاحب مل گئے۔ وہ ٹرے اٹھائے ڈائننگ ہال میں چلی آئی جہاں تقریباً سب ہی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ فرائض میزبانی پھپھو ادا کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اریشہ اور سمیرا کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جس کے بالکل سامنے برہان ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ دونوں مسکراہٹ دبا گئیں۔ آنکھوں میں شرارت واضح تھی۔ اس کا تو مانو دل نوے کی اسپیڈ سے دھڑکنے لگا۔ اسے ان دونوں پر غصہ آنے لگا۔ داؤد صاحب بھی آ گئے تھے۔ برہان ناشتہ کر کے اٹھنے لگا تو چچی نے اسے مخاطب کیا۔

"برہان بیٹا! واپسی پر رامین کو اپنے ساتھ لے آنا وہ مجھ سے آنے کا کہہ رہی تھی تو میں نے اس سے

کہا تم اسے لے آؤ گے۔ ٹھیک ہے بیٹا!" وہ عام سے لہجے میں کہہ رہی تھیں لیکن اس بات کی گہرائی سمجھنے والے سمجھ گئے تھے۔

☆☆☆

"زینی! تم اپنے گاؤں ہمیں کب گھمانے لے کر جارہی ہو پھر.....؟" سمیرا اس کے پیچھے چلی آئی جو اریشہ کے پاس آئی تھی۔

"چلو ابھی چلتے ہیں۔" اس نے جھٹ کہا۔

"نہیں آج نہیں۔" اریشہ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔

"کیوں؟" بیک وقت دونوں کے منہ سے نکلا۔

"آج ہم لوگ گاؤں گھومنے بالکل بھی نہیں جائیں گے۔ بلکہ آج ہم پیزا کھانے جائیں گے کیونکہ بہت دن ہو گئے ہیں۔ بہت دل کررہا ہے پیزا کھانے کا۔" وہ بیڈ سے اچھل کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور دوپٹہ اسکارف حجاب کی صورت لپیٹنے لگی۔ یعنی جانے کی تیاری کرنے لگی۔

"یار! ہم گھر پر ہی منگوا لیتے ہیں۔" سمیرا نے جیسے مشورہ دیا۔

"کہاں یار گھر پر منگوائیں گے تو بور ہوں گے۔ وہاں کسی پیزا ہٹ میں قد آدم شیشے کی کھڑکیوں کے پاس بیٹھ کر کھانے کا تو اور ہی مزا ہے۔ ساتھ ساتھ سڑک پر رواں دواں ٹریفک اور لوگوں کی چہل پہل دیکھیں گے اور ساتھ ہی باتیں بھی کریں گے۔" وہ دوپٹہ تقریباً اوڑھ ہی چکی تھی۔ وہ دونوں خاموش کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"میں ابھی ممی سے اجازت لے کر آتی ہوں، تم لوگ فٹافٹ تیار ہو جاؤ ٹھیک!" وہ انہیں خاموش دیکھ کر باہر چلی گئی۔ وہ دونوں بھی مجبوراً اپنے اپنے کمروں میں آ گئیں۔ تیار جو ہونا تھا، زینی تیار ہو کر بابا کے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں لاؤنج میں کھڑی تھیں۔ اریشہ زینے اتر رہی تھی۔ فولڈ کرتا حماد اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

"حماد ہمارے ساتھ جارہا ہے؟" سمیرا نے اریشہ سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"حماد بھی ڈرائیونگ کر لیتا ہے لیکن مجھے اس کی ڈرائیونگ پر بالکل بھی بھروسا نہیں ہے زینی! ڈرائیو تم نے ہی کرنا ہے۔" اریشہ اسے متنبہ کررہی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

"زینی آپا! چلیں۔" حماد مسکراتا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"تم نے کیوں منہ سوجا رکھا ہے۔ فکر نہ کرو میں آج دوسرے راستے سے لے کر جاؤں گی۔ آدھے سے زیادہ گاؤں کی سیر کر لو گی۔" اس نے سمیرا سے کہا جس کا منہ اترا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ان کی گاڑی نہر کے ساتھ بنی اینٹوں کی سڑک پر رواں دواں تھی۔ شام اترنے والی تھی۔ سورج کا گولا اب ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں پانی پر پڑ رہی تھیں جس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے پانی میں کسی نے سونا ڈال دیا ہو۔ نہر کے دوسری طرف سرسوں کے بے تحاشا پھول کھلے ہوئے تھے اور دور پھولوں کے پار کھجور کے لمبے لمبے درخت لگ رہے تھے منظر انتہائی خوب صورت تھا۔ حماد سمیرا اور اریشہ کو سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

"سچ یار ہم جب آئے تھے تب ہم کہیں اور سے آئے تھے۔" گاڑی اب شہر کی سیاہ روشن سڑک پر چڑھ رہی تھی۔ جب سمیرا نے کہا۔

"ویسے سمیرا آپا! یہ رامین کون ہے؟ جس کا صبح ممانی ذکر کررہی تھی۔" حماد نے وہ سوال کیا جو زینی کو کھٹک رہا تھا۔ بس وہ پوچھنے سے ہچکچا رہی تھی۔

"یہ رامین..... رامین میری خالہ زاد ہے، مما کی لاڈلی۔" اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"وہی رامین ناں جس سے ممانی برہان بھائی کی شادی کرنا چاہتی تھیں رائٹ۔" حماد نے رخ موڑتے ہوئے سمیرا سے پوچھا۔ اریشہ نے اسے تادیبی نظروں سے گھورا کہ زینب کے سامنے ایسے سوال۔

pklibrary.com

اوہ ہم جا تو رہے ہیں۔ اگر یہ برہان بھائی مل گئے تو بچی بہت انسلٹ ہوگی ویسے اس ٹائم تک تو وہ فری ہوتے ہیں۔'' سمیرا پریشان سی کہہ رہی تھی اس کی بات سن کر وہ دونوں بھی کچھ فکرمند ہوگئیں۔

''ارے آپ تینوں پریشان نہ ہوں میں ہوں نا آپ کے ساتھ آپ تینوں کا محافظ۔'' حماد نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اک ادا سے کہا۔ تینوں بے ساختہ ہنس دیں اب وہ پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہے تھے وہاں کافی رش تھا۔

''آپ لوگ اندر جائیں میں گاڑی پارک کر کے آجاتا ہوں۔'' گاڑی سے اتر کر وہ تینوں اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئیں اور اریشہ نے مینو کارڈ اٹھالیا۔ اریشہ فٹافٹ آرڈر کر رہی تھی۔ سمیرا جو شیشے کے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی حماد کے انتظار میں، گھبرا گئی۔ وہ بالکل شکل سی دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی زینب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ اریشہ جو مگن سی بیٹھی تھی انہیں دیکھ خود بھی حیران رہ گئی۔ برہان ان کی طرف ہی آرہا تھا چہرے کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ لب بھنچے ہوئے۔

''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ غصے سے چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

''بھائی وہ ہم.....'' اریشہ اٹک رہی تھی۔ برہان کا غصہ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''یقیناً تم یہاں لائی ہوگی ان کو۔ تمہیں ذرا بھی حیا ہے جیسی تم خود ہو ویسا ہی ان کو کرنا چاہتی ہوں؟'' وہ زینی کی طرف گھوما اور غصے سے چابک مارنے لگا جو اس کے دل و دماغ کو زخمی کر رہے تھے۔

''نہیں بھائی! زینی..... ہمیں یہاں ..... نہیں.....'' سمیرا اس کے دفاع میں بولنے لگی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

''تم جانتی ہو زینب! کہ تم ایک شریف مرد کے نکاح میں ہو اور تمہیں یہ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ جیسی بھی برداشت.....'' وہ اس کی سماعت پر مسلسل کوڑے برسا رہا تھا۔

''شریف مرد! مائی فٹ۔ تم خود کو شریف مرد کہتے ہو۔ اگر تم میں ذرا بھی شرافت ہوتی تو یہاں سر عام اپنی بیوی، بہن اور پھپھو زاد کا تماشا نہ لگاتے اور میں پورے یقین سے کہتی ہوں کہ یہ شریف مرد ضرور یہاں کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر آیا ہوگا۔ اور ایک بات یاد رکھنا مسٹر برہان حسین! آج کے بعد کبھی میرے منہ مت لگنا۔ چلو حماد یہاں سے۔'' کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ برق رفتاری سے وہاں سے جا رہی تھی، آخری بات جو اس نے سنی وہ یہ تھی۔

''بھائی! ان تینوں کو یہاں میں لایا تھا۔'' حماد قدرے اونچی آواز میں بولا۔ وہ سختی سے اپنے رخساروں کو رگڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اتنی تضحیک، اتنی توہین، زندگی میں پہلی بار ہوئی تھی اس کی اور وہ بھی اس شخص سے جس سے اس نے محبت کی تھی۔ جب تک وہ تینوں وہاں آکر بیٹھے، وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اندھیرا تقریباً ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ ایسا ہی اندھیرا اس کے دل کے ہر خانے میں پھیل گیا تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتار سے گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ آنکھیں سرخ، متورم چہرہ، سرخ ناک وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔

''بھائی واقعی کسی لڑکی کے ساتھ آئے تھے وہاں؟'' اریشہ کی افسوس بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''رامین.....'' یک لفظی جملہ سمیرا کا تھا۔

''اچھا تو یہ ہے رامین! مائی فٹ!'' حماد کا غصے سے برا حال تھا۔ بارش کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ونڈ اسکرین سے ٹکرا رہی تھی۔ ہوائیں سرخ پنچ کر واپس جا رہی تھیں۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گئی اور اندر سے کمرہ لاک کر لیا۔ وہ بھی خاموشی سے اپنے اپنے

pklibrary.com

گھروں میں پلی آئیں۔

☆☆☆

"برہان! تمہیں ذرا بھی میرا یا خالہ جان کا خیال نہیں آیا، کیسے خاموشی سے بالکل نارمل انداز میں تم نے اپنی تایا زاد سے نکاح کرلیا۔" رامین اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ برہان غائب دماغی سے اسے سن رہا تھا۔ دماغ میں تو بس زینب کا وہ غصے بھرا انداز رہ گیا تھا۔ اس کی بھیگی آنکھیں.....

"برہان! بتاؤ اب تم کیا کرو گے..... خاموش کیوں بیٹھے ہو؟" وہ اس کو خاموش بیٹھا دیکھ کر آنکھوں میں خفگی لیے بولی۔

آں، ہاں کچھ نہیں، کرنا کیا ہے۔ چھوڑ دوں گا۔ میں اسے۔" اس نے نارمل انداز میں کہا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ بارش کی چھوٹی بوندیں بھی ساتھ تھیں۔

"کیا؟ چھوڑ دو گے۔ تمہیں اپنی کزن میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ ذرا آگے کو ہو کے بے یقین لہجے میں بولی۔

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔ مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ وہ میرے لیے بالکل غیر اہم ہے۔" اس نے کانٹے سے پیزا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر وہ بالکل خاموش رہی، اسے اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ بھی تو یہی چاہتی تھی کہ زینب کی برہان کی نظروں میں کوئی اہمیت نہ ہو اور برہان اس وقت غائب دماغی سے اسے سن اور جواب دے رہا تھا۔ اسے کہنا کچھ تھا اور کہہ کچھ اور رہا تھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا..... دماغ زینب میں الجھا ہوا تھا۔

اچانک وہ اٹھ کھڑا ہو میز پر رکھا والٹ اٹھایا اور کچھ نوٹ نکال کر فائل میں رکھے۔ اور والٹ اور موبائل جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"چلو رامین! رات ہونے کو ہے۔ ہمیں گھر جانا چاہیے، ممی پریشان ہوں گی۔" رامین جو حیران پریشان اسے دیکھ رہی تھی۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے پیچھے چلنے لگی جو دروازے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ باہر قدم، رکھا تو تیز ہوا اور بارش کی موٹی بوندوں نے گاڑی تک پہنچے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی پچھتاوے اور ملال نے اسے گھیر لیا۔ وہ شریف مرد کہہ رہا تھا خود کو اپنی بیوی کو اس نے گھر سے باہر جانے پر سینکڑوں لوگوں میں کھڑے ہو کر بے عزت کیا تھا اور وہ خود کیا تھا؟ خود بھی تو ایک لڑکی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ صرف اس لڑکی کی ناراضی دور کرنے کے لیے بس! جو اس کی کزن کے سوا کچھ نہیں لگتی تھی۔ پچھتاوا ہی پچھتاوا تھا۔ گیٹ کے اندر سرخ ٹائلوں کی بنی روش پر گاڑی دوڑاتے ہوئے چھت پر اسے ہیولا سا نظر آیا۔ یقیناً چھت پر کوئی تھا۔ اتنی تیز بارش اور ٹھنڈی ہوا میں وہاں کون کھڑا ہو سکتا تھا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے اس نے رامین کو اندر جانے کو کہا اور خود وہ حویلی کے عقبی حصے میں آ گیا جہاں گول چکر والی سیڑھیاں چھت پر جانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ قدم قدم زینے چڑھتے ہوئے وہ بس یہ سوچ رہا تھا کہ چھت پر آخر کون ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

سیڑھیوں سے باہر اوپر چھت پر قدم رکھتے ہی پانی کی موٹی بوندوں اور تیز ہوا کے تھپیڑوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیڑھیوں سے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا ابھی اس نے کہ ٹھٹھک کر رکا۔ اچانک بجلی چمکی اور پورا گاؤں ایک پل کے لیے روشن ہو گیا۔ صرف ایک پل کے لیے..... میرون ٹراؤزر اور قمیص پہنے لمبے بال کمر پہ پھیلائے وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ اسے ایک پل لگا تھا اسے پہچاننے میں۔ بلاشبہ وہ زینب تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ اس کے چہرے پر قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔

"زینب!" اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔ وہ ایسے ہی غصے سے اس کا بازو دبوچے تیز تیز قدموں سے زینے اترنے لگا۔ سیڑھیاں اترتے ہی برآمدے میں قدم رکھا۔ اور غصے سے اس کی طرف

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے! ہوش میں تو ہو۔ اتنی تیز بارش میں تم چھت پر کیا کر رہی تھیں؟ بتاؤ! جواب دو مجھے۔'' وہ غصے سے اس پر چلا رہا تھا۔

برآمدہ حویلی کے عقب میں تھا۔ تمام کمروں کی ایک ایک کھڑکیاں برآمدے کی طرف کھلتی تھیں۔ لیکن زیادہ تر یہ کھڑکیاں بند ہی رہتی تھیں۔ برآمدے کی تمام بتیاں گل تھیں صرف چند ایک کے۔

''تم پاگل ہوئی؟ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔'' اس کے بازو ایسے ہی دبوچے وہ غصے سے پوچھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا جاگنے والا پچھتاوا ختم ہو چکا تھا اس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ وہ اس کی فکر کر رہا تھا کیوں؟ زینب بے یقینی سے بس اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاتھ چھوڑو میرا۔'' وہ نفرت میں ڈوبے لہجے میں بولی۔

''نہیں چھوڑ رہا میں تمہارا ہاتھ۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو!'' وہ بھی مصر تھا۔ گہرا اندھیرا۔ گہری رات، تیز بارش اور ضدی سے وہ دونوں۔ وہ مزاحمت کرنے لگی۔ ہاتھ بھی تو چھڑوانا تھا۔

''مسٹر برہان! آپ کو یاد ہوگا، آج ہی میں نے آپ سے کہا تھا۔ کہ میرے منہ مت لگیے گا۔ اور ویسے بھی.....'' وہ اپنا بازو چھڑا کر پوری طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''اور ویسے بھی..... میں زینب داؤد! ایک آوارہ لڑکی ہوں اور تم شریف مرد! شریف مرد آوارہ عورت کا بازو نہیں پکڑا کرتے۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا۔''

آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ تحمل سے بولی اور پلٹ گئی۔ پھر رکی۔

''آپ میری نہیں رامین کی فکر کرتے اچھے لگتے ہیں۔'' گردن موڑے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ قدم قدم وہ اندھیرے میں ڈوبتی گئی۔ بادل گرجے۔ وہ چیخی نہیں بلکہ تحمل سے چلتی گئی۔ بجلی بھی چمکی۔

دیکھا۔ چچی نے رامین کو صرف اس لیے بلایا تھا تاکہ وہ جو کروانا چاہیں، اس سے کروالیں اور خود کسی کی نظروں میں نہ آئیں۔ وہ چچی کی چال سمجھ گئی تھی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ کاریڈور میں تیز تیز چلتی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اور دوسری طرف..... برہان! وہ ویسے ہی ساکت اندھیرے میں ڈوبا کھڑا تھا۔ وہ صحیح تو کہہ گئی تھی کہ اسے اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے خود ہی تو اسے آوارہ کہا تھا۔ پھر کیوں اس نے اس کا بازو پکڑا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ پھر کیوں اس کی فکر ہوئی تھی اسے؟ کیوں؟

لاؤنج عبور کر کے وہ کوریڈور میں آگے بڑھنے لگا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ زینب کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں ایک ابال سا اٹھا۔ نفرت کا ابال۔

''ممی ٹھیک کہتی ہیں، یہ لڑکی نفرت کے لائق ہے بس!'' یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ زینب سے کروائی گئی اس بے عزتی کا بدلہ تو وہ ضرور لے گا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کا وجود تھکن سے چور تھا۔ چہرہ زرد اور کھلے بال الجھے ہوئے تھے۔ رات کو کپڑے تبدیل کر کے وہ ایسے ہی کمبل میں لپٹ گئی تھی۔ اور اب..... اس کا جسم ہلنے سے بھی انکاری تھا۔ اسے برہان سے شدید محبت تھی۔ برہان کا لہجہ! وہ چھت پر کھڑی بس یہی سوچ رہی تھی کہ اگر اس سے چھین لیا گیا تو وہ کیا کرے گی برہان کو کھو دینے کا خیال ہی اس کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ رامین کے ساتھ وہاں ڈیٹ پر آیا تھا اور اسے آوارہ ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ اور ساری کسر چچی نے رامین کو اس گھر میں بلا کر پوری کر دی تھی۔ انہیں منع ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ان کا بھی تو حق تھا اس گھر پر۔ اور وہ ویسے بھی خود مختار تھیں۔

pklibrary.com

گھورتی ساکت لیٹی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن..... ناکام۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک وہ خود نہ ہار مان لے۔ وہ آٹھ سال کی تھی جب اس کی ماں فاطمہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ اٹھی آہستہ آہستہ قدموں کو گھسیٹتی دروازے تک پہنچی۔ دروازے کے اس پار سمیرا اور اریشہ دونوں کھڑی تھیں۔ دونوں کے چہروں سے فکرمندی و تشویش عیاں تھی۔

''کیا ہوا تمہیں زینی! طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' اریشہ نے آگے بڑھ کے اسے کندھوں سے تھاما۔

''اوہ اللہ! کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔'' سمیرا اسے دیکھ رہی تھی۔

''سمیرا! تم اس کے لیے ناشتہ لے کر آؤ۔'' اریشہ نے سمیرا کو باہر جانے کا کہا اور خود اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بٹھایا۔ اور اس کا بستر ٹھیک کرنے لگی۔ کھڑکی کے پردے ہٹائے تو شیشے کے اس پار سے روشنی چھلکنے لگی۔ پورا کمرہ ترتیب دے کر وہ اس کے پاس چلی آئی۔ زینب نے جھکا ہوا زرد چہرہ اٹھایا۔

''زینی!'' اریشہ نے نرم لہجے میں اسے پکارا بات کرنے کا کوئی سرا ڈھونڈ رہی تھی وہ۔ شاید۔

''زینی! ایم سوری! سب میری وجہ سے ہوا تھا نہ میں باہر جانے کی ضد کرتی اور نہ یہ سب ہوتا۔ میں بہت شرمندہ ہوں، کیا تم مجھے معاف کردو گی؟'' وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے نرم لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ پھیکا سا مسکرادی۔

''اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ آئندہ ایسی کوئی بات مت کرنا۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔ اریشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہیئر برش پکڑ کر اس کے بال سنوارنے لگی۔ اس کے سیاہ بال بہت خوب صورت تھے۔

''زینب! رامین آئی ہوئی ہے۔ وہ کوئی بہت زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے کرتی ہے۔ یہ سب تو صرف ممانی کی چال ہے اسے یہاں بلوانے کی اور تمہیں تنگ کرنے کی بس! اور کچھ نہیں ہے۔'' مکڑی کے جالے کی طرح الجھے ہوئے بال اب الگ الگ ہو کر کمر پر پھیل گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اسے سنتے ہوئے آئینے میں اپنا اور اس کا عکس دیکھ رہی تھی۔

''اور تم جانتی ہو، بہت سے لوگوں کا مقابلہ بہت سوچ کر کرنا ہوتا ہے۔ سمجھ داری سے۔ خاموشی سے۔ کسی کو کوئی تکلیف دیے بغیر۔ تمہارے اور برہان بھائی کے درمیان رامین حائل ہے بالکل شیشے کی دیوار کی طرح، دھندلی، مبہم غیر واضح اس دیوار کو اپنے سامنے سے غائب کرنا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ اور.....'' وہ اب اسے کھڑکی کے پاس رکھے میرون مخملی صوفے پر بٹھا رہی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''اور کسی بھی دیوار کو زخمی ہوئے بغیر نہیں پاٹا جاسکتا۔ تمہیں بھی زخمی ہونا پڑے گا۔ مرنا پڑے گا۔ تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اور ہمیں یعنی انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود نہ ہار مان لے۔ سمجھ رہی ہو نا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' اس کے پوچھنے پر اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا اور تبھی سمیرا ہاتھ میں ٹرے اندر داخل ہوئی اور اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ ان کے کہنے پر وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ ناشتہ کرنے لگی۔ سلائس کا ٹکڑا چبانے سے بھی اس کے جبڑے دکھ رہے تھے۔ آنکھوں سے تپش نکلنے لگی۔ اچانک ہی سر کے پچھلے حصے میں درد شروع ہونے لگا۔ تھوڑی دیر گزری دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ تینوں دروازے کی سمت دیکھنے لگیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر ممانی کا چہرہ نمودار ہوا۔ ان کے چہرے پر غصہ واکتاہٹ واضح تھی۔ وہ کڑے تیوروں سے سمیرا کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ بے اختیار وہ تینوں ہی کھڑی ہو گئیں۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' انہوں نے سمیرا کی طرف د ہوئے کہا۔ آنکھوں میں چبھن واضح

گئی۔ نظریں زینب پر جمی تھیں۔

"ممی! وہ..... میں زینی کے لیے ناشتہ لے کر آئی تھی۔ اس کی..... طبیعت خراب ہے اس لیے....."

"اچھا! ہوگئے ابھی سے اس کے ناز نخرے شروع..... چار دن نہیں ہوئے ہمیں یہاں آئے اور ابھی سے ہی اس کی ناز برداریاں شروع ہوگئیں۔ آؤ، رامین بلا رہی ہے تمہیں! یہیں چپکی رہتی ہو ہر وقت۔" ہتک آمیز لہجے میں کہتے وہ ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈالنا نہ بھولیں اور چوکھٹ پار کر گئیں۔

وہ اس کا سر جھک گیا تھا۔ ٹھوڑی سینے سے لگ چکی تھی۔ خزاں رسیدہ پتے کی مانند دونوں ماں بیٹے نے اسے پیروں تلے مسل دیا تھا۔

آنسو رخساروں پر بہہ کر دامن میں جذب ہو رہے تھے۔ اریشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے سر اوپر نہیں اٹھایا۔ بس بے آواز آنسو بہاتی رہی۔ سسکیوں کی آواز سانس کی آواز سے زیادہ نہ تھی۔ بے اختیار اریشہ نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ..... بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

اس کا ہر آنسو اس کے دل پر ایک داغ لگا رہا تھا۔ دہکتا، سلگتا، جلتا ہوا دماغ، وہ جل رہی تھی محبت میں۔ برہان کی محبت میں۔

☆☆☆

رامین کو حویلی آئے کئی دن ہو گئے تھے۔ زینب اور رامین کا آمنا سامنا ہوتا تو رسمی دعا سلام پر منحصر ہوتا۔ اس رات کے بعد سے زینب کا برہان سے بھی سامنا نہ ہوا تھا۔ آج بھی گھر کے قریباً تمام افراد ہی اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ سمیرا اور اریشہ پرانے کپڑوں سے کشنز بنانے میں مصروف تھیں۔ پھپھو کچن میں تھیں۔ زینب گملے میں لگے سرخ گلاب کے پودے کی صاف صفائی کر رہی تھی جو لاؤنج کے دروازے کے پاس رکھا تھا۔ برہان آج گھر میں ہی تھا، شاید وہ اپنے کمرے میں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے برہان کو کمرے سے نکلتے دیکھا اور اترتے۔ سجی سنوری رامین گہرے سبز رنگ کے ٹراؤزر اور ہلکے سبز رنگ کی قمیص پہنے دوپٹہ شانے پر ڈالے سج سج چل رہی تھی۔ جب دونوں ساتھ ہوئے تو اس نے ایک خوب صورت مسکراہٹ برہان کی طرف اچھالی۔ برہان سر جھٹکتا اوپر چڑھ گیا۔

گملے کے پاس بیٹھی زینب داؤد نے یہ منظر دکھتے دل کے ساتھ دیکھا۔

اریشہ اور سمیرا لاؤنج میں بچھے کارپٹ پر کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں۔ رامین زینے سے اتر کر کھلے بالوں کو بائیں کندھے پر ڈالتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

تمام کانٹ چھانٹ کر کے وہ اٹھی اور لاؤنج کی قدم آدم کھڑکیوں کے پردے ہٹائے تو شام کا سنہرا پن ہر سو اتر ہوا تھا۔

"پھپھو! بھوک لگی ہے، جلدی سے کچھ کھانے کے لیے لے آئیں پلیز!" سمیرا نے بلند آواز میں کہا۔ اتنے میں رامین کو کچن کے دروازے سے باہر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سلش سے بھرا گلاس تھا۔ پردے ایک طرف سرکا کر وہ بھی ان دونوں کے پاس آ بیٹھی۔ اچانک ہی کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو تینوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ غالباً رامین کے ہاتھ سے سلش سے بھرا گلاس چھوٹا تھا اور ماربل کے بنے فرش پر ٹکرے ٹکرے ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کچن کی طرف بڑھی۔ اریشہ نے اسے روکنا چاہا لیکن اس نے نظر انداز کر دیا کہ زبیدہ اٹھا لے گی۔ رامین اسے آتا دیکھتی رہی۔

"رامین! آپ ہٹیں یہاں سے میں یہ اٹھا لیتی ہوں۔" اس نے جھک کر کانچ کو اٹھانا چاہا۔

"ہاں! ویسے بھی ایسے چیپ کام تم جیسے دیہاتی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ میرے جیسی نفاست پسند لڑکی نہیں۔" اپنی خوب صورت آواز سے زہر اگلتی وہ ایک طرف ہو گئی۔ اچانک اس کے ہاتھوں میں کانچ کا ٹکڑا اندر تک دھنس گیا۔ اس کی ہلکی سی کراہ نکلی۔ سیڑھیاں اترتا برہان وہیں ٹھٹھک کر رکا۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹا

نیل تھا پھوڑا نکلا تھا۔ برہان جانتا تھا۔

''رامین! تمیز سے بات کرو۔ تمہیں زینب سے ایسے نہیں بات کرنی چاہیے۔''

سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آواز قدرے اونچی تھی اس لیے گھر میں موجود تمام افراد باہر لاؤنج میں آگئے تھے۔ تب خون کا سرخ قطرہ سفید فرش پر گرا۔

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ کس کو کتنی عزت دینی ہے۔ اور کون کس لائق ہے۔ تم مجھے مت سمجھاؤ۔ فار گاڈ سیک!'' وہ انتہائی سفاکی سے اونچی آواز میں بولی۔ برہان کچھ آگے بڑھ آیا۔ خون کے قطرے ایک ایک کر کے بہہ رہے تھے۔

''وہ زینی! خون .....'' اریشہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس چلی آئی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ زینب سکتے کی حالت میں وہیں بیٹھی تھی۔ خاموش..... بے یقین..... ٹوٹی بکھری بالکل کانچ کے ٹکڑوں کی طرح۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو!' ایک دم وہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی برہان بھی کھڑا تھا خاموش۔ ''بعض دفعہ ہم کسی کو اس کی اوقات سے بڑھ کر عزت دیتے ہیں اور پھر پتا ہے کہ کیا ہوتا ہے، اسی انسان کے ہاتھوں ہم بے عزت ہوتے ہیں بالکل جیسے تم مجھے کر رہی ہو۔ میں نے بھی تو تمہیں اوقات سے بڑھ کر عزت دی تھی۔'' تحمل سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ سب کو نظر انداز کرتی کہہ رہی تھی۔

خون اب ہتھیلی سے بہتا ہاتھ کی بڑی انگلی سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ پھپھو خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ البتہ آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ برہان اب بھی خاموش تھا، اسے خاموش ہی رہنا چاہیے تھا جب رامین نے اسے بے عزت کیا تھا تب بھی وہ خاموش رہا اور اب بھی۔ سمجھ دار تھا۔ چچی بگڑے تیوروں سے اسے تک رہی تھیں۔

''بدتمیز لڑکی!'' چچی اونچی آواز میں بولیں۔ رامین پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی تھی۔ اریشہ فرسٹ ایڈ باکس لے آئی تھی۔ کانچ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے صوفے پر بٹھا کر کانچ نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عابدہ چچی وہاں سے جا چکی تھیں۔ سمیرا، اریشہ، برہان، پھپھو اور وہ سب وہاں موجود تھے۔ برہان دانتوں تلے نچلا لب بھینچے خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''لگتا ہے کانچ کا نوک دار ٹکڑا اندر تک دھنس گیا ہے۔'' اریشہ نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے مدد طلب نظروں سے برہان کی طرف دیکھا، وہ آگے بڑھا فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ آنکھیں حیران تھیں۔

''بہت پھوہڑ لڑکی ہو تم! کانچ اٹھانا بھی نہیں آتا۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ سمیرا اور پھپھو دھیمے سے مسکرا دیں۔ وہ یک ٹک حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''دیکھو! تیار رہنا۔ میں تین تک گنوں گا اور تین کہتے کے ساتھ ہی اسے کھینچ نکالوں گا اور تم چیخنا مت ٹھیک؟'' اس نے اچانک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس نے خفت سے سر جھکا دیا وہ اتنی اپنائیت سے کہہ رہا تھا یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا اس کے لیے۔

تین کہتے کے ساتھ ہی اس نے کانچ کھینچ نکالا۔ اب وہ بینڈیج کر رہا تھا نرمی سے۔ بینڈیج کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب وہ اریشہ کو پین کلر نکال کر پکڑا رہا تھا اور ساتھ ہی دودھ کے ساتھ اسے دینے کی تاکید کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ سمیرا اور پھپھو اسے لیے اس کے کمرے میں چلی گئیں۔ اریشہ کچن میں آگئی اور برہان عابدہ بیگم کے کمرے کی طرف جا رہا تھا، یقیناً ابھی کچھ دیر پہلے کی جانے والی گستاخی کی معذرت کرنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ سرخ چہرہ لیے بیڈ پر بیٹھی تھیں جب برہان نے دروازے پر دستک دی۔ انہوں نے نظر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ برہان کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

pklibrary.com

''ممی!'' بے بسی بھرے لہجے میں اس نے پکارا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں؟'' لہجے میں اب بھی بے بسی تھی۔ انہوں نے رخ موڑ کے اسے دیکھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیوں خفا ہوں۔'' وہ غرائیں۔

''برہان! تم نے رامین میں اپنی دلچسپی کے بارے میں بتایا تھا پر کیوں کیا تھا تم نے اس جاہل لڑکی سے نکاح۔ مجھے تم سے امید تھی کہ تم رامین کو نظر انداز نہیں کرو گے لیکن تم نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، اب تم بھی سمیرا کی طرح اس کی ناز برداریاں کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہو۔ مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں کیا جواب دوں گی میں زاہدہ آپا کو جنہیں اب تک تمہارے نکاح سے بے خبر رکھا ہوا ہے میں نے۔ جب ان کو پتا چلے گا تو کیا ری ایکشن ہوگا ان کا؟'' وہ تو پھٹ ہی پڑی تھیں۔ برہان نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''ایم سوری ممی۔'' وہ شرمندگی میں ڈوبا بس اتنا ہی کہہ پایا تھا۔

''میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اس قدر ناخوش ہیں ہمارے اس نکاح سے۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے جلد ہی اپنی زندگی سے نکال دوں۔'' وہ آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا اور دروازے کے دوسری طرف کھڑی سمیرا نے ہر لفظ بغور سنا تھا۔

''ممی آخر کیوں چاہتی ہیں کہ کسی لڑکی کا گھر تباہ ہو۔'' جو وہ سوچ رہی تھی کہ برہان کے دل میں زینب کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں، اب سب کچھ اسے جیسے برباد ہوتا نظر آ رہا تھا۔ غصے کی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

☆☆☆

گھڑی رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔ سر شام ہی پین کلر لے کر وہ ایسا سوئی کہ اب اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں نیم اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی تو یک دم تیز روشنی پورے کمرے میں پھیل گئی بے اختیار اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ کھلے بالوں کو ڈھیلی چوٹی میں باندھا تو ہاتھ کو حرکت دینے سے اسے میں درد کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آہستہ آہستہ قدموں کو گھسیٹتی وہ باتھ روم میں چلی آئی۔

اس نے نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ نماز پڑھ کر وہ پورے بارہ بجے فارغ ہوئی تھی اب بھوک محسوس ہونے لگی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھول کر وہ آہستگی سے باہر نکلی اور اپنے اطراف میں دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے قریباً سب افراد سو گئے تھے لیکن نہیں..... برہان کے کمرے سے روشنی چھلک رہی تھی۔ غالباً وہ جاگ رہا تھا۔

وہ کچن میں چلی آئی۔ فریج کا دروازہ کھولا اور اندر دیکھنے لگی۔ رات کا بچا ہوا کھانا ترتیب سے رکھا ہوا تھا لیکن وہ اس وقت کچھ گرم کر کے کھانے کی متحمل نہیں تھی۔ سوکیبنٹ سے نوڈلز کا پیکٹ نکالا اور چولہا جلا کر اس پر پانی رکھا۔ درد اب بڑھنے لگا تھا۔ وہ رک کر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ انگوٹھے کے پاس سے موٹی نرم ہتھیلی میں کانچ کا ٹکڑا چبا تھا۔

برہان نے انگوٹھے کے گرد گھما گھا کر پٹی کی تھی ڈی ایس پی آف پولیس ہونے کے باوجود اس نے بہت اچھے طریقے سے پٹی کی تھی۔ تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ برہان ہاتھ میں فائل لیے کچھ الجھا الجھا سا کھڑا تھا وہ آگے بڑھا اور کاؤنٹر کے پاس اس سے کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ وہ اب پیکٹ کھولنے لگی تھی دل البتہ دھک دھک کر رہا تھا۔

''کیا کر رہی ہو؟'' عجیب انداز میں اس نے استفسار کیا۔

''یقیناً آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ میں اپنے لیے نوڈلز بنا رہی ہوں۔'' وہ زینب تھی۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ وہ خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی سرا ڈھونڈ رہا ہو۔

pklibrary.com

''تم.....!'' کچھ سوچ کر وہ بولا۔ ''تم! ایک اچھی میزبان نہیں ہو۔ زینب داؤد!'' وہ جیسے اسے جتا رہا تھا۔ نوڈلز کا پیکٹ پانی میں انڈیلتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ اچنبھے سے اسے تکنے لگی۔

''آئی مین! تمہیں رامین..... کی انسلٹ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ تمہاری مہمان ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا وہ گڑبڑا گئی۔ اور دوسرے چولہے پر پانی رکھنے لگی۔

''تم میری بات کے جواب میں کچھ نہیں کہو گی؟'' وہ جیسے اس کی خاموشی سے اکتا گیا تھا تبھی بے زاری سے گویا ہوا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو، کون صحیح تھا اور کون غلط۔ پھر بھی تم رامین کی حمایت کر رہے ہو۔ میں اس بارے میں اب کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ شانے اچکا کر بولی۔ دل البتہ کچھ مضطرب تھا۔

''رامین صحیح تھی اور تم.....'' اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ گردن موڑ کے بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ کچھ دن پہلے برہان کے لیے زینب ناقابل برداشت تھی اور اب وہ رات کے گہرے اندھیرے میں اس سے بالکل نارمل انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں نے اب تمہارے راستے میں آنا چھوڑ دیا ہے۔ اکیلی گھر سے باہر بھی نہیں جاتی پھر؟ پھر تم اب کیا چاہتے ہو؟'' وہ دبے لہجے میں غصے سے کہہ رہی تھی۔ چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا اور اپنا لے کر ایک طرف ہو گئی۔ وہ اس دن بھی اکیلی نہیں تھی۔ حماد، سمیرا اور اریشہ اس کے ساتھ تھے پھر بھی وہ اس شخص کو وضاحت دے رہی تھی۔ جس نے اسے سینکڑوں لوگوں کے درمیان بے عزت کیا تھا۔

''تم مجھے آزاد کر دو بس اور کچھ نہیں۔ رشتہ ختم، قصہ ختم۔'' وہ سن کھڑی اسے سن رہی تھی۔

''یونو عموماً لڑکیاں یہ سوال کرتی ہی اپنے شوہروں سے ہیں لیکن میں تمہارا شوہر ہو کر تم سے یہ ریکویسٹ کر رہا ہوں۔'' چائے کا گھونٹ اس کے حلق کو کڑوا کر گیا تھا اس نے کاؤنٹر پہ کپ رکھ دیا۔ گلا خشک ہونے کو تھا۔

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' اس نے تحمل سے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔ ہاتھ کا درد دگنا ہو گیا تھا۔ نوڈلز کا باؤل کاؤنٹر پر چائے کے کپ کے ساتھ رکھا تھا۔

''دیکھو! اگر میں ایسا کروں گا تو.....'' کچھ دیر وہ خاموشی سے لب کاٹنے لگا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ حلق میں کچھ اٹکنے لگا تھا۔

''آئی نو! کہ تم ایسا کیوں نہیں کرنا چاہتیں کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور تمہیں لگتا ہے کہ ایک نہ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا وہی تھرڈ کلاس سوچ۔ لیکن یاد رکھنا کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا تم کچھ بھی کر لو لیکن پھر بھی تم میرے لیے غیر اہم رہو گی۔''

وہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ سفاکی سے کہہ رہا تھا زینب کا وجود سرد پڑتا جا رہا تھا، اتنا سرد کہ جیسے کسی نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل انڈیل دی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چائے کا کپ شیلف پہ قریباً پٹخا تھا اور فائل اٹھائے تیز تیز قدموں سے کچن سے نکل گیا۔ وہ وہیں کھڑی بس اسے جاتا دیکھتی رہی۔ آنسو جو اتنی دیر سے ضبط کر رہی تھی بے اختیار ٹپ ٹپ برسنے لگے۔

اپنے کمرے میں آ کر کھڑکی کے پاس رکھے میرون صوفے پہ پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دیے بے آواز رونے لگی۔ اس کا دل بار بار بھر رہا تھا۔ ذہن میں، آنکھوں کے پیچھے ہر جگہ کچن کا منظر امڈ رہا تھا وہ دبے دبے غصے سے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے لیے غیر اہم ہے بالکل غیر اہم۔ نیند اس پر طاری ہوئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

☆☆☆

''زینب!'' وہ خواب کے زیر اثر تھی جب اس کے کانوں سے جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔

''زینب! میں حمزہ ہوں۔ اٹھو اور بات سنو میری!'' وہ ہولے سے اس کا کندھا ہلا رہا تھا۔ اسے

pklibrary.com

Monthly Shuaa July 2021

سننا چاہیے تھا، وہ اس کا بھائی تھا وہ یکدم اٹھ بیٹھی بنا پلک جھپکے وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ہی بہت سے آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

''کیا ہوا؟ زینی! تم رو کیوں رہی ہو؟'' اسے روتا دیکھ وہ پریشانی سے آگے بڑھا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ آہستہ آہستہ اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے واقعی اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔

''ہاتھ میں درد ہو رہا ہے۔''

اس نے بات بناتے ہوئے کہا سچ بھی تھا درد بھی ہو رہا تھا۔

''اوہ لڑکی! تم نے بینڈیج تبدیل نہیں کی۔'' اس نے ہاتھ کو دیکھا تو بے اختیار اپنے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔

''بس اتنی سی بات تھی! جس کے لیے تم اپنے قیمتی آنسو بہا رہی تھیں۔'' اس نے پٹی کرتے ہوئے کہا۔

''میرے آنسو صرف تمہارے لیے قیمتی ہیں حمزہ! کسی اور کے لیے نہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''کوئی بھی لڑکی کم از کم اتنے سے زخم کے لیے تو ایسے نہیں روئے گی۔ اب سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے پھر مجھے جانا بھی ہے۔'' وہ تو جیسے سچ ہی سننا چاہتا تھا۔

''حمزہ! ہر مرد کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ جو لڑکی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کی محبت میں ہر حد پار کر جائے گی، اس کے بغیر جی نہیں سکے گی مر جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ٹھکرائے جانے کے بعد لڑکی اور بھی مضبوط ہو جاتی ہے، وہ جینا سیکھ جاتی ہے۔ اس کا جذباتی پن ختم ہو کر سنجیدگی میں بدل جاتا ہے۔ برہان بھی یہی سمجھتا ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکی اور حمزہ کی طرف دیکھا جو سانس روکے اسے سن رہا تھا۔

''برہان نے مجھ سے اس رشتے کو ختم کرنے کی بات کی تھی وہ چاہتا ہے کہ میں یہ قصہ ختم کر دوں۔ وہ رامین سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے کل ہونے والی ساری گفتگو سنائی۔ وہ جو اسے پوری توجہ و یکسوئی سے سن رہا تھا بے اختیار گہری سانس خارج کی۔

''تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟'' اس نے سوالیہ انداز میں ابرو اٹھائے۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ بابا سے بات کر کے اس سے خلع لے لوں۔ اس کی مشکل آسان کر دوں۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ حمزہ بے اختیار مسکرا دیا۔

''ابھی تم نے کہا کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتا، تم سے نفرت کرتا ہے، ہے نا۔ پھر بھی تم ایسے شخص کی مشکل آسان کرنا چاہتی ہو؟ پاگل لڑکی!'' اس نے دو انگلیوں سے اس کی کنپٹی کو چھوا۔

''وہ کچھ پریشان ہے کیونکہ کچھ لوگ آئی مین کرمنلز اسے بلیک میل کر رہے ہیں، اسی لیے وہ کچھ الجھا الجھا رہتا ہے۔ میری بات ہوئی تھی اس سے۔ اسے کچھ وقت دو، ہو سکتا ہے سب ٹھیک ہو جائے۔'' اس کی نرم آواز میں محبت کی مٹھاس تھی۔ اس نے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اگر کچھ ٹھیک نہ ہوا تو.....؟'' بعض دفعہ اگر کتنے خطرناک ہوتے ہیں اس نے آج محسوس کیا تھا اس بات کو۔

''پھر میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ جو تمہیں اچھا لگے گا، تم وہ کر لینا ٹھیک؟'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

وقت بہت ہی تیزی سے گزر رہا تھا۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے رامین ایک بار اپنے گھر جا کر واپس آ گئی تھی۔ برہان کا رویہ بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہو گیا تھا۔ گھر میں وہ جتنا ٹائم گزارتا رامین کی ہمراہی میں نظر آتا کبھی لان میں، کبھی لاؤنج میں، کبھی اسٹڈی میں۔ ایک دن رامین اور وہ کچھ دیر پہلے ہی لان سے واپس آئے تھے برہان تو اپنے

کمرے میں چلا گیا اور وہ لاؤنج میں رکھے کریم کلر مخملی صوفوں کی طرف آ گئی جہاں سمیرا بیٹھی تھی۔

اس نے گہرے نیلے رنگ کی اسکرٹ اور سرمئی رنگ کا آدھی آستینوں کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بال کھلے اور ہلکا میک کیے وہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گئی جو کچھ الجھی الجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر وہ آپس میں خوش گپیاں کرتی رہیں پھر سمیرا اصل بات پہ آئی۔

''رامین! وہ دراصل مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ دیکھو تم ناراض مت ہونا پلیز!'' وہ قدرے لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں بولو! کیا کہنا ہے؟'' وہ نخوت سے بولی۔ ازلی انداز گفتگو۔

''تم برہان کے ساتھ زیادہ مت رہا کرو۔ وہ اب شادی شدہ ہے، ایسے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ شادی شدہ پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

''کیسے اچھا نہیں لگتا زینب کو؟'' اسے یہ بات ناگوار گزری تھی۔ ''میں جانتی ہوں، یقیناً تم سے زینب نے ہی کہا ہوگا۔'' اس نے پھر کہا۔ لہجے میں الجھن اور ناگواری واضح تھی۔

''نہیں، اس نے نہیں کہا، میں خود کہہ رہی ہوں مجھے لگتا ہے، یہ اچھی بات نہیں ہے کیونکہ وہ اب شادی شدہ ہے۔ پہلے کی بات اور تھی۔'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''کیوں کہ تم بہت تنگ دل ہو۔ زینب بھی ہے۔ تمہیں برہان کا مجھے کمپنی دینا اچھا نہیں لگتا زینب کو اچھا نہیں لگتا، تمہیں پہلے بھی برہان کا میرے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ بس فرق اتنا تھا پہلے تم کہتی نہیں تھیں اور اب کہہ دیتی ہو۔'' وہ چلاتے ہوئے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر بولی۔ سمیرا ہونق بنی اسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ لاؤنج گھر کے افراد سے بھرنے لگا تھا، سب ہی حق دق تھے۔

''کیا ہو رہا ہے یہ سب؟'' پھپھو نے مداخلت کی۔

''ہونا کیا ہے؟ ضرور اس زینب کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان کوئی مسئلہ ہو گیا ہوگا۔'' عابدہ بیگم نے کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا جو یہ بات سن کے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔ برہان بازو سینے پہ لپیٹے خاموش کھڑا تھا۔

''ممی! زینب نے کچھ نہیں کیا۔ آپ پلیز ہر بات میں اسے مت گھسیٹا کریں۔'' سمیرا نے کہا۔

''دیکھا تم نے برہان! اس ایک لڑکی کی وجہ سے۔ صرف اس کی وجہ سے پہلے میرا شوہر بدگمان ہوا مجھ سے اور اب..... اب میری بیٹی زبان درازی کر رہی ہے۔'' چچی اب باقاعدہ رونے لگی تھیں۔ برہان نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پہ زمانوں کی اجنبیت اور رکھائی چھائی تھی۔ قدم قدم چلتا وہ اس کے سامنے رکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

''کیا چاہتی ہو آخر تم؟'' اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ اسے سب یاد آ رہا تھا۔ برہان سے ہونے والی اس کی بے عزتی، اکیلے میں، سب کے سامنے، پیزا ہٹ..... سینکڑوں لوگ۔

''معافی مانگو! رامین سے ابھی اور اسی وقت۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا، البتہ پیشانی پہ شکنیں تھیں۔

''اس نے کچھ نہیں کیا۔'' سمیرا ضبط کھو کر چلائی۔ کچھ دیر پہلے چچی کے چہرے پہ آنے والا اطمینان اب غصے میں بدل گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سمیرا کے منہ پہ تھپڑ دے مارا۔ سب کے منہ کھل گئے رامین نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ خاموش رہو اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ اپنی بکواس بند رکھو۔'' انگلی اٹھا کر وہ اسے متنبہ کرتے ہوئے بولیں۔ سمیرا کے آنسو بہہ نکلے اور وہ..... وہیں اپنی جگہ پہ سن کھڑی رہ گئی۔

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بھابھی!''

پھپھو تاسف سے بولیں۔

''جو مجھے بہتر لگا وہ میں نے کیا ہے۔'' قطعیت سے کہا گیا۔ انداز ایسا کہ جیسے پھپھو سے کہہ رہی ہوں کہ تم خاموش رہو۔ پھپھو نے لب بھینچ لیے۔

''ممی! ہمیشہ وہ کرتی ہیں جو صحیح ہوتا ہے۔ انہوں نے کبھی کچھ غلط نہیں کیا اور..... یہ کچھ غلط کر ہی نہیں سکتیں۔ کسی کی بیٹی کو اس کے شوہر کی نظروں میں گرانا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے۔ آپ نے بار بار زینب کو ٹھکرایا ہے۔ وہ کیا جو آپ کو بہتر لگا ہمیشہ..... لیکن دیکھیے گا ممی! ٹھیک ایسے ہی جیسے آپ نے ٹھکرایا کوئی آپ کی بیٹی کو بھی ٹھکرائے گا۔ تب آپ کو پتا چلے گا کہ آپ نے کیا کیا؟ غلط یا صحیح؟''

پوری طاقت سے چلاتے ہوئے کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ چچی ایسے ہی کھڑی تھیں چہرے پہ کوئی بھی تاثر لیے بغیر اور وہ بت بنی وہیں کھڑی تھی۔

سب وہاں سے چلے گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حمزہ، حماد، داؤد صاحب اور حسین صاحب تو تھے ہی نہیں۔ زینب کے پاس بس عائشہ کھڑی تھیں۔ انہوں نے اس کے کندھے پہ اپنا نرم ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر گردن موڑ کر انہیں دیکھا جن کے چہرے پہ صدیوں کی تکان تھی۔ بے اختیار وہ ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آج پھر اسے ماں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

سرخ حویلی پہ شام اتر رہی تھی۔ زینب کچن میں کھڑی شام کی چائے زبیدہ خاتون کے ساتھ بنوا رہی تھی۔ پورے کچن میں الائچی اور تلے ہوئے کبابوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ چائے دم پہ رکھ کر وہ زبیدہ خاتون کی طرف مڑی اور ٹرالی میں لوازمات رکھوانے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے اٹھائے لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج میں قریباً سب ہی موجود تھے سوائے داؤد، حسین اور حمزہ کے جو کسی دوست کے ہاں چائے پہ مدعو تھے۔ سب وہاں بیٹھے خوش گپیوں میں مگن تھے سوائے برہان کے، وہ خاموش کچھ الجھا ہوا تھا۔ ماتھے پہ واضح متفکر شکنیں تھیں۔ رامین اسی شام واپس چلی گئی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے سب کو چائے کے کپ پکڑانے لگی۔ برہان کو کپ پکڑا کر وہ اپنے لیے چائے نکالنے لگی۔

''یہ چائے کس نے بنائی ہے؟'' برہان نے چائے کا گھونٹ لینے کے بعد پوچھا۔ لہجہ خاصا چبھتا ہوا تھا۔

''میں نے بنائی ہے۔'' اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

''یہ..... یہ چائے بنائی ہے تم نے؟ آج کے بعد اتنی بکواس چائے مت دینا مجھے!'' اس نے اونچی آواز میں کہا اور چائے کا کپ میز پہ پٹختے ہوئے وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ آنکھوں میں آئی نمی کو اس نے پلکیں جھپک جھپک کر واپس دھکیلا۔ اتنی توہین اور ذلت۔

☆☆☆

''پاپا!'' سمیرا حسین صاحب کے کمرے میں چلی آئی۔ دوپہر پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی آج وہ گھر پہ ہی تھے۔

''جی!'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہیں کمرے میں عابدہ بیگم بھی تھیں، سمیرا انہیں یکسر نظر انداز کیے حسین صاحب کی طرف متوجہ تھی۔ اس دن کے بعد عابدہ بیگم اور سمیرا کے درمیان کچھ کچھ سرد مہری تھی۔

''پاپا! مجھے آپ سے ایک کام تھا۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ عابدہ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔

''جی بولیں، کیا کام ہے۔ میں فارغ ہی ہوں۔'' انہوں نے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کو پرے کھسکایا۔ اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''پاپا! وہ میری دوست سارہ کے پاپا ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ میں عیادت کے لیے جانا چاہتی تھی۔'' اس نے کام بتایا۔ پیزا ہٹ میں ہونے والی عزت افزائی کے بعد سے وہ تینوں ازحد محتاط ہو گئی

pklibrary.com

تھیں۔
"اوکے! چلی جانا کس کے ساتھ جاؤ گی ویسے؟" یاد آنے پر انہوں نے پوچھا۔
"میں زینب کے ساتھ جاؤں گی۔ وہ اچھی ڈرائیونگ کرتی ہے۔" کہتے ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ سائیڈ ٹیبل پہ پڑا موبائل اٹھایا اور جلدی جلدی اپنے منگیتر کا نمبر ملانے لگی۔ کسی وہ شخص تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔
"ارسل! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" سلام کے بعد اس نے بنا تمہید باندھے جلدی جلدی کہا۔ آواز میں تھوڑی سی گھبراہٹ تھی۔
"کیا مطلب؟ ملنا چاہتی ہو کیوں؟" اچانک ملنے کی فرمائش وہ تھوڑا حیران ہوا تھا۔
"ہاں! ملنا چاہتی ہوں، مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔ کیا تم آج مل سکتے ہو؟" وہ جھلا سی گئی تھی۔ دوسری طرف ارسل کی حیرانگی مزید بڑھ گئی۔
"کیسا کام یار!"
"ارسل! تم آج فارغ ہو یا نہیں۔" سمیرا کو غصہ آ گیا تھا۔
"سمیرا! آج آفس میں اہم میٹنگ ہے۔ ہم کل دوپہر، لنچ ٹائم میں ملیں گے اوکے!" اس نے بتایا۔ سمیرا نے بے اختیار سر جھٹکا۔
"ارسل! ہم کسی ریسٹورینٹ میں نہیں مل سکتے۔ میں کل ہسپتال آ رہی ہوں وہاں ملیں گے۔ ٹھیک؟" کہہ کر اس نے کال بند کر دی۔

☆☆☆

"حمزہ! مجھے برہان سے خلع چاہیے۔ میں مزید اپنے لیے ناگواری برداشت نہیں کر سکتی۔ تم پلیز جلدی نوٹس تیار کروا دینا۔" زینب ٹیرس پہ کھڑی تھی اس کی آواز میں واضح نمی تھی۔
"وکیل ہونے کا اب یہ نقصان بھی مجھے اٹھانا پڑے گا کہ بہن کے طلاق کے نوٹس میں تیار کرواؤں۔" اسے جیسے دکھ نے آن گھیرا تھا۔ زینب نے رخ موڑ لیا اور ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔
"حمزہ! برہان میری زندگی میں صرف اتنے ہی وقت کے لیے آیا تھا۔ آج نہیں تو کل اسے مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتا، اسے رامین پسند ہے رامین کے چلے جانے کے بعد میں نے خود اس کی بڑھتی ہوئی ناگواری نوٹ کی ہے۔ اب میں مزید اسے مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔ میں جانتی ہوں اگر اس نے خود مجھے طلاق دی تو اسے چچا کی ناراضی برداشت کرنی پڑے گی اور یقیناً بابا کو بھی اچھا نہیں لگے گا۔ میں نے بابا سے بات کر لی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہیں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ایک دو دن میں میرا کام کر دینا۔"
اس نے رخ موڑا ہوا تھا لیکن آواز کی نمی سے صاف ظاہر تھا کہ آنسو بمشکل روکے ہوئے ہیں۔ بات مکمل کر کے وہ وہاں سے جانے کے لیے مڑی۔ حمزہ ویسے ہی کھڑا تھا بے حس و حرکت، حیران، پریشان۔
"زینب! تمہیں یاد ہے ممی کیا کہتی تھیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود نہ ہار مان لے۔ تم برہان کی بے زاری سے ہار مان رہی ہو؟" پتھر بنے حمزہ کے وجود میں حرکت ہوئی۔ افسوس میں ڈوبا لب و لہجہ۔ وہ جاتے جاتے رکی، پلٹ کر دیکھا۔ کہا کچھ نہیں چند پل خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ دو آنسو خاموشی سے رخساروں پہ ڈھلک گئے۔ وہ جانے کے لیے مڑ گئی۔
"مجھے افسوس ہے کہ تم نے ہار مان لی ہے۔" حمزہ نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ اس کے قدم ٹھہر گئے۔ ہلکی ہوا کا جھونکا آیا اور ریلنگ کے ساتھ رکھے گملوں میں لگے پھول لہلہا اٹھے۔ جانے کیوں؟ وہ مڑی آہستہ آہستہ چلتی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی جواب بھی اس کے مطالبے پہ بے یقین تھا۔
"حمزہ! جس رشتے کو جوڑنے کے لیے ہمیشہ آپ کو جھکنا پڑے تو اس رشتے کو جوڑنے سے بہتر

ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جائے۔'' تحمل سے کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا اپنا دل بھی راضی نہیں تھا لیکن یہ انا، خودداری، عزت نفس درمیان میں حاوی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

شام کا گلابی آنچل ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ لان میں رکھی کرسی پر حسین صاحب بے حد پریشان بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں جانب عابدہ بیگم کا اطمینان چھپائے نہ چھپ رہا تھا۔ زینب کی خلع والی بات پوری حویلی میں پھیل گئی تھی۔ برہان کو جب یہ بات پتا چلی اس نے کوئی ری ایکشن نہیں دیا بس خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سمیرا کا مارے غم و غصہ کے برا حال تھا وہ زینب کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔ اس کی ایک خاموشی تھی سب کے جواب میں۔

''زینب! حسین ماموں تمہیں لان میں بلا رہے ہیں۔'' اریشہ نے اطلاع دی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپٹہ ٹھیک سے شانوں پر پھیلایا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اریشہ چوکھٹ پر کھڑی بس اسے دیکھتی رہی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی۔

''ہار ہوتی ہے۔ لیکن ہار ایسی بھی ہوتی ہے میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے۔'' اس نے گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے جیسے افسوس سے کہا تھا۔ افسوس میں ڈوبی آواز بے یقین لب و لہجہ۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ لان میں چچا ادھر ادھر ٹہل رہے تھے اسے آتا دیکھ کر رک گئے۔ مسکراہٹ آج غائب تھی۔ پریشان، متفکر، الجھے ہوئے نظر آرہے تھے۔

'' آؤ بیٹا! بات کرنی تھی آپ سے، آؤ، آؤ بیٹھو!'' انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی عابدہ چچی بیٹھی تھیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر وہاں بیٹھ گئی۔

''زینب! تم نے خلع کا مطالبہ کسی دباؤ کے تحت تو نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تم خود بھی کچھ پریشان ہو۔'' ان کی بات پر چچی کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں چچا جان! میں سب ..... کچھ اپنی ..... مرضی سے کر رہی ہوں۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ ہمارا رشتہ بہت مضبوط نہیں ہے۔ جیسا کہ اسے ہونا چاہیے اور میں خود بھی برہان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔'' اس نے لاپروائی کی بھرپور اداکاری کے ساتھ شانے اچکا دیے۔ البتہ حلق میں کچھ اٹکنے لگا تھا۔ آنسو، ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں، اس کی بات پر عابدہ بیگم کا دل گویا اطمینان سے بھر گیا۔

''تم جاؤ زینب!'' انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

'' کچھ لوگوں کو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔'' ان کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں تک بخوبی پہنچی تھی۔ اس کے مطالبے پر بابا نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ لاؤنج کا اندرونی دروازہ عبور کر کے اندر داخل ہوئی تب اس نے پھپھو کی آواز سنی۔ وہ شاید اسے بلا رہی تھیں۔ وہ قدم قدم زینے پر چڑھتی ان کے پورشن میں چلی آئی۔

''زینب! بیٹھو بیٹا! ادھر آؤ میرے پاس۔ کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا۔ کچھ تو رحم کھاؤ خود پر۔ کیوں کر رہی ہو ایسے بے کار کے مطالبے؟'' زرد پڑتی رنگت، آنکھوں کے گرد گہرے حلقے دیکھ کر وہ واقعی پریشان ہوگئی تھیں۔ لان سے وہ بمشکل اٹھ کر آئی تھی۔ آنسو جو اتنی دیر سے قابو کر رکھے تھے۔ بے اختیار بہہ نکلے۔ پھپھو کے کندھے پر سر رکھے، وہ روتی رہی، کتنا وقت گزرا اسے کچھ علم نہ تھا۔

''کیوں کیا ہے، تم نے خلع کا مطالبہ؟'' پھپھو آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے نرم آواز میں پوچھ رہی تھیں۔

''پھپھو! برہان مجھے پسند نہیں کرتا۔ وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ میں اسے مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہو سکتا ہے، تم نے اب اسے مشکل میں ڈال

pklibrary.com

دیا ہو۔'' کبھی کبھار پھپھو کتنی مبہم باتیں کر جاتی ہیں ناں، اس نے اس وقت محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

''اف، یہ کٹنگ بورڈ کہاں گیا آخر۔'' وہ کوفت سے بولی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک ہی تو چکی تھی وہ..... زبیدہ خاتون حیران و پریشان سی کھڑی تھیں۔ کٹنگ بورڈ آخر گیا تو کہاں گیا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ میں اسٹور روم سے دوسرا والا لے آتی ہوں۔ تم تب تک مٹر چھیل لو۔'' اسے پریشان کھڑا دیکھ کر زینب تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

عقبی برآمدے کے ساتھ ہی کچھ کمرے بنائے ہوئے تھے جنہیں عموماً اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ کمرے اس طرح بنائے گئے تھے کہ عقبی برآمدہ ان کمروں کے سامنے تھا۔ وہ اسٹور کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اندر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ بٹن دبنے کی آواز سے پورا کمرہ پل بھر میں روشن ہو گیا تھا۔ کٹنگ بورڈ سامنے ہی رکھا تھا۔ اسے لے کر وہ باہر نکلی۔ دروازہ بند کر کے وہ جیسے ہی پلٹی پیچھے کھڑے برہان سے ٹکرائی۔ وہ پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور دروازے سے جا لگی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ آج پھر اسے اپنا اعتماد دھواں ہوتا نظر آیا تھا لیکن نہیں.....

''کیا کر رہی ہو یہاں؟'' وہ جیسے اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''میں یہاں یہ لینے آئی تھی۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا کٹنگ بورڈ سامنے کیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ پھر رکی۔ گردن موڑ کر آنکھوں میں حیرت سموئے وہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی کلائی برہان کے مضبوط ہاتھ میں تھی۔

''مجھ سے آزادی چاہتی ہو؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ زینب کا دل دکھ سے بھر گیا۔ پتا نہیں کیوں وہ سنجیدہ تھا۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ تم رامین سے شادی کرنا چاہتے ہو۔'' وہ جلدی بھولنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے لب بھینچ لیے۔

''اتنی فرماں برداری؟ اور وہ بھی میری۔ یہ بات ماننے کے لیے تم نے کچھ جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر دیا۔ تم تھوڑا انتظار کر لیتیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بول رہا تھا لیکن زینب کو وہ طنز لگا تھا، وہ اندر تک کھول گئی۔

''ہاتھ چھوڑو میرا۔'' اس نے ضبط سے کہا۔

''برہان! آئی تھنک تمہیں یاد ہوگا، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں ایسا کوئی حق نہیں دیا۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔'' شدت ضبط سے آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔ خود کو بہادر ظاہر کرنا قدرے مشکل تھا۔ دل بار بار ڈر رہا تھا، آنکھیں بھیگنے کو بے تاب.....

''لیکن میرے پاس ابھی ایسا ہر حق موجود ہے۔'' وہ نارمل لہجے میں بہت کچھ جتا رہا تھا۔ اچانک ہی آسمان پر بہت سے سیاہ بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''برہان پلیز!'' وہ منت کرتے ہوئے بولی۔ وہ ویسے ہی کھڑا رہا۔

''برہان! ہاتھ چھوڑ دو میرا۔ تمہیں میرا ہاتھ پکڑنے کا کوئی حق نہیں۔'' وہ تقریباً چلانے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ جانے کے لیے قدم بڑھانے ہی لگی تھی کہ برہان نے اپنا بازو آگے کر کے اسے ایک بار پھر روکا۔

''تم میری عزت کیوں نہیں کرتی ہو؟'' اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ پریشان پریشان، الجھی ہوئی ویران آنکھیں۔

''تمہیں پتا ہے..... نہیں..... تمہیں نہیں پتا ہوگا۔ جب کوئی شخص کسی عورت کو اذیت دیتا ہے، سینکڑوں لوگوں کے درمیان اس کی بے عزتی کر دیتا ہے تو عورت اس کی عزت کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ سو اسی لیے میں نے بھی تمہاری عزت کرنا چھوڑ دی

ہے۔"

اس نے شانے اچکا دیے، برہان کو اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ آہستہ سے اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

بارش کی بوندیں برسنے لگی تھیں۔ چلتے چلتے وہ رکی اور پلٹ کر اسے دیکھا وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلا لب دانتوں تلے دبائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"میں نے تمہاری عزت کرنا اب چھوڑی ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔" بارش کی بوندیں موٹی ہونے لگی تھیں۔

آنسو جو اتنی دیر سے رکے ہوئے تھے۔ بے اختیار بہہ نکلے۔ آنکھوں کے سامنے بار بار برہان کا ستا ہوا چہرہ آرہا تھا۔ اس نے جو کہا تھا، سچ کہا تھا پہلے وہ واقعی برہان کی بہت عزت اور اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

☆☆☆

"بابا! ایم..... سو..... سوری بابا..... پلیز۔" داؤد صاحب کا کمزور ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ داؤد صاحب خاموشی سے اسے دیکھے گئے۔

"بابا! مجھے لگتا تھا کہ میں بہت بہادر لڑکی ہوں۔ اچھی بیٹی ہوں لیکن بابا! میں بہت بری ہوں۔ بہت نافرمان ہوں۔ آپ کی کوئی بات نہیں مانتی۔ پلیز بابا..... ایم سوری..... ایم رئیلی سوری۔" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ بار بار ان کے ہاتھ کو چوم رہی تھی۔ سسکیاں بلند ہوتی جارہی تھیں۔

"نہیں نہیں..... بالکل نہیں میری بیٹی تو بہت اچھی ہے۔ روؤ نہیں۔" انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا اور بے آواز بوسہ لیا۔ اس کے رونے میں اور شدت آگئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے بال سہلانے لگے۔

"زینب!" انہوں نے مدھم آواز میں پکارا۔

"بیٹا! بعض دفعہ ہم بڑے بہت خودغرضی کا مظاہرہ کر جاتے ہیں، جیسے میں نے کیا تھا۔ لیکن میں نے غلط کردیا تھا۔ تم نے بھی مجھے خوش کرنے کے لیے ہاں کی تھی، ہے نا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی ایسا لگتا تھا کہ میں نے غلط کردیا ہے۔ تم اب روؤ نہیں میرے بچے! مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جارہا۔" انہوں نے اس کا چہرہ سامنے کیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوسوج گئی تھیں، وہ بہت عرصے بعد اتنا کھل کے روئی تھی۔

"بابا! آپ..... مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا۔" رو رو کر آواز بھاری ہوگئی تھی۔

"نہیں میری جان! بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر ماتھے پر بوسہ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

"تم جاؤ، اب آرام کرو جاکر۔" انہوں نے اسے کہا۔ وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

"اور ہاں، ادھر آؤ۔ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرنا ہے۔ رونا نہیں ہے، ٹھیک؟" وہ جو پھر رونے کی تیاری کررہی تھی، بے اختیار مسکرادی۔ ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ برآمدے میں چلتے ہوئے اسے اپنا دل ویران، سنسان، اداس سا لگ رہا تھا۔

اپنی ذات کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کا دل بار بار بھر رہا تھا چونکہ اسے رونا نہیں تھا اس لیے بار بار پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو بہنے سے روک رہی تھی۔ تب اپنے کمرے میں داخل ہوتا برہان اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رکا۔ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

دوپہر ہونے والی تھی جب وہ دونوں سیاہ گاڑی میں بیٹھی آگے بڑھ رہی تھیں۔ سمیرا کو اپنی دوست کے فادر کی عیادت کے لیے جانا تھا اور اس کی ڈرائیور

pklibrary.com

زینب داؤد کچھ الجھن کا شکار تھی۔

''کیا یار! ہسپتال جارہی ہو؟ تم ان کے گھر جانے کا تو انتظار کرلیتیں، پھر ان کے گھر چلے جاتے۔'' زینب کو جیسے اس کے ہسپتال جانے والا آئیڈیا کوفت کا شکار کررہا تھا۔

''سچویشن کریٹیکل ہے یار! اس لیے.....'' اس کی بات پر زینب نے شانے اچکادیے۔

ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کرتے ہوئے زینب مسلسل سمیرا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی، زینب کو خود کو دیکھتا پاکر وہ پھیکا سا مسکرادیتی اور بس۔

''تم یہیں میرا انتظار کرنا، میں دس منٹ میں واپس آتی ہوں، اوکے۔'' سمیرا نے اسے گاڑی میں بیٹھے رہنے کی تاکید کی تو اس نے بے نیازی سے شانے اچکادیے۔

وہ ونڈو کا شیشہ نیچے کیے، کہنی کھڑکی میں رکھے باہر کا جائزہ لے رہی تھی تب ہی اچانک ایک اور سیاہ اکارڈ اس سے پانچ فٹ کے فاصلے پر رکی۔ راستے میں بھی اسے مسلسل محسوس ہورہا تھا کہ جیسے کوئی ان کا پیچھا کررہا ہو۔ اب انہیں اتنے قریب دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ گاڑی میں تین آدمی بیٹھے تھے اور وہ دزدیدہ نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ اس نے جلدی سے بٹن دبا کر شیشہ اوپر کیا اور گہرے سانس لے کر خود کو کمپوز کرنے لگی۔

دوسری طرف..... سمیرا ہسپتال کے کیفے ٹیریا میں ارسل کے سامنے بیٹھی تھی۔ ارسل کا سخت موڈ آف تھا، وہ قدرے جھنجلایا ہوا بھی تھا۔

''ارسل پلیز، مان جاؤ۔'' سمیرا ملتجی لہجے میں بولی۔

''کیا مان جاؤں؟ اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم نے اپنی بکواس بات منوانے کے لیے مجھے بلایا ہے تو میں کبھی بھی نہ آتا۔'' وہ لال بھبھوکا کا چہرہ لیے غصے سے کہہ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ سمیرا کا رنگ پھیکا پڑگیا۔

''ارسل پلیز، میں تو صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ تم فون کرکے مما سے کہہ دینا کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ پھر ہوسکتا ہے ممی کو پتا چل جائے کہ جیسے وہ زینب کو ٹھکرا رہی ہیں، اسی طرح کوئی ان کی بیٹی کو بھی ٹھکرا سکتا ہے پلیز۔'' وہ منت کررہی تھی۔

ارسل کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑگئیں۔

''کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتے۔'' اسے چپ بیٹھا دیکھ کر وہ پھر بولی۔

''سمیرا، یہ اتنا نہیں ہے یہ بہت زیادہ ہے جو تم مجھ سے کروانا چاہتی ہو۔ اگر پھپھو نہیں مانیں تو..... تم جانتی ہو ناں کہ میں تم سے.....''

''ہاں، میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو۔ نہ تم میرے بغیر رہ سکتے ہو اور نہ میں ٹھیک؟ تم بس تھوڑا انتظار کرنا اگر وہ مان گئیں تو میں خود ان سے کہہ دوں گی کہ میں تم ہی سے شادی کروانا چاہتی ہوں۔'' اس نے تفصیل اس کے گوش گزار کی۔ جسے سنتے ہی اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''ٹھیک ہے، لیکن صرف تمہاری خاطر۔'' وہ تنبیہہ کرتا بولا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ میں بندھی رسٹ واچ کی طرف دیکھا تو بے اختیار ماتھا پیٹا۔

''اوہ، مجھے تم سے بحث کرتے ہوئے آدھا گھنٹہ ہوگیا۔ زینی میرا انتظار کررہی ہوگی۔'' وہ تیزی سے اسے اللہ حافظ کہہ کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔

زینب نے پٹی والی سیاہ فراک پہنی ہوئی تھی، جس میں پٹی کے نیچے دونوں پہلوؤں کی طرف جیب بنی ہوئی تھی۔ ان ہی میں سے دائیں جانب بنی جیب میں اپنا موبائل رکھا ہوا تھا۔ اس نے ہلکے سے گردن موڑ کے پیچھے کھڑی سیاہ گاڑی کی طرف دیکھا، وہ تینوں اب بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے موبائل باہر نکالا، تب ہی ایس ایم ایس رنگ ٹون بجی۔ اس نے جلدی جلدی ان باکس کھولا، میسج برہان کا تھا۔

''زینب! تم کہاں ہو؟ اور کیا کیمرا تمہارے ساتھ ہے؟'' وہ جلدی جلدی بولتی میسج ٹائپ کرنے لگی۔

''برہان! ہم ہسپتال آئے ہیں، کیمرا کی دوست کے ابو کی عیادت کے لیے۔ کیمرا اندر ہے اور میں پارکنگ لاٹ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔'' ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ سب آنسوؤں کی لکیری بن گئی، اسے پتا ہی نہیں چلا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' تین لفظ تھے، اسے لگا پوری کائنات ان تین لفظوں میں سمٹ گئی تھی۔ اس کے رونے میں شدت آ گئی۔

''نہیں برہان! میں بہت ڈر رہی ہوں کیونکہ کچھ لوگ شاید ہمیں ٹریس کر رہے ہیں۔'' آج اس شخص سے بات کرتے ہوئے اسے بالکل گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔

''تم فکر مت کرو۔ بس گاڑی سے مت اترنا۔ میں آ رہا ہوں، کون سے ہسپتال میں ہو آپ لوگ؟'' اس کا فکر کرتا لہجہ، احساس۔ اس نے آنکھیں صاف کیں اور موبائل جیب میں ڈال لیا۔ جیب میں رکھنے سے پہلے اس نے موبائل سائلنٹ پر لگانا ضروری سمجھا سو لگا دیا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کے پیروں تلے زمین تب نکلی جب اس کے ساتھ کھڑی گاڑی آگے بڑھ گئی اور ان لوگوں کی گاڑی اس کی گاڑی کے ساتھ آ رکی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ رنگ زرد۔

''اوہ، اللہ تعالیٰ.....'' وہ زندگی میں اتنی خوف زدہ پہلے شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

''اللہ تعالیٰ پلیز.....'' وہ بے آواز پکار رہی تھی۔ تب ہی اس گاڑی کا دروازہ کھول کے کوئی باہر نکلا اور اس کی طرف کا دروازہ کسی آلہ سے کھولنے لگا۔

''نہیں پلیز..... نہیں.....'' اس سیاہ فام شخص نے تقریباً کھینچ کر اسے باہر نکالا اور اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔ وہ شور کرنا چاہتی تھی لیکن وہ شخص اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اچانک اسے اپنی گردن پر سوئی چبھنے کا احساس ہوا اور وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی۔

☆☆☆

کیمرا تیز رفتاری سے چلتی آ رہی تھی، تھم سی گئی۔ اسے لگا جیسے اس پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ کچھ لوگ زینب کو اس کی گاڑی سے نکال کر اپنی گاڑی میں ڈال رہے تھے۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے وہاں تک آئی لیکن وہ لوگ جا چکے تھے۔ بے اختیار وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر سی گئی۔ اب وہ کیا کرے گی؟ کیا جواب دے گی تایا جان کو؟ اوہ اللہ، آنسو زار و قطار بہنے لگے۔ پارکنگ لاٹ میں رش نہ ہونے کے برابر تھا، کوئی اس کے قریب نہیں آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنے شانے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا، وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ برہان اس کے پاس پاؤں کے نیچے موڑے بیٹھا تھا۔ وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ سارا معاملہ برہان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے دھیرے سے پلکیں کھولیں۔ بہ دقت پلکیں اوپر کو اٹھیں، ان پر جیسے بہت بوجھ سا تھا۔ سیاہ گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا، بالکل سیاہ..... وہ فرش پر کروٹ کے بل گری ہوئی تھی۔ اس کا بایاں گال فرش پر تھا۔ بمشکل وہ اٹھ کر بیٹھی اور کمر پیچھے دیوار سے لگا لی۔ بایاں ہاتھ جو اس کے نیچے تھا اس نے سامنے کر کے اسے دیکھا، اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ اسے اپنا ہاتھ دکھائی نہ دیا۔ تو کیا وہ اغوا ہو چکی تھی، ایک تکلیف دہ لہر اس کے پورے وجود میں اٹھی۔ پتا نہیں کیا وقت ہو رہا تھا۔

ابا، حمزہ، چچا، کیمرا، پھپھو سب کتنا پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اس کے لیے اور برہان..... اس کا خیال آتے ہی اس کے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ برہان اس کی فکر کر رہا تھا اس کے میسج..... میسج؟ جلدی سے اس نے دائیں ہاتھ سے اپنی بائیں جیب کو ٹٹولا۔ صد شکر اس کا موبائل اس کے پاس رہ گیا تھا، اس نے موبائل آن کیا تو اسکرین پر برہان کے کئی ایس ایم

ایس جگمگا رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ان باکس کھولا۔

''زینب! تم کہاں ہو؟'' اس کی سسکی بلند ہوئی۔

''زینب! کیا تم ٹھیک ہو؟'' وہ اس کے لیے فکر مند تھا۔

''تم بالکل بھی فکر مت کرنا۔ میں..... میں تمہیں بہت جلد ڈھونڈ لوں گا۔''

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ نہیں یہ وقت رونے کا نہیں تھا، ہمت کرنے کا تھا۔ اس نے موبائل مضبوطی سے تھام کر کال لاگ آن کیا۔ کپکپاتے ہونٹ، لرزتی انگلیاں..... خوف..... وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اس اندھیرے کمرے میں اکیلی تھی۔ کسی کے آجانے کا خوف، پکڑے جانے کا ڈر..... اسے کس کو کال کرنی چاہیے؟ اس نے لرزتی انگلیوں سے برہان کا نمبر ملایا تب ہی دور کہیں..... دور قدموں کی چاپ سنائی دی۔

''نہیں، پلیز اللہ تعالیٰ! میری مدد کر۔'' بیل جا رہی تھی، قدموں کی چاپ قریب ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کال نہ اٹھانے کا پیغام ملا۔ اس نے جلدی سے موبائل بند کیا اور جیب میں ڈال کر دم سادھ کر لیٹ گئی کہ جیسے بے ہوش ہو۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور قدموں کی چاپ اس کے بالکل قریب آ گئی۔ اس شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے آیا۔ ناچاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ سیاہ فام اسے ایسے ہی گھسیٹتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ وہ رات اذیت کی رات تھی۔ تکلیف دہ رات..... سب راتوں پہ بھاری رات۔

اس کمرے میں دو شخص اور بیٹھے تھے، وہی دونوں جو گاڑی میں بیٹھے تھے۔ وہ دونوں شخص دبکتے الاؤ کے گرد بیٹھے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ انہیں سن سکتی تھی۔ اس سیاہ فام شخص نے اسے ہوش میں دیکھ کر ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ بنا اعتراض کے بیٹھ گئی۔ وہ شخص اسے باندھنے لگا تھا تو اس کی سانس رک گئی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے بابر! کہ ڈی ایس پی مان جائے گا؟'' ایک آدمی جو عجیب سی نظروں سے اسے گھور رہا تھا، اپنے سامنے بیٹھے شخص سے بولا۔

''اسے ماننا ہی پڑے گا، اب اس کے پاس ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ویسے قاسم! یہ لڑکی ہے کمال کی چیز۔'' بدبو میں ڈوبی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا اور کچھ لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ ٹھنڈ ضرورت سے زیادہ تھی۔ وہ جو کرسی پر بندھی بیٹھی تھی، اس کے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

''اللہ تعالیٰ پلیز..... میرے لیے میری عزت کے سوا کچھ اہم نہیں ہے۔'' وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

''روتی کیوں ہو ڈیر! تمہارا عاشق تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے، ایسا اس نے خود کہا ہے۔ تمہاری خاطر تو اسے ہماری ڈیمانڈز ماننی ہی پڑیں گی۔''

دہکتی لکڑیاں اس کے جمے ہوئے خون کو حرارت بخش رہی تھیں۔ اس کا دل بند ہوتے ہوتے بچا۔ اچانک فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی اور عین اسی وقت جیب میں رکھے اس کے موبائل کی اسکرین چمکی اور اس روشنی پر پڑی۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ دونوں لڑکے حواس باختہ سے ہو گئے جبکہ تیسرا شخص جس کا نام بابر تھا، اس نے غصے سے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کا موبائل باہر نکالا۔

چٹاخ..... چٹاخ..... یکے بعد دیگرے کئی تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔ تھپڑ اس قدر زور آور تھے کہ اس کا ہونٹ کنارے سے پھٹ گیا اور خون قطرہ قطرہ ٹھوڑی سے بہنے لگا۔ غصے سے اس شخص کا برا حال تھا۔ فرش پر بہت سارے جوتوں کی آواز آنے لگی یقیناً وہ لوگ اس گھر کے اندر داخل ہو چکے تھے اور وہ

pklibrary.com

بابر نامی شخص غصے سے پاگل ہوا۔ اردگرد کچھ ڈھونڈ رہا تھا شاید۔ اچانک اس کی نظر ایک سلاخ پر پڑی جو بابر کے ہاتھ میں تھی۔

"نہیں..... پپ..... پلیز..... نہیں..... نہیں....." حیرت، خوف، بے یقینی..... بابر نے اس سلاخ کو پورے زور سے اس کی ٹانگ پر دے مارا اور اس کی دل خراش چیخ پورے کمرے میں گونج گئی۔ دروازہ دھڑ دھڑا پیٹا جا رہا تھا۔ ٹھوکروں سے، مکوں سے اور ہاتھوں سے۔ اس کی چیخیں بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ بابر نے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اس کو زمین پر دے مارا، تب ہی دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ بے ہوش ہو رہی تھی۔ اس کی اعصاب جواب دے رہے تھے شاید..... اس نے اندر داخل ہونے والے کے جوتوں کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل رہا تھا۔ آخری منظر جو اس کی آنکھوں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ بابر اب زمین پر پڑا تھا۔

☆☆☆

کتنا وقت گزرا، کتنے لمحے بیتے، کتنے پل گزرے اسے نہیں پتا۔ وہ بے ہوش تھی، اس کے اعصاب دباؤ کا شکار ہو گئے تھے شاید۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب بحال ہونے لگے تھے۔ وہ ٹھکانے پر آنے لگے تھے۔ لیکن نہیں، اسے ہوش میں نہیں آنا۔ وہ ہوش میں نہیں آنا چاہتی۔ کیسے کرے گی، وہ سب کا سامنا۔ کیا منہ دکھائے گی اپنے بابا کو..... اس کی پلکیں لرزش کا شکار تھیں۔

"زینب!" بہت ہولے سے کسی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ بر..... برہان..... ہاں برہان نے پکارا تھا اسے۔

"زینی! اٹھ جاؤ پلیز۔" آہستہ سے اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اب اسے آنکھیں کھول دینی چاہئیں۔ اس نے بہ دقت پلکیں اٹھائیں۔ پپوٹے بہت بھاری ہو گئے تھے۔ بے اختیار اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"زینی! آر یو اوکے۔" اس کا لہجہ فکرمندی لیے ہوئے تھا۔ آنکھیں تھکی تھکی سی تھیں۔ اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ وہ کمرہ کسی ہسپتال کا لگ رہا تھا۔ کیا وہ اسپتال میں تھی، اس کی تو جیسے سانس ہی اٹک گئی۔

"ہم کہاں ہیں؟" اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آئی تھی۔

تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ایک لیڈی ڈاکٹر مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کیسی ہیں اب آپ؟" وہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اس کے پاس چلی آئی۔

"تھینکس ڈاکٹر نوال!" برہان اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم اس کے بدلے مجھ سے کچھ بھی مانگ سکتی ہو۔" وہ شاید کافی دیر بعد مسکرایا تھا۔

"میں یہی مانگنا چاہتی ہوں کہ اگر تمہیں پھر کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو میرے ہی پاس آنا۔" وہ پراعتماد انداز میں گویا ہوئی۔ نوال برہان کی پرانی گہری دوست تھی شاید۔

"ہم جائیں اب؟"

"ہاں، ویسے بھی اب صبح ہونے والی ہے۔ زیادہ گہری چوٹیں نہیں ہیں۔ پنڈلی پر گرم سلاخ زیادہ زور سے مارے جانے کی وجہ سے زخم تھوڑا گہرا ہے۔ اس لیے کچھ دن تک یہ چل نہیں پائیں گی تو انہیں وہیل چیئر پر....."

"ہاں ہاں یار! سمجھ گیا۔ بٹ تھینکس اگین۔" اس کی بات کاٹ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بائی داوے برہان! یہ لڑکی....."

"یہ لڑکی میری وائف ہے۔ اب ہم جائیں۔" اس کی بات پر ڈاکٹر نوال کی بے ساختہ ہنسی فضا میں گونجی۔

"ہاں..... ہاں جائیں آپ لوگ۔ ایک آخری بات۔" برہان کے قریب آئی اور دھیمی آواز

میں پتا نہیں کیا کہا، زینب جان نہ سکی۔ اس کی بات سن کر وہ مسکراتا ہوا سر اثبات میں ہلانے لگا۔

☆☆☆

گہری سیاہ رات بیت چکی تھی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے اور اذان کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ ارحان، انابیہ اور علیشا کے علاوہ باقی سب افراد لاؤنج میں پریشان و متفکر سے بیٹھے تھے۔ ہر شخص کی تکلیف چہرے سے عیاں تھی۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ بالکل خاموش..... پورا لاؤنج سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ تب ہی گیٹ پر برہان کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا۔ جھکے ہوئے تمام چہرے اوپر اٹھے۔ گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور پھر گاڑی کے ٹائروں کی۔ حمزہ جو بیٹھا ہوا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھا۔ حمزہ نے آگے بڑھ کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا۔ وہ اسے لیے لاؤنج کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

برہان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ دونوں نے دائیں بائیں اسے تھام رکھا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے، بیٹھے ہوئے تمام افراد کھڑے ہو گئے۔ زینب رو رہی تھی۔ وہ داؤد صاحب کے سینے سے لگی، روتی رہی۔ چچا غصے سے لال پیلے ہوئے جا رہے تھے، انہیں شدید غصہ تھا۔ برہان سر جھکائے کھڑا تھا اور تمام حالات و واقعات سے انہیں آگاہ کر رہا تھا۔

"مجھے سونا..... ہے..... تم..... تم لوگ جاؤ۔ یہاں سے۔" سمیرا اور اریشہ اسے چھوڑنے آئی تھیں۔ اس کا دوٹوک انداز..... وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔ کپڑے وہ چینج کر چکی تھی۔ ہلکے انگوری رنگ کا کرتا جس پر میرون کڑھائی تھی۔ خالی خالی آنکھوں سے فرش کو تکتی وہ بہت زخمی دکھائی دے رہی تھی۔ اریشہ اور سمیرا دونوں اس کے پاس چلی آئیں۔

"ہمارے جانے کے بعد صرف سونا ہے تم نے۔ رونا نہیں، اوکے۔" اریشہ نے اس کا زخمی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

"صرف..... صرف تمہاری وجہ سے آج یہ دن آیا ہے۔ اس کی وجہ صرف تم ہو برہان! تم..... تمہاری وجہ سے آج یہ دن دیکھنا پڑا ہے ہم لوگوں کو۔ تمہاری وجہ سے آج اپنی تکلیف سہی ہے اس بچی نے۔ مجھے شرم آ رہی ہے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے برہان!" چچا کی آواز غصب کے عالم میں پورے لاؤنج میں گونج رہی تھی، سب سہم سے گئے تھے۔ برہان کی ٹھوڑی گردن سے چپک گئی تھی۔

"چچا جان! پلیز..... آپ برہان....." حمزہ نے آگے بڑھ کر انہیں ٹوکنا چاہا مگر.....

"تم خاموش رہو۔" لہجہ اتنا سپاٹ تھا کہ وہ وہیں رک گیا۔ خاموشی نے ایک بار پھر لاؤنج کے احاطے میں ڈیرا ڈال لیا۔ پھر اچانک عابدہ بیگم کے موبائل کی بپ بجی۔

"ارسل!" نام پڑھ کر وہ کچھ حیران ہوئی تھیں۔ نام سب نے بخوبی سنا تھا۔ سمیرا کا تو مانو دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے پسلیاں توڑ ڈالے گا۔

"اوہ خدایا، ارسل! نہیں..... تم کچھ مت کہنا۔" سمیرا دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔ اس کے خیال میں اب سب ٹھیک ہونے والا تھا لیکن یہ صرف اس کا خیال تھا۔ عابدہ بیگم نے کال پک کر کے فون کان سے لگایا۔

دوسری طرف سے ارسل شاید حال احوال معلوم کر رہا تھا، عابدہ بیگم مسکراتے ہوئے اسے جواب دے رہی تھیں۔ پھر اچانک ان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ مسکراہٹ کی جگہ الجھن و بے یقینی نے لے لی۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ سب بغور ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سمیرا کا تو جیسے سانس گھٹنے لگا تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ لاؤنج میں بالکل سناٹا تھا۔ موبائل کے اسپیکر سے آنے والی ارسل کی آواز کو سنا جا سکتا تھا۔

"پھپھو..... میں..... میں سمیرا..... سے شادی نہیں..... نہیں کرنا چاہتا۔" اٹک اٹک کر جملہ مکمل کیا

گیا۔ بم تھا جو سب کی سماعت پر پڑا۔ عابدہ بیگم کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔ موبائل ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ان کے دامن میں گر گیا۔ سمیرا کے آنسو بے اختیاری میں بہہ نکلے۔ بے اختیار وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اریشہ وہاں کھڑی نہ رہ سکی سو اس کے پیچھے لپکی۔ پھپھو اٹھ کر عابدہ چچی کے پاس بیٹھ گئیں۔

عابدہ چچی اب باقاعدہ رونے لگیں۔

''آپ روئیں نہیں بھابھی! ہوسکتا ہے ارسل کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ ناسمجھ بچہ ہی تو ہے وہ۔ ہم حمید بھائی سے بات کریں گے، ایسے تھوڑی ہی رشتے ٹوٹتے ہیں۔'' پھپھو نرم لہجے میں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔

''زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے یہ، بس مکافات عمل ہے۔'' حسین صاحب کا انداز چونکانے والا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب بالکل واضح ہے، ہم کو ہمیشہ وہی ملتا ہے جو ہم دوسروں کو دیتے ہیں۔ ہم سب انسان ہیں بالکل عام انسان..... ہم مکاری سے دوسروں کے ساتھ برا کرتے ہیں اور ہم اتنے ناسمجھ ہوتے ہیں کہ ہمیں لگتا ہے ہمارے ساتھ اچھا کیا جائے گا؟ اپنے رویوں سے دوسروں کو تکلیف دیتے ہیں اور ہمیں لگتا ہے ہمارے کہے گئے الفاظ واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے؟ ایسا نہیں ہوتا، ایسا کر کے ہم محض خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ وہ اللہ ہے نا، جو بہت انصاف کرنے والا ہے۔ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیتا۔'' چچا سانس لینے کو رکے اور عابدہ چچی کی طرف گھومے۔

''تمہیں کیا لگتا تھا کہ تم زینب کے لیے انکار کردو گی اور خود بچ جاؤ گی۔ تمہیں نہیں بھولنا چاہیے تھا عابدہ کہ تم خود دو بیٹیوں کی ماں ہو اور بیٹیوں کے دل بہت حساس ہوتے ہیں۔ میں سب کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ آج سمیرا کے ساتھ جو ہوا اس سب کی وجہ صرف تم ہو۔ برہان کو گمراہ کرنے کی وجہ بھی تم ہو۔'' سخت غصہ، سرد لہجہ، سپاٹ تاثرات دیکھ کر سب بے یقین رہ گئے۔ عابدہ بیگم کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

''بھائی پلیز۔'' پھپھو بے بسی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اور برہان اب بھی وہیں کھڑا تھا، گردن جھکائے، شرمندہ سا۔ قدم قدم چلتا وہ حسین صاحب کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ انہوں نے رخ پھیر لیا۔ سخت ناراضی کا ثبوت۔ اچانک بادلوں کی گرج کی آواز آئی اور..... اور پھر تیز ہوا لاؤنج کی قد آور کھڑکی سے اندر داخل ہوئی۔ سیاہ رات کا اختتام ہو گیا تھا لیکن اب بھی ہر سو اندھیرا تھا۔ ٹھنڈ تھی، سردی بھی سخت بھی۔

''آئی ایم سو..... سوری پاپا!'' برہان نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

وہ ان کی پہلی اولاد تھا۔ سب سے زیادہ لاڈلا۔ سب سے زیادہ محبت انہوں نے اسی سے تو کی تھی۔ اچانک بجلی چمکی۔ پل بھر میں پورا لاش روشن ہو گیا۔

''آئی ایم سوری پاپا! مجھے معاف کردیں پلیز.....'' وہ منت کر رہا تھا۔ بارش کی تیز بوچھاڑ کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ حماد نے اٹھ کر کھڑکی کے پٹ بند کردیے۔

''ویل..... تمہارے سوری کہنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' حسین صاحب کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ طنز کرتا ہوا۔ وہ آج سارے حساب چکانے کے موڈ میں تھے۔

''چچا جان! آپ برہان کو ایک موقع تو دیں۔ ہوسکتا ہے، سب ٹھیک ہو جائے۔'' حمزہ جو کب کا خاموش بیٹھا تھا، اب بولا تو برہان کو کچھ حوصلہ ہوا۔

''ہاں پاپا! مجھے ایک موقع دیں، میں سب ٹھیک کرلوں گا۔''

''برہان! کیا تمہیں لگتا ہے، آج اس گھر میں جو تکلیف دو بچیاں برداشت کر رہی ہیں، تم اس کا مداوا

pklibrary.com

Monthly Shuaa July 2021

کرلو گے؟'' حسین صاحب کا لہجہ اب بھی بے یقین تھا۔

''حسین! بس کر جاؤ۔ تم بچے کا حوصلہ مت توڑو۔'' داؤد صاحب نے انہیں ٹوکا۔

''چلیں، دیکھتے ہیں بھائی!'' بے اعتباری سے شانے اچکا کر وہ وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆

وہ آئینے کے سامنے بیٹھی بغور اپنے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے کے زخم اسے تکلیف نہیں دے رہے تھے بلکہ کچھ اور وجہ تھی جس سے وہ تکلیف میں مبتلا تھی۔ درد..... تکلیف..... جلن..... گھٹن..... اس کا دم گھٹنے لگا۔

عابدہ چچی کی نظریں اسے اپنے جسم کے پار ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی نفرت و ناپسندیدگی میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ آنکھوں میں چبھن واضح تھی۔ خیر وہ جلد یا بدیر ان کی خواہش پوری کردے گی۔ پھر وہ جس سے چاہیں گی، اپنے برہان کی شادی کردیں گی۔

اس کے ماتھے پر پٹی بندھی تھی، زمین پر کرسی سمیت گرنے کی وجہ سے گہرا زخم آیا تھا۔ ہونٹ بھی پھٹا تھا۔ پنڈلی بھی زخمی ہوئی تھی لیکن نہیں..... یہ زخم اسے زیادہ تکلیف نہیں دے رہے تھے۔ برہان سے دوری زیادہ تکلیف دہ ہوگی؟ آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔ کھڑکی سے زمین پر گرنے والی تیز بوندیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رونے لگی۔ سسکیاں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔

''برہان نے مجھے کبھی ایکسپٹ نہیں کیا، تب بھی نہیں جب میں پاکیزہ تھی۔ پاکیزہ تو اب بھی ہوں لیکن..... اب میں اغوا شدہ اور داغ دار ہوں۔ اب تو وہ میری طرف دیکھے گا بھی نہیں۔'' سسکیاں بلند تر ہوتی جارہی تھیں۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ کیا وہ [redacted] میں اسی حادثے کی کمی تھی جواب پوری ہوگئی تھی؟

''آئی ایم سوری زینب!'' کہیں بہت قریب سرگوشی کی آواز آئی۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ چہرا ہاتھوں میں چھپائے ہوئے بیٹھی رہی۔ بالکل ساکت۔

''زینب! کیا تم مجھے معاف کردو گی؟'' بے یقین سا لہجہ یقین چاہتا تھا، جیسے۔ اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔ پلکیں اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ سرخ متورم آنکھیں اور بھی واضح لگ رہی تھیں۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ اسٹول پر بیٹھی تھی اور وہ اس کے پیچھے اداس سا کھڑا تھا، اس نے چہرا جھکا دیا۔

''کچھ تو بولو پلیز، مجھے تمہاری خاموشی سے.....'' جھنجلایا سا لہجہ، اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''زینی! کیا تم جانتی ہو، مجھے تم سے محبت کب ہوئی؟'' اس کا عجیب سوال، پراسرار لہجہ، زینب نے ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے کو سختی سے پکڑ لیا۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے بہت سی شکایات ہیں، میں نے بہت دفعہ تمہاری انسلٹ کی ہے۔ بہت بے عزت کیا ہے تمہیں لیکن..... لیکن میں نے اس دن پیزا ہٹ میں تمہاری انسلٹ اسی لیے کی تھی کہ تم زیادہ باہر مت نکلو اور مجھے ان کریمنل کی سامنے جھکنا نہ پڑے۔ پلان کے مطابق تم بہت سارے دن باہر نہیں گئیں اور تمہاری وجہ سے باقی لڑکیاں بھی۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔ زینب کا چہرہ اب بھی جھکا ہوا تھا۔

''لیکن زینی! میں جب بھی تمہاری انسلٹ کرتا اس کے بعد میں تم سے معافی مانگنے بھی تو آجاتا تھا نا۔''

اس رات برستی بارش میں وہ اس کے پیچھے چھت پر گیا تھا لیکن معافی..... نہیں بالکل نہیں۔ وہ کب آیا تھا اس سے معافی مانگنے؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''تم سوچ رہی ہوگی کہ میں کب آیا تم سے

pklibrary.com

Monthly Shuaa July 2021

معافی مانگنے، رائٹ۔ خیر، اب میں تم سے اپنی ہر غلطی و گستاخی کی معافی مانگتا ہوں۔ کیا تم مجھے معاف کردو گی؟ میں تمہارے سامنے گھٹنوں کے بل.....''

وہ واقعی اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تو وہ بے اختیار ''نہیں، نہیں'' کہہ کر جیسے جھٹکے سے اٹھی۔ درد کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کرگئی۔ وہ پنجوں کے بل کھڑے ہونے سے قاصر تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگی کہ برہان نے اسے تھام لیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کو تھامنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ مارا اور ایک گلدان نیچے گر کر کرچیوں میں تقسیم ہوگیا۔ وہ اسے اپنے مضبوط ہاتھوں سے تھامے کھڑا تھا۔ بے اختیار بہت سے آنسو اس کے رخساروں کو بھگونے لگے۔

''زینب روؤ نہیں پلیز۔ میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ اسے لیے بیڈ تک آیا۔ وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ برہان بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے، وہ اب بھی رو رہی تھی۔

''زینب! میں..... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ زندگی میں تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ تم جو چاہو گی، تمہیں وہ ملے گا۔ بس تم مجھے معاف کردو اور..... اگر تم اب بھی چاہو گی تو میں تمہیں خلع.....''

''نہیں چاہیے مجھے خلع..... سمجھتے کیوں نہیں ہو تم؟ وہ سب..... صرف ایک جذباتی فیصلہ تھا۔ جو..... جو میں نے کیا تھا۔'' اپنے ہاتھ چھڑا کر وہ اونچی آواز میں چلانے لگی۔ اس کے اس طرح چلانے پر وہ قدرے بوکھلایا اور جلدی جلدی جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی۔ پانی کا گلاس اسے پکڑایا جسے وہ چند گھونٹ میں اتار گئی۔

''برہان! محبت کرتی ہوں میں تم سے..... کیوں نہیں کرتے، تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تھے۔ تمہیں کھودینے کا ڈر مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ میں اکیلی ہوجاتی ہوں یہ سوچ کر، مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ برہان! میں نے تم سے شدید محبت کی ہے۔ میں اب تمہیں ہارنا نہیں چاہتی۔'' وہ اس کے بازو پر سر رکھ کے بری طرح رو رہی تھی۔

''گڈ..... ویری گڈ۔ میں یہی سننا چاہ رہا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ محظوظ سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا (ایڈیٹ نہ ہو تو) وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

''برہان! تم بہت برے ہو۔'' وہ جیسے اسے آگاہ کررہی تھی، وہ ایک بار پھر کھل کے مسکرایا۔

''ہاں، مجھے بھی کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ میں بہت برا ہوں۔ خودغرض ہوں، ڈھیٹ ہوں، اکھڑ مزاج ہوں۔'' اس کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ زینب کی بے اختیار ہنسی پورے کمرے میں گونج گئی۔

''شکر ہے، تمہاری ہنسی سننے کو ملی۔'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ جھینپ گئی۔

''خیر تو مادام! میں آپ کے ساتھ اپنی پوری زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں اور یقیناً آپ بھی ایسا ہی چاہتی ہوں گی۔ میں تقریباً خشک مزاج اور ریزرو سا بندہ ہوں۔ کیا آپ خوش رہیں گی، میرے ساتھ۔'' وہ آہستہ آہستہ نرم آواز میں کہہ رہا تھا، زینب نے شرم سے سرخ پڑتے سر جھکالیا۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''لیکن برہان! وہ چچی جان.....'' خوف، اضطراب، بے چینی سب کچھ تھا اس کے انداز میں۔

''ڈونٹ وری، مما کو میں منالوں گا۔'' اس نے اسے تسلی دی۔ وہ بس سر جھکا کر مسکرادی۔

''ٹھیک ہے، پھر میں چلتا ہوں۔ ایک کام تو ہوگیا، بس اب دوسرا نمٹالوں۔ پھر ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ زینب نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو جانے کی تیاری کررہا تھا۔ وہ قدم قدم چلتا دروازے تک آیا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر چوکھٹ پار کرگیا۔ زینب نے شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں بارش تھم چکی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی بھی پھیلی ہوئی تھی۔

pklibrary.com

☆☆☆

ارسل کے والد حمید اصغر کے ڈرائنگ روم میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے۔ شہلا بھابھی (ارسل کی ماں) ہونق بنی سب کے منہ دیکھ رہی تھیں۔ عابدہ بیگم کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ برہان داؤد صاحب کے دائیں جانب بیٹھا تھا۔ سنجیدہ چہرا، واضح غصہ۔ حمید صاحب حیرانی و پریشانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھپھو عابدہ چچی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

''ارے بھائی صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ارسل اتنی غلط بات کیسے کہہ سکتا ہے؟'' شہلا بھابھی کا سکتہ ٹوٹا اور وہ حسین صاحب سے گویا ہوئیں۔

''ہم غلط بیانی نہیں کر رہے ممانی! ارسل نے خود کہا ہے یہ سب۔'' برہان نے سنجیدگی سے کہا۔ بات ان کے لیے بھی ناقابل یقین تھی کیونکہ ارسل کے کہنے پر ہی تو یہ منگنی ہوئی تھی۔

''ارسل کب تک آئے گا۔ ہم اسی سے معلوم کرلیں گے کہ ایسا اس نے کیوں کہا۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں، بچے ہیں ابھی یہ..... اچھے برے کا پتا نہیں ہے انہیں۔ ٹھیک ہے۔'' داؤد صاحب اپنی نرم آواز میں کہہ رہے تھے۔ حالانکہ انہیں سنجیدہ ہونا چاہیے تھا لیکن معاملے کی نزاکت دیکھتے ہوئے اگر وہ بھی سخت سنجیدہ ہوجاتے تو بات کیسے بنتی؟

''دیکھیں عابدہ آپا! ارسل نے جو بھی کہا ہوگا میں اس کی آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ پلیز، اس کی بات بھول کر ہمیں معاف کردیں۔ میں نے تو سمیرا کے سوا کسی اور کو بہو بنانے کا تصور بھی نہیں کیا۔ پھر ہم اتنی آسانی سے کیسے.....'' داؤد صاحب کی بات سے شہلا بھابھی کو تقویت ملی تو وہ کہنے لگیں۔

ارسل کی تو صحیح معنوں میں سٹی گم ہوگئی تھی۔ پھر خود کو کمپوز کرتا آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ایک ایک کرکے سب سے ملنے لگا۔ عابدہ بیگم کے بہتے آنسو اور سب کے سنجیدہ چہروں سے اسے اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔

''کیا ہم جان سکتے ہیں کہ تم نے آپا کو فون کرکے وہ بکواس کیوں کی تھی؟'' حمید صاحب کے تنے ہوئے نقوش اور بھنچے ہوئے لب اس کی رگوں میں بہتے ہوئے خون کو منجمد کرنے لگے تھے۔ اس نے بہت آس سے چہرا اٹھا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

''ایم سوری، میں نے وہ سب.....'' وہ جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ شہلا بھابھی بول اٹھیں۔

''تم نے جیسے بھی کہا ہو بس اب ہم نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''یہی کہ پندرہ دن بعد تمہاری شادی ہے، وہ بھی سمیرا سے۔ کیوں حسین! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔'' داؤد صاحب نے تائیدی انداز میں کہا تو اس نے کھل کے سانس لیا۔ سب بے اختیار مسکرادیے۔ حسین صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ یہ واقعہ عابدہ بیگم کو سبق سکھانے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

ہر سو شام اتری ہوئی تھی۔ ہر شخص کے چہرے سے اس کی خوشی عیاں تھی۔ سمیرا اور ارسل کی شادی میں صرف پانچ دن رہ گئے تھے۔ زینب کے زخم مندمل ہوگئے تھے لیکن احتیاطی تدابیر کے طور پر وہ ابھی وہیل چیئر کا استعمال کر رہی تھی۔ سب لوگوں کے بازار کے چکر لگ رہے تھے۔ دونوں گھروں میں خوشیوں کی پریاں اتری ہوئی تھیں۔

زینب کا کام کرنا بالکل بند تھا۔ عابدہ بیگم کا رویہ اس سے بہتر سے بہتر ہوتا جارہا تھا۔ چچی نے سب کے سامنے اعتراف کیا تھا۔

''آج سے پہلے میں نے زینب کے ساتھ جو زیادتی کی ہے، میں سب کے سامنے اس سے معافی مانگتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ سمیرا کے ولیمے پر ان

دونوں کے نکاح کو منظر عام پر لے آئیں۔'' چچی کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔

وہ شرم سے لال ہوتی سر جھکا گئی۔ چچی کو نصیحت مل گئی تھی، چاہے ایک ٹھوکر سے ہی ملی تھی۔ اس سے بڑی خوشی کی بات ہو سکتی تھی بھلا۔ سب خوش تھے، بہت زیادہ خوش۔

آج شام کی چائے پر سب آہستہ آہستہ لان میں جمع ہو رہے تھے۔ وہ بھی اپنی چیئر گھسیٹتی جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی، برہان اسی وقت لاؤنج کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا۔ وہ اسی کی طرف آ رہا تھا۔

''زینی! اب تمہیں کوشش کرنی چاہیے۔ اپنے پاؤں پر چلنے کی۔ آؤ، میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ چلو شاباش۔'' برہان نے اپنے ہاتھ کی چوڑی ہتھیلی اس کے سامنے کی تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے نفی میں گردن ہلا دی۔

''نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے۔ ویسے بھی زخم ابھی بالکل ٹھیک نہیں ہوئے۔'' تحمل سے کہہ کر وہ آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور پھر ایک پاؤں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تم پریشان کیوں ہو؟'' اس نے پوچھا تھا کہ وہ پریشان کیوں ہے؟ یعنی وہ جانتا تھا کہ وہ واقعی پریشان ہے۔

''برہان! اٹھ جاؤ، کوئی دیکھ لے گا۔'' ڈرتے ہوئے وہ اسے تنبیہ کر رہی تھی۔

''ہم نامحرم تھوڑی ہیں جو کوئی دیکھ لے گا، تو برا سمجھے گا۔'' اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

''بتاؤ، اب کیا بات ہے؟'' وہ جاننے پر مصر تھا۔

''برہان! مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں گزرا وقت دوبارہ آ گیا؟ میں نے بہت مشکل سے تمہیں پایا ہے۔ میں اب تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ کل کو اگر کسی کو اس حادثے کا پتا چل گیا تو.....''

''زینب! پہلی بات وہ حادثہ ہم سب گھر والوں کے درمیان راز ہے اور یقیناً ہماری فیملی کو راز رکھنے تو آتے ہی ہوں گے اور دوسری بات جب تک میں ڈی ایس پی ہوں، ہمارا گزرا کل دوبارہ نہیں آ سکے گا اور میں اپنی پوری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، سو اس وجہ سے میں کوئی الگ نہیں کر سکے گا اور اب تمہیں اس وجہ سے پریشان نہیں ہونا ورنہ میں برا مانوں گا ٹھیک۔'' اس کا نرم ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیے وہ بہت سکون سے کہہ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

''اب چلو، باہر ہماری فیملی ہماری منتظر ہوگی۔'' کہتے کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا جسے فوراً زینب نے تھام لیا۔ وہ اسے لیے آہستہ آہستہ لان کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں بیٹھے سب افراد ہی مسکرا رہے تھے۔ عابدہ بیگم نے اپنے ساتھ والی کرسی خالی کروائی جہاں سمیرا بیٹھی تھی۔ سمیرا اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

''عائشہ! زوہیب سے بات کرو، اور اسے بھی بلاؤ۔'' داؤد صاحب نے جیسے حکم صادر کیا تھا۔ پھپھو الجھی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

''خیریت؟''

''ارے بھئی، وہ بھی آ جائے تو ہم دونوں سے بھی فارغ ہوں۔ اب ان کا فرض بھی تو ادا کرنا ہے نا۔'' انہوں نے اریشہ اور حمزہ کی طرف اشارہ کیا تو سب بے ساختہ ہنس دیے۔ اریشہ نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

''ٹھیک ہے بھائی! میں کروں گی ان سے بات۔'' پھپھو خوشی اور تشکر سے مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ہر طرف خوشیوں کے سائے تھے۔

pklibrary.com

شازیہ الطاف ہاشمی

شمع کی لو

pklibrary.com

''کون ہے؟'' سرخ لپ اسٹک گداز لبوں پہ سجاتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے تھے۔ سرخ پٹیالہ شلوار اور چھوٹی سی گولڈن قمیص بلاشبہ وہ ایک حسین لڑکی تھی اور یہ سوٹ اسے اور حسین بنا رہا تھا، اس کی گواہی پرانی دھندلے شیشے والی سنگھار میز روز دیتی تھی۔ اسے اتنا صاف کیا گیا تھا کہ وہ اصل رنگت کھو بیٹھی تھی۔ ساتھ والے پلنگ پہ بڑا سا گوٹا کناری سے سجا باریک دوپٹہ اوڑھے جانے کا منتظر تھا۔

ماں دروازے پہ کھڑی سوالیہ نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

''سچ اماں! اگر تم دیکھو گی ناں ایک پل کو تمہاری سانس بھی تھم جائے گی۔ بڑے زمین دارے کا مالک ہے۔ وہ ٹھاٹھ ہیں کہ سنو تو دانتوں تلے انگلی داب لو گی اور مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ میں بتا بھی نہیں سکتی۔'' لمبے بالوں کی پیاری سی چوٹی گوندھتے شمع کے ہاتھ اب چوڑیاں پہن رہے تھے۔

''میں تو ایک بات جانتی ہوں شمع! جنید سے بڑھ کر تجھے کوئی چاہ نہیں سکتا۔ اس کی آنکھوں میں جوان بوڑھی آنکھوں نے دیکھا ہے، وہ تجھ ناتجربہ کار، کل کی لڑکی کو کیا پتا۔'' اماں کی آنکھیں اب غصے کے بجائے کسی اور جہان میں پہنچی لگتی تھیں، وہ کسی اور دنیا کی بات کرتی تھیں۔

''اور سن، اسے میرے پاس لے آ..... آگے جو تیرا فیصلہ اور اب یہ ملنا ملانا ختم کر کے سیدھا یہاں بلا۔''

''اماں! تم کتنی پیاری اماں ہو بلکہ اماں تو لگتی ہی نہیں ہو، میری بڑی بہن لگتی ہو تم۔'' شمع نے جلدی سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

''مجھے شمع سے محبت ہے اور میں شادی کرنا چاہتا ہوں شمع سے، میں اسے باعزت طریقے سے اپنی عزت بناؤں گا خالہ جی۔'' باہر کھڑی لینڈ کروزر، چمچماتے جوتے پہنے وہ بڑا پراعتماد لگ رہا تھا۔

یونانی دیوتاؤں سے بھی اونچی چیز، گھنی مونچھوں والا بھرپور مرد اور اگر یہ شمع کا نصیب ہے تو اللہ کا شکر ہے، اس کے مضبوط بازوؤں میں تو کوئی بھی لڑکی خود کو محفوظ ہی سمجھے گی۔''

مہرالنساء نے ساری زندگی ایسے ہی خواب دیکھے تھے مگر خود اس کا شوہر شمع کا باپ نشے کی لت میں سب بھول بھال اللہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ کانٹوں پہ گھسٹنا کیا ہوتا ہے، مہرالنساء کو بخوبی علم تھا، اسی دروازے سے منیر علی کہیں کھو گیا تھا تو دوسرا سائبان بھی اسی راستے آیا تھا، شاید نصیب اسی کو کہتے ہیں۔

زندگی آسان نہیں تھی، اب شاید آسان ہو جاتی۔

''شمع بیٹی! چائے بسکٹ اور ساتھ گرم سموسے بھی لے آؤ۔'' شرمائی شرمائی شمع اک اک شے جو اسی کے اعزاز میں آئی تھی اسے دیکھنے میں مگن تھی۔

اندر دونوں پلنگوں پہ مٹھائی کے بڑے ٹوکرے اور قیمتی کپڑوں کا انبار پڑا تھا۔ ایک ایک سوٹ پہ ایسا ایسا کام ہوا تھا کہ خواب میں ہی سوچا جا سکتا تھا اور

گولڈ کے دو بھاری سیٹ تحفے کے نام پر۔ شمع کی آنکھیں خیرہ تھیں تو اماں کی آنکھیں سوچ میں پڑ گئیں۔

یہ سب وہ اکیلا ہی یہاں چھوڑ گیا تھا۔ یہ ساری شاپنگ واسع چوہدری نے خود کی تھی وہ ایسے لوگوں میں جائے گی۔ سونے کی انگوٹھیاں پہنے گی۔ کپڑے لتے کی کمی نہ ہوگی، ہر شے کی ریل پیل یہ سب تو بالکل خوابوں جیسا لگ رہا تھا ایسا خوش نما خواب کہ آنکھ کھولنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ ماں بھی خوش تھی مگر وہ کچھ سوچ بھی رہی تھی۔ شمع بے شک چاند کا روشن ٹکڑا تھی مگر تھی تو ٹکڑا ہی ناں، ان پورے چاند جیسے لوگوں میں شمع کی گنجائش آخر نکل کیوں رہی تھی۔

بشریٰ اس کی گہری سہیلی تھی۔ وہ لوگ امیر بننے کا بڑا شوق رکھتے تھے گنجائش نکال کر کوئی نہ کوئی تقریب سجاتے رہنے کی کوششوں میں مصروف رہتے۔ بشریٰ کا بھائی اعجاز جسے بڑی لمبی لمبی اپنے قد سے بھی بڑی چھوڑنے کی عادت تھی۔ واسع اسی کا جاننے والا تھا، سالگرہ کی تقریب میں غریبی بھی کہیں نہ کہیں آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھی۔ بشریٰ کے سخت اصرار پر شمع جو ہمیہ وقت سلائی کڑھائی کے کام میں مصروف رہا کرتی تھی، ماں سے اجازت لے کر سالگرہ میں شرکت کے لیے گئی تھی وہیں جہاں کیک کے ٹکڑے کے گرد بہت سارا مسکرا کر خود کو امیر ظاہر کرنے کے جتن ہو رہے تھے۔ اپنی چادر کو کھینچ تان کر پھاڑا جا رہا تھا۔

ایسی تقاریب میں شامل ہونے کا شمع کو بھی شوق تھا۔ کبھی کبھار وہ بھی چلی جایا کرتی تھی۔ نواڑی پلنگ پر لیٹی ماں کی پرسوچ نگاہیں پتا نہیں چھت کی کڑیوں میں کیا ڈھونڈتی رہتی تھیں پھر جب شمع کو واسع چوہدری کی نظروں سے محبت کے بڑے زور آور پیغام وصول ہونے لگے اور ایک آدھ ملنا ملانا بھی ہو گیا۔ مہنگے ہوٹل کے پردوں کے پیچھے وہ اس با اثر آدمی کے ساتھ چائے کھانا بھی کھا کر آئی تو خود کو بھی اسی کی طرح معتبر اور طاقت ور سمجھنے لگی تھی۔

ان بیس سالوں میں اس نے کبھی کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ ماں کہتی تھی کہ جنید اسے دو وقت کی روٹی تو دے ہی سکتا ہے مگر اس کی گھنٹی والی سائیکل دیکھ کر شمع کو نہیں لگتا تھا کہ وہ کبھی ترقی کر سکے گا۔ سائیکل تو چلتی بھی آہستہ آہستہ ہے، بس ٹانگیں شل ہو جاتی ہیں، آگے نہیں بڑھتی کبھی، لینڈ کروز کی رفتار سے اس کا کیا مقابلہ۔

بس پھر اس نے اماں کے پوچھنے پر ایک بھی جھوٹ نہ بولا اور سب کہہ دیا، وہ اپنی سچی چاہت کے طلب گار کو ٹھکرانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

pklibrary.com

چھوٹے سے برآمدے میں گھر گھر چلتے پنکھے کی گرم ہوا سے بھی تلخ زندگی میں جب اے سی کا جھونکا محسوس ہوا تو وہ اسی کو اپنا مان بیٹھی تھی۔ اس میں برا کیا ہے کہ انسان کسی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لے۔ کیوں اچھی زندگی کے تعبیر پاتے خواب کو ٹھوکر مارے، آخر کیوں؟ وہ سچا تھا جب ہی تو رشتہ لے آیا تھا۔ عزت سے ہاتھ مانگ رہا تھا تو غلط کہاں تھا۔ وہ بھگوڑے باپ کی بیٹی تھی اور رشتے دار ضرورت مند کی چوکھٹ پار نہیں کیا کرتے۔ خوش حالی سے بھرے گھر مہکتے اور اشتہا انگیز باورچی خانوں میں زبردستی گھستے ہیں رشتہ دار۔ عرصہ ہوا، کسی نے بھی ان کی دہلیز پار نہ کی تھی۔

ایک جنید تھا، ماں کی مرحومہ بہن کا بیٹا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ ان کے کچے گھر میں بہت سارے گھنے امرودوں کے پیڑ تھے، جنید بے چارہ دوپہر کو کام سے لوٹ کر وہیں پڑا رہتا۔ ماں نے فیصلہ کیا تھا اسے جنید سے بیاہنے کا۔ کمزور سا فیصلہ بالکل اپنی طرح۔

☆☆☆

بہت بڑا کمرہ تھا جس میں بیٹھنے کے لیے ترتیب سے لگے صوفے، مصنوعی پھول، گملے اور بڑا گداز قالین جن کے پاس پیسہ ہو تو وہ خرچنا بھی خوب جانتے ہیں۔ ہر شے نکھری ستھری تھی۔ ایک دم سے شمع کو اپنا وجود بے قیمت سا لگا تھا اس کے سپید پیروں کے لیے کون سی جگہ مناسب ہوگی۔ کمرے کے وسط میں بچھا ایک اور چھوٹا سا مغرور قالین اسے اس کی حیثیت بتا رہا تھا۔

"آؤ شمع! اس طرح گھبراؤ نہیں۔ ہر شے تمہاری ہے جان واسع! اس جیسے ہزار بنگلے تم پر قربان کرسکتا ہوں میں۔"

اس کے والہانہ انداز پر ایک پل کو شمع کا غریب دل کسی کونے میں جا چھپا تھا، اس کے کہیں چلے جانے کی دھڑک ضرور سنائی دے رہی تھی۔ دل کہیں نہیں تھا۔

باہر گارڈ کے ساتھ گاڑی سے اترتے اتنے بڑے لان میں کھلے کھلے سرخ پھولوں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی، اس کی قسمت ایسی ہوگی، یہ پتا نہیں تھا۔ ایسے کئی بنگلوں کو اس نے صرف باہر سے ہی دیکھا تھا، اندر کے ایسے رعب سے وہ پہلی بار آشنا ہوئی تھی۔ وہ بشریٰ کے گھر کا بہانا کرکے گئی اور ڈرائیور کے ساتھ یہاں آگئی تھی۔

"ہاں منظور خان! تم جاؤ۔ اب جب جانا ہوگا، تمہیں بلا لیں گے۔" باادب ڈرائیور واپس چلا گیا تھا۔ ایک نرم گداز صوفے میں وہ کچھ دھنس سی گئی۔ بہت ساری نرمی کا احساس ہو رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی ہر شے کو غور سے دیکھ لو، تم نے یہیں رہنا ہے۔ یہ پورا بنگلہ تمہارا ہے جہاں کہیں تمہیں کوئی کمی دکھائی دے، تم اپنی مرضی سے تبدیلی کروا سکتی ہو۔"

وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ نجانے کتنی ہی لڑکیاں اس پھولوں بھرے گھر کو حسرت سے تکتی گزرتی ہوں گی۔ واسع چوہدری کا رعب و دبدبہ اس کے محبت بھرے انداز سے بھی جھلکتا تھا۔

"میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں، اتنی کہ تمہیں اپنی زندگی کا حصہ بنانے جا رہا ہوں۔ تمہیں کبھی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی یہاں پر، تم چاہو تو اپنی ماں کو بھی یہاں رکھ سکتی ہو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم صرف مجھ سے محبت کرتی رہو گی، تمام عمر..... ایک ایک لمحہ۔"

ایک بھاری شفاف ہاتھ وعدہ لینے کے لیے سامنے تھا، اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسے بہت گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی حالانکہ وہ اب اٹھ کر دوسرے صوفے پر جا چکا تھا۔

"میں اب جاؤں؟"

"ہاں ضرور، منظور خان! جاؤ انہیں چھوڑ کر آؤ اور سنو، آبادی شروع ہونے سے پہلے تھوڑا سا دور ہی اتار دینا، آگے گلی تک یہ خود جائیں گی۔" اسے شمع سے اس کی عزت سمیت محبت تھی، اپنے گھر کا دروازہ پار کرتے اس نے سوچا تھا۔

pklibrary.com

☆☆☆

''ماں! ایک ٹھنڈا پانی کا گلاس دے دیں۔'' وہ حلق میں اگتے کانٹوں اور پیاس کو محسوس کرتے بولی۔

''دس روپے کی کچی برف سے کتنا پانی ٹھنڈا ہوسکتا ہے، کولر میں بھی اب وہ بات کہاں رہی۔ دس سال ہوگئے۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔ ''لے ایسا ہی ہے بس ذرا سا ٹھنڈا۔''

''اب تھوڑا آرام کرلوں۔ ایک تو یہ بشریٰ بھی ناں بندے کو تھکا مارتی ہے۔''

''بہت تھک جائے گی شمع! تو بہت ٹوٹ جائے گی۔'' محبت کا کوئی تجربہ تو کبھی نہیں رہا تھا انہیں ایک فیصلہ وہ بھی کیے بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

دونوں ایک عالی شان حویلی کے پختہ گیٹ کے سامنے کھڑی تھیں۔ اردگرد لہلہاتی فصلیں، بڑے بڑے درخت، باغات، ڈیرہ۔ یہ واسع چوہدری کا ہی ڈیرا تھا، ساتھ حویلی۔ نوکروں کی فوج ادھر اور ادھر پھر رہی تھی۔

''ارے اماں! تم کہاں۔'' کوئی پھرتیلا نوکر بھاگ کر ان تک آیا تھا۔

''وہ چھوٹے صاحب کی گھر والی سے ملنا ہے۔''

''اچھا، یہاں رکو، میں پوچھ کے آتا ہوں۔'' وہ دوڑ کر اندر چلا گیا تھا۔ طویل چمکتی راہداری میں پتا نہیں وہ کس طرف مڑ گیا تھا۔

ٹھنڈے شربت کے دو گلاس پینے کے بعد ماں نے سامنے بیٹھی کم عمر کی عورت کی طرف دیکھا تھا۔

''یہ تمہاری لڑکی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی۔'' ماں نے بتایا۔

''تمہارا شوہر.....'' ماں کے منہ سے ابھی پہلا لفظ نکلا تھا۔

''کرتے ہیں ناں، ہمارے میں سب کرتے ہیں یہ، چھوریوں کے سارے شوقین ہیں۔ ناچنے والی ملی تو ڈیرے میں کئی کئی دن کا قیام کرواتے ہیں۔ خوب شغل میلہ رہتا ہے، دل لگانے کے سو بہانے اور جو ناچنے والی نہ ہو، نکاح کر کے دل بہلا لیتے ہیں اور میرا سرکار سائیں، اس کا عشق تو مہینہ بھی نہیں چلتا کبھی، پانچ بیٹے ہیں میرے، کوئی فکر نہیں ہے اس کی مجھے۔ پیار ہے مجھے اس سے۔'' وہ شمع کی طرف دیکھ رہی تھی، ایسی مردہ جذبات کی عورت اس نے پہلی بار دیکھی تھی نہ بھڑکے نہ بجھے، ٹھنڈی آگ کی طرح۔

''اس کا اعتبار مت کرنا ں، نرا تماشا ہے یہ۔ کہہ رہا تھا۔ ایک لڑکی ہاتھ لگی ہے، اس کے، بڑی سوہنی ہے شمع ہے ناں تو، ہاں وہی ہوگی، دو سو میں لیے سے بیاہ ہوا تھا میرا۔ یہ اناج شوہر ہے میرا اور ساتھی بھی۔ تو کس کے سہارے جیے گی۔'' اس سے زیادہ ماں اور شمع سے سنا نہیں گیا، دونوں اٹھ کر چل دی تھیں، وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

''یہ جو ڈرائیور ہے ناں، اسی سے پوچھا تھا میں نے۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بتایا تھا مجھے، میں جانتی تھی کہ تمہیں میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ اب سب دیکھ اور سن کر خود فیصلہ کرلو۔''

''اماں! وہ اس کا سامان۔''

''منظور ڈرائیور کو سب واپس کر دیا تھا۔ ہمارے لیے اللہ نے ایسے سکھ نہیں لکھے ناں تو آگے اس کی ص میں بہتے ہمارے جیسے ہی ہوں گے اور یقیناً ہم ماں بیٹی بھی۔'' شمع دھڑکتے دل سے اپنا سامان دو تھیلوں میں ڈال رہی تھی۔

وہ اور جنید نکاح کے بعد لاہور جا رہے تھے۔ رات کی اس تاریکی میں جنید کا ہاتھ تھامتے وہ اپنے خواب کو بھی کسی گندی نالی میں پھینک آئی تھی۔ چھک چھک چلتی گاڑی میں بیٹھی وہ اپنے فیصلے پر مکمل مطمئن تھی۔ اسے عیاشی کا سامان نہیں بننا تھا بلکہ اسے کسی ایسے چھوٹے سے گھر کی تلاش تھی جہاں شمع کی لو کی کسی کو دل سے ضرورت ہو۔

pklibrary.com

دوپہری کے گیت

pklibrary.com

رات نے اپنے پر سمیٹ لیے اور چولستان پر سورج دیوتا آہستہ آہستہ پنکھ پھیلانے لگا تھا۔ دھرتی پر پو پھٹتے ہی کچھ نکھرا سا سیھاؤ تھا۔ بس ایک بھاونا کے من مندر کی گھنٹی خاموش تھی۔

صبح سے پہلے چولستانی واسی نیند کا خمار بستر پر ہی چھوڑے اٹھ کھڑے ہوتے اور روزمرہ کے کام کاج شروع ہو جاتے۔

بھاونا کو جانے کیوں لگا، آج کا دن کوئی پیغام لے کر آئے گا۔ بھارو کی یاد کروٹ لے کر جاگی، جو سوتی ویسے بھی بہت کم تھی اور ابھی تو سورج ابھرا تھا اور اسے سارے کام کاج کے دوران اس سے کئی ان کہے شکوے کرنے تھے۔ خیالوں میں کئی باتیں تکیے سے لگی سو چکی تھیں جنہیں بیداری کی حالت میں سوچا جانا تھا۔

کئی وعدے اوڑھنی کے پلو سے لپٹے کسی گانٹھ کی صورت بندھے ہوئے تھے۔ اس کے دوپٹے کے چاروں کونوں پر گرہ لگی ہوئی تھی ہلکی سی اور گھر والوں نے اب اس سے پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ ایسی باتوں کے مطلب پوچھے نہیں جاتے۔

اس نے آکاش پر پھیلتے سورج کو آج ایک پھر پیغام دیا۔ یہ چہرہ راسو جی نے دیکھا تو دل بیٹھ گیا اس کا۔ اس نے دل میں عہد باندھا کہ اب اسے ڈھونڈ کر رہے گا۔

بڑی مائی (دادی) نے چلم دکھائی اور چولہے کے پاس بیٹھ کر پھونکیں مارنے لگی تھی۔ ڈیلاں ابھی بستر میں اپنے ننھے سپنوں کو لوری دینے میں مشغول تھی جنہیں عنقریب پروان چڑھانے کا وقت تھا۔

مکمل ناول

pklibrary.com

بھاونا چنری کے پلو ادھر ادھر گھماتی مال مویشیوں کے باڑے میں چارہ چوکی دیکھنے گھس گئی، اور راسو جی نے چائے کا پیالہ بیوی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ وہ ایک نیا موضوع ڈیلاں کے رشتے کی بات لے کر بیٹھ گئی۔ اسے یہ غم تھا یا پھر خوشی کہ ڈیلاں کو سولہواں چڑھ گیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ارادے کو ظاہر کیا جائے۔

راسو کا جیسے کسی نے کیچہ جکڑ لیا ہو۔ اسے یہ جلد بازی لگ رہی تھی لیکن جب دوسری عورت بڑی مائی نے بہو کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ بس سنتے کو رہ گیا اور نظر جو پہلے بہنوں جیسی بھر جائی بھاونا کے اداس چہرے سے ہٹی ہی تھی کہ سب سے آخری اولاد ڈیلاں کے معصوم سانولے چہرے پر رک گئی۔

جیسے پیو بیٹی کے سپنوں کی سوچ پڑھ رہا تھا۔ در وہ جولاڈ سے بابلیو کہتی تو جیسے لگتا کہ دھرتی پر سکھ کی ساکھ پکی ہوگئی ہے، چولستان اس کے بابلیو کہنے سے چہک رہا ہے، عمرکوٹ کے اطراف کھل اٹھے ہیں۔ ایک بابلیو کہنے سے کیا وایومنڈل جڑ جاتا تھا۔ ایک بابلیا (باپ کو مخاطب کر کے گانے والا گیت) سنتے وقت سینہ فخر و خوشی سے پھول جاتا جب وہ بانہہ پکڑ کر بولتی، فرمائشیں کرتی اور کھلکھلاتی تو بابلیے کو لگتا زندگی تو بس یہی ہے۔ باقی چارہ کاتنا، کھیت کھلیان، ڈھور ڈنگر، فقط گزر سفر کا بہانہ ہیں۔ اصل تو کائنات یہ ہے۔

جب بولتی ہے تو تھک (تھکن) اتر جاتا ہے۔ بولتی ہے تو دل جی اٹھتا ہے۔ ہنستی ہے تو موسم کی گرمی سے اوب گیا جی سنبھلتا ہے۔ سرسوں مہکتی ہے۔ چاندی چٹکتی ہے۔ کارونجھر پہاڑ مسکراتا ہے۔

ایک لاڈ سے بابلیا کہ کر لاڈ کرنے سے نظر ہر منظر کو اپنی من مرضی سے دیکھتی ہے اور ریگستان میں جیسے روح پڑ جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی خوشی کے کنارے سے بڑی خوشی کا سمندر بے موسم، بن بارش امڈتا ہے اور سارے پر پھیل جاتا ہے۔ دکھ چھوٹے پڑنے لگتے ہیں اور بابلیا کا قد کاٹھ اونچا ہو جاتا ہے۔

اور اس وقت بابلیا کو فی الحال تو اس خبر نے چپ کی مہر لگا دی تھی جیسے

تو ڈیلاں بھی بیاہ کر جائے گی تو اس آس کو بھی رخصت کرنا ہوگا۔

دل بیٹھا لیکن وقت کھڑا تھا۔ ایک آسرے کا دیا بجھا تو دوسرا جلانا تھا۔ ماں کے لہجے میں آسوں بھرے ارمان تھے۔ دادی کا لہجہ تھوڑا ہاتھا، تھوڑا اٹھ افرض کو فرض سمجھنے والا تھا۔ جیسے صبح کا اشنان تھا۔ جیسے اس کے آبائے (آبائی گھر) میں صبح سویرے کا پوجا پاٹ تھا۔ ویسے اولین فرض تھا دھی کو وقت پر گھر کی کرنا اور ماں کی نظر میں یہ ہولی جیسا رنگ دار اور دیوالی جیسا روشن تھا۔

اور ایک تھا گھر کا راسو جی، بڑا بھائی، بیٹا، شوہر مگر ڈیلاں کے لیے وہ بابلیا تھا جسے ابھی تو میکے میں مٹھائی کھا کر انگلیاں چاٹتی ڈیلاں کی مستیاں، بے ہودگیاں بچپنا دکھائی دے رہا تھا اور وہ یہی سوچے جا رہا تھا کہ وہ کیا سوچے گی۔

''اسے کیا سوچنا؟ وہ دھی ذات ہے۔'' بیوی نے جیسے شوہر کی سوچ پڑھ لی اور چارپائی کی پائتی بیٹھ کر راسو جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی سمجھ داری سے بات سمجھانا شروع کی تھی، اور پیچھے بھاونا بھی سر اثبات میں ہلاتی اپنی رائے شامل کر کے چائے کا پیالہ پکڑے چوکی پر جا بیٹھی تھی۔

چہرے پر ایک سایہ آکر لہرا جاتا تو مرک (مسکراہٹ) ماند پڑ جاتی مگر اگلے پل ہی امید کا دیا ٹمٹماتا کہ جیسے برسات تر ساتر سا کر برستی ہے۔ جیسے ساون بڑی سوچ بچار کے بعد آتا ہے۔ جیسے ڈھور ڈنگر اپنی من مانی کرتے ہیں۔ جیسے سرسوں بھی پیلاہٹ سے پہلے کچھ مرجھاتی ہے۔

ویسے دیر سے سہی پر اس کا بھارو سورج مکھی کی طرح سنہری بن کر لوٹے گا۔ ساری ناراضی بھول کر گھر آئے گا، اسے منائے گا، گھر والوں کے ساتھ نباہ کرے گا اور اس کا سب ڈیلاں کا ویاہ بھی بن سکتا ہے کہ جیجی کی محبت اور شگون کی لاچاری اسے بالآخر

pklibrary.com

کھینچ ہی لائے گی، اور اب جو آیا تو بھلے ساون نہ بھی آئے مگر وہ محبوب کے بازو کو کہیں اسی پلو کی گانٹھ سے باندھ لے گی۔

یہی امید جاگی کہ نوراتن کے دیہاڑے (کچھ ہندو قبیلوں میں نوروز رکھنے کی روایت) کی عید تک کوئی خوش خبری ضرور ہی ملے گی۔ اگر جو راسو جی نے بات باندھی، اور اسے منانے کی خاطر نکل پڑے تو۔ آسرا بڑی خبر لانا کا تھا اور بڑی خبر تو بس اس کے لوٹ آنے کی ہو سکتی تھی۔

شہر کے مضافات میں گاڑی دوڑ رہی تھی جس کا رخ ریلوے ٹریک کی طرف تھا۔

☆☆☆

صبح سویرے کا سکھ چین عجیب سی مہک سے رچا تھا اور گرمی کے موسم میں بھی کچھ نمی کا تاثر موجود تھا۔ وہ گھر سے نکلی۔ روشنی دن کے سورج سے چمکتی ہوئی پھیلنے لگی اور اندر اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ اس کا فون بجنے لگا۔ ایک خیال سا آیا کہ وہ ہوگا، شاید اس نے یاد کیا ہو لیکن نہیں وہ اس کے سامنے نکلی تھی۔ عبید نہیں ہو سکتا۔ نمبر انجان تھا اور غیر ملکی تھا۔

''کیا نبیل؟'' اس نے خود سے پوچھا۔ ''کیا اسے الہام ہو گیا اس سب کا؟ نہیں..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

لیکن بچپن میں ایسا اکثر ہوتا تھا، اسے پتا لگ جاتا تھا، جب کچھ اچھا ہوتا ہے اسے پروا نہیں ہوتی اور جب برا ہوتا ہے تو اسے کیوں پتا لگ جاتا ہے۔ یہ سوال کیا تو فرحانہ سے تھا پر اس نے سن لیا۔ وہ ہر اس طرح کی صورت حال میں آجاتا تھا۔ سانس اٹک گئی تھی اس وقت اس کی۔

''اس لیے کہ جب تمہارے ساتھ کچھ غلط ہوتا ہے تو مجھے پتا لگ جاتا ہے اور دوست ہوتے ہی دکھ بانٹنے کے لیے ہیں۔ میں ہر مشکل میں پہنچ جایا کروں گا۔ بہت پہلے کی بات تھی یہ اور اسے بہت سے موقعوں پر یاد آجاتی تھی اور وہ سر جھٹکتی۔ اب بھی جھٹکا تھا۔

اس کا خیال میری جان کیوں نہیں چھوڑتا آخر۔ یہ جان کا وبال چھوٹتا کیوں نہیں ہے۔ ختم ہو جائیں، تعلقات کی طرح پرانی یادیں بھی تو اچھا ہے۔ رنگ دوبارہ بجی تھی تو اسے اٹھانا پڑا۔

''ہیلو..... کون؟'' اسے آواز پہچاننے میں کچھ لمحے لگے۔ پھر پہچان کر بولی۔

''وہ ریحا..... کیسی ہو؟''

''میں تو ٹھیک ہوں مگر مجھے بتاؤ، اب تم میری آواز بھی بھول گئیں۔ عدم موجودگی کہ چھ مہینے بات کیا نہیں ہوئی..... نہیں، بلکہ سال ہو گیا۔''

''آئی ایم سوری میں تمہاری شادی پر بھی نہ آسکی۔ اصل میں تمہیں پتا تو چل گیا ہوگا کہ شادی کے بعد کتنی مصروفیات ہو جاتی ہیں۔ بندہ اپنا ہی نہیں رہتا۔ اب تم سے کیا چھپانا، تھوڑا تو اختر کے مزاج کا بھی تمہیں پتا تھا۔ کیسے اسے پتی ورتا بیویاں بھاتی ہیں۔ خیر..... تم بتاؤ ناں۔ فرحانہ نے تمہاری شادی کی تصویریں بھیجی تھیں۔ بہت اچھے لگ رہے تھے تم دونوں۔''

اس نے ایک لمحے کا وقفہ دیا اسے بولنے کے لیے اور اس نے وہ بھی ضائع کر دیا لمبی سانس لے کر چھوڑنے میں اور وہ بغیر انتظار کے شروع ہو جاتی تھی۔

''ویسے بہت بچ رہا تھا تم پر لہنگا۔ کہاں سے بنوایا؟'' اب تو اسے رکنا ہی تھا۔

''پتا نہیں، فرحانہ سے پوچھنا۔ اسی نے بنوایا تھا۔''

''ویسے سب کتنا اچھا تھا ناں، لہنگا بھی، تمہارا میک اپ بھی۔ شادی کی تقریب کے کھانے کی بھی بہت تعریف سنی تھی۔ کاش میں آپاتی۔ خیر..... لیکن دولہا بہت اچھا تھا۔ بہت خوب صورت، ڈیشنگ اور تمہارے ساتھ تو بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ ویسے کتنی خوش نصیب ہو ناں تم۔ اتنا خوب صورت جوڑا۔ اتنا خوب صورت ساتھ۔ سنا تھا لڑکا پیسے والا بھی ہے۔ کہاں سے ملے انکل کو یہ لوگ۔ کدھر چھپا رکھا تھا

انہوں نے۔ دیکھو تمہارے لیے ہی کیا یہ سب انہوں نے۔ فرحانہ سے زیادہ وہ تم سے پیار کرتے ہیں۔ اب تو مان گئی ہوگی تم۔"

"تم کیسی ہو؟" اس نے بہت تیزی سے بات کاٹی تھی کیونکہ اب یہ سب اتنے تواتر کے ساتھ سننا اس کے لیے مشکل ہوا جا رہا تھا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہی ہوں لیکن تم جتنی خوش نصیب کہاں کہ اتنا حسین آدمی ملا۔ مزاج کا کیسا ہے؟ تیز، تیکھا تو نہیں بولتا ناں؟"

"نہیں۔ بات سنو ربیعہ! سنا ہے تم ایکسپیکٹ کر رہی ہو، مبارک ہو۔"

"ہاں خیر مبارک۔ تم بتاؤ ناں اپنے بارے میں۔ کوئی ہے خوش خبری؟"

"نہیں۔ اختر بھائی ٹھیک ہیں؟"

"ہاں وہ ٹھیک ہیں۔ انہیں کیا ہوا۔ انہیں چھوڑو، ارے تم بتاؤ ناں اس کی باتیں۔ اتنی مشکل سے تو بات ہوئی ہے۔ سال بھر بعد۔ یہ کوئی بات ہے بھلا، نمبر ہی مس ہو گیا تھا مجھ سے تمہارا۔ فرحانہ تو پھر بھی میل چیک کرتی ہے، تم تو جیسے غائب ہی تھیں۔ میل ملی بھی تو جواب نہیں دیا۔ خیر میری بھی غلطی ہے میں نے کوئی میل کی نہیں ہوگی۔ فرحانہ سے بھی پچھلے ماہ رابطہ ہوا۔ اس کی مہربانی ہے، سب کا حال احوال دے دیتی ہے۔ خیر..... بتاؤ ناں شادی کیسی جا رہی ہے؟"

"نہیں رہی۔"

"ہیں.....؟ کیا.....؟ کیا کہا تم نے..... میں نے پوچھا، شادی کیسی جا رہی ہے تمہاری؟"

"میں نے کہا، نہیں رہی۔ بعد میں بات کریں گے۔"

اگلی طرف وہ صدمے کے لمحے میں ہوگی۔ جب اس نے فون کا سوئچ آف کر دیا، اور اپنی نگاہوں کو راستے پر اور دماغ کو اپنے حال پر ہی چھوڑ دیا، جو وہ سوچتا تھا جو دل سوچنا نہیں چاہتا تھا، بھگتنا تو تھا ہی، وہ تو اس نے سنا تھا کہ قسمت میں لکھا تھا، اور ایک شکوہ اسے خود سے تھا۔ ایک مقدر سے، وہی صدیوں کا رٹا رٹایا جملہ کہ ایسا آخر میرے ہی ساتھ کیوں؟

اور اسے یاد آیا ابا میاں کا جملہ کہ جو تمہارے ساتھ لکھا ہے وہ کسی اور کے ساتھ کیوں؟

☆☆☆

[illegible] چارپائی کے گھنے [illegible] دھوپ اتری تھی اور ایسے برس جیسے برسات برستی ہے۔ ہر ایک کونے کھدرے تک رچ گئی تھی۔

برساتوں میں جھگیوں کی چھتیں بھیگ جاتیں اور بوندیں ٹپک ٹپک کر چھتوں کے بانس بھرے کناروں سے پھسل کر آدھا برآمدہ بھگو دیتیں، اسی طرح دھوپ کے سائے آدھے تک آتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ برسات کبھی کبھار آتی تھی، اور دھوپ روز آتی تھی۔

برسات دعاؤں سے برستی تھی، اور دھوپ کا دعا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

برسات ریگستان کے مکینوں کے لیے نعمت ہوتی تھی اور دھوپ موسم کی حدت لاتی تھی۔ خصوصاً گرمیوں کی دوپہری کا تو کچھ یہی حال تھا کہ صبح جیسے دوپہری ہی لگتی۔ پہری (تیسرا پہر) بھی دوپہری ہی معلوم ہوتی جس میں دھوپ کا رنج ذرا مدھم پڑتا مگر رنگ وہی ہوتا۔ دھوپ اپنا رنگ بدلنے کی کبھی حامی نہیں رہی تھی۔

برآمدے کے چھتر تلے بیٹھی وہی سولہ سالہ کونپلوں کے ذہن میں آیا سہی کہ دھوپ کب جائی (پیدا کہوئی) جمی وہ تو سولہ کی ہوگئی اور بابلیا (گیت جو باپ کو مخاطب کر کے گایا جائے) گانے کے دن بھی آ گئے تھے۔

لیکن سوال کرنے کا گر بہت کم آتا تھا کہ اسے بھی لگتا تھا وہ اکثر باتیں ڈھنگ سے اس لیے نہیں کہہ پاتی کہ بابے نے مکتب نہیں بھیجا۔

وہ بس سامنے بٹھا کر اس کی بلائیں لیتا۔ گڈے گڑیاں لا دیتا، کھیلنے کے لیے شہر جاتا تو نافیوں

pklibrary.com

اور ساریوں کے انبار لادیتا لیکن اب ان سب چیزوں سمیت میٹھے بسکٹ بھی قریبی چھتری پر مل جاتے تھے۔ آگے بابو شاہ کا مزار تھا اور لوگ کثیر تعداد میں حاضری لگانے آتے تھے۔ ہندو ہوں یا مسلم۔ کسی بھی ذات کے علاقے سے گزرتے ہوئے بابو شاہ کے مزار کے منکے کا پانی پینا۔ ندی کے پانی میں نہانا بھی ہوا تو پہلو بہا کر گھوٹ کی چسکی لے کر مزار پر سلام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایک پیر پتھورو، جو ہندو ذات کا پیر مشہور تھا۔ علاقے کے مسلمان بھی پیر پتھورو کا بڑے احترام سے ذکر کرتے اور سلامی لیتے۔ بڑا عرصہ بحث رہی کہ ہر مذہب اور ذات کا گروہ اس پیر کو اپنے مذہب سے منسلک کرتا تھا۔ پھر یہ مسئلہ گاؤں کے اندر بیٹھ کر سمنگ چارن (علاقے کا وڈیرہ) نے بیٹھ کر سب کو بلا کر کہا کہ ''ہندو سمجھیں کہ ہمارا ہے۔ مسلم سمجھیں ہمارا، پیر پتھورو سب کا ہے۔''

اب علاقے کے منشی، وڈیرے، قبائلی، سید سب ہی پیر پتھورو کی اسی طرح عزت کرتے اسے اپنا سمجھتے جیسے بابو شاہ کا مقام ان کے دلوں میں تھا۔ سمنگ چارن ذات کا چارن نام کا سمنگ جس نے کئی بڑے بڑے مسائل بیٹھے بیٹھائے کچہری کے ذریعے حل کردیے تھے۔ علاقے کے سب جاننے والے ان سے مشورہ لینے آتے تھے۔ ڈیلاں نے تو کئی بار سوچا بھی کہ دادے سمنگ نے بھی کہیں سے سکھیا نہیں لی پر سارے ان کی مانتے تھے تو آخر امڑی (ماں) اس کی بات کیوں نہیں سنتی۔

اسی لیے تو اس نے بابلیا کو کہا۔ ریت رسم کے حساب سے سولہواں دکھتے ہی بات ٹھہرانا ضروری ہوگیا اور کچھ اس کی ماں کے لفظوں کا اثر تھا جو شوہر کو رضامند کرگیا۔ دھی ویسے ہی دینی ہوتی ہے تو کیا ہی بھلا ہو کہ وقت پر گھر کی ہوجائے۔ بھاونا اور بھارو کی شادی میں کچھ سال پڑ گئے تو حالات پیٹھ پیچھے چلے گئے۔ وہ بھاونا کے ہاں اولاد کے جلدی نہ ہونے کی یہی وجہ گردانتی تھی۔

☆☆☆

راسو جی نے ہاں کی اور بات پکی کیا کرنی انہوں نے تو مہینے بھر میں ویاہ کی بھی تاریخ رکھ لی اور اب ڈیلاں جسے فقط بات ٹھہر جانے کا کچھ اندیشہ تھا، اچانک ہی ویاہ کی سن کر وہ اداس ہو بیٹھی تھی۔ ماں اسے اپنی مثال دیتی کہ چودھویں میں بیاہ کر آئی تھی۔ ساروں (تمام بہن بھائیوں) سے چھوٹی ڈیلاں تھی۔ سب سے لاڈلی، سب سے نخریلی، لاڈ اٹھوانے والی، دادی سے، ماں سے، بابے سے، ہر کسی کے ساتھ چپکی رہتی۔ ماں خوف کھاتی کہ اسے حیا نہیں ہے۔ دادی چپت لگا دیتی اور بابلیا کی مسکراہٹ گھنی مونچھوں تلے بھی گہری ابھرتی اور آنکھوں میں چمک آجاتی، وہ بھی جانتی تھی کہ ساروں میں وہی ایک بابلے کو زیادہ اچھی لگتی ہے۔ اسی سے چاؤ کر کے بابلیا خوش ہوتا ہے۔

مگر اب اتنی جلدی اسے اداس کر رہی تھی کہ ابھی تو بابلیے سے اس نے لاڈ اٹھوانے کی سوچ رکھی تھی۔ ابھی تو ماسی سہری کے پاس ننگر پارکر گھومنے جانا تھا اور چاچے بھارو کا وعدہ تھا کہ اسے شہر ضرور دکھائے گا۔ بڑا شہر۔ اور اب فوراً سے شادی کی تیاریاں آپڑی تھیں اور وہ شکوے سے بابلیا گا رہی تھی۔

بابلیا خاص اسی موقع کا گیت تھا جس میں باپ کے ساتھ شکوہ شکایتوں کے بول تھے۔ بابلیا میں آہ زاری تھی۔ احتجاج تھا اور راسو جی بابلیے کو لگا جیسے جگر چھلنی نہ ہوجائے۔ گیت کے بول سارے میں گونج رہے تھے۔ پہلی بار اس کی آواز اس طرح گونجی تھی۔ تھوڑی بے ترتیب، کہیں سر اٹھتا تو کہیں گر پڑ جاتا۔ کہیں اٹھ کر گرلاتا۔ بہرحال اظہار ضرور ہو رہا تھا۔

ننڈھی تھکی ناپرنائی بابلیا
میں کہڑو کریو تھانرو قصور
اتر ادن لاڈ کوڈ کریا
ہمیں کائیں کرو بابلیا دور
(مجھے چھوٹی عمر میں بیاہنے کی کریں، میرا کیا قصور

ابھی تو میرے نخرے بھی کم اٹھائے ہیں، ابھی سے دوری کس لیے)

ایک وہ تھی اور دوسری طرف یا ٹھے انداز میں دھیما سر بکھیرتی بھاونا کی شیریں آواز تھی۔

مدھر، مدھم، کوئل جیسی، کوک، جو بھی ڈھولا مارو گاتی تو کبھی، راسیو، کبھی مور یو تو کبھی کیسریا بالما گاتی کبھی۔ کبھی راگ گاتی تو کبھی راگ مالا۔

اس کی آواز کی لے ایلاں کے بے سرے انداز کی آواز میں غائب ہی ہو جاتی اگر ماں اٹھ کر آنکھیں نہ دکھاتی اور اسے مجبوراً چپ ہونا نہ پڑتا۔

ماں نے ابھی سوٹا اٹھایا تھا کہ ڈ ماں ں ں ں ں کرتی چپ ہوگئی اور منہ بسورتی دادی کے پاس جا بیٹھی تھی اور بھاونا جو کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے سر نے سسکی لی تو بھرجائی سے سوٹا چھوٹ گیا اور وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کیسے کہتی کہ وہ جلدی لوٹ آئے گا۔ کئی بار کہہ چکی تھی اور وہ نہیں لوٹا تھا۔ اس بار اس نے سوچا بس سیدھے سیدھے راسو جی کی منت کرے گی کہ اسے شہر سے ڈھونڈ کر بھاونا کے قدموں میں لا پٹخے۔

بھاونا یعنی امنگوں کا دیار، خوشی اور خوابوں کی نگری، جس کا مفہوم خیال اس وقت دوپہر کے گرم تھپیڑوں کے دوش پر رنجیدہ سا ہو گیا تھا۔ دوپہر بڑی سست روی سے لہری میں ڈھلتی تھی۔ ایسے جیسے کبھی دن ڈھلے گا نہیں۔ اگر ڈھل گیا تو شام سے سیدھے سیدھے رات اترنی تھی۔ ادھر شام ہوئی نہیں کہ کچے مکانوں کی چھتوں سے دھندلکا جھلکنے لگتا۔ ساعتیں رات میں گھل مل کر دھوپ کی تمازت کی گرمی اور رات کی ٹھنڈائی میں گھل مل جاتیں۔

ساعتیں کچھ مہربان ہوتیں اور وقت کا ٹنا ذرا سا آسان ہوتا لیکن یہ تو رات کو پتا تھا کہ بھاونا جاگتی رہتی ہے اور گھر والے بھی جانتے تھے کہ اگر جاگتی ہے تو کیوں جاگتی ہے۔ صبح اس کے چہرے پر وہی تھکن بولتی لیکن وہ بھی پیٹھ پیچھے چھوڑ کر نکل لیتی۔ بکریاں ہانکنے، چارہ کاٹنے، بھینس دوہنے، ہنڈیا چڑھانے، چولہا جلانے، انگیٹھی میں کوئلے کا سا دل ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے جلتا، بجھتا، پھر جل جاتا اور جب بجھتا تو لگتا کبھی نہ جل پائے گا لیکن جب جلتا تو پتا لگتا کہ اب جلا ہے تو کبھی نہیں بجھے گا۔

☆☆☆

محبت کالی ہے۔

یہ کب اس کے سامنے آیا تھا، یہ کبھی سویرا نہیں دیکھا۔ اس نے کبھی سفیدی نہیں دیکھی۔ یہ سیاہی کا دوسرا نام ہے۔ گوشت ہے۔ آخری حرف پر وہ رو پڑی۔ آنکھیں بھینچ کر کھولیں تو قطرے ٹپک گئے۔ ڈرائیور اسے پلیٹ فارم پر چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ سامان کے پاس ادھر اپنے لیے جگہ دیکھنے لگی تھی۔ بظاہر منظر میں تھی اور ذہن اس کا مسلسل گھوم رہا تھا۔ حال سے ماضی، ماضی سے حال تک، مستقبل کی اب کسے فکر کہ حالات تاریکی میں ڈوبے دکھائی دینے لگے تھے۔ اطراف سے نظر چراتے ہوئے اس نے پہلے سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر آنکھوں کو صاف کر کے نظر جھکالی۔

محبت کالی ہے۔ اس کے اندر ایک یہی جملہ گونج رہا تھا۔

اور فرحانہ کے الفاظ یاد آئے۔

''محبت سرخ ہے۔ تمہیں پتا ہے یہ کتنی اجلی ہے۔ کتنی پیاری ہے۔ یہ سوگ نہیں کہ کالی ہو۔ یہ بے رنگ نہیں کہ سفید ہو۔ اس کا ایک رنگ ہے۔

یہ سرخ ہے۔ یہ دلوں سے رنگ چراتی ہے۔ جیسے تتلیاں پھولوں سے رس چوستی ہیں۔''

وہ تب مسحور ہو جاتی۔ اسے لگتا فرحانہ تو صرف بولتی ہے اور اثر اس پر ہو جاتا ہے۔ وہ آزاد ہے اثر سے، وہ محسوس کر کے اس پر پھینک دیتی ہے۔ تجربہ اسے کرنا پڑتا ہے۔ محسوس وہ کرتی ہے۔ فرحانہ تو لمحے کے لیے مسکراتی ہے اور پھر سے اپنے کاموں میں جت جاتی ہے۔ جتنی گھر داری کی ماہر۔ اتنی ہی تعلیمی سرگرمیوں میں آگے آگے۔ جتنی حساس اتنی ہی ہوشیار۔ چاق و چوبند۔ جیسے وہ ہمیشہ ریل کی طرح

pklibrary.com

جھڑ جھڑ کرتی جاتی۔ مشکل گزار راستوں سے گزرنے کے بعد بھی ویسی ہی۔ یہ ابا جی کا تجزیہ تھا فرحانہ کے لیے اور یہ درست ہی تھا۔

اس نے سوچا وہ سب سے پہلے جا کر محبت کے حوالے سے اس کی تمام خوش گمانیوں کو دور کرے گی۔ اسے بتائے گی کہ ”مرد سارے بے حس ہیں۔ ان سے محبت نہیں کرنی چاہیے۔ یہ دنیا کی سخت ترین سزا ہے ایک عورت کے لیے کہ وہ ایک مرد سے محبت کرے اور وہ بھی ایک سفاک مرد سے اور میں نے یہ غلطی دوبارہ کر کے دیکھ لی۔ میں دو بار پچھتائی۔“

اس نے پھر سر جھٹکا۔ آنسو روکے۔ ہچکی لی اور سامان گھسیٹتی ہوئی ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی۔ جس کے حبس زدہ ماحول میں چلتے ہوئے چھت کے پنکھے کی جھر جھر جیسے کانوں میں گھسی جا رہی تھی اور اس پر کچھ ہی لمحوں میں سخت بیزار ہو بیٹھی تھی۔ دو مسافر عورتیں ریل کے انتظار میں اسی کمرے میں بیٹھی ایسے گپیں لگا رہی تھیں، جیسے کہ صدیوں کی آشنائی ہو۔

وہ اٹھ کر دروازے سے باہر ماحول جھانکنے لگی، دھوپ اتنی ہی تیز ہے۔ جتنی ان گرم دوپہروں میں ہوا کرتی تھی۔ ائیر کنڈیشن ماحول سے نکلتے ہوئے ایسے ماحول میں آ کر پتا چلتا تھا کہ سفر اگر طویل ہو تو مسافر زیادہ جھیلتا ہے۔ اس نے لمبی سانس خارج کی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ سب انتظار کرتے ہوں گے۔ اس نے ایک آڈیو نوٹ چھوڑ دیا آنے کا۔ اور تھوڑی دیر بعد اس کا جواب آیا۔

”اب تم عید سے اتنا پہلے آ رہی ہو تو اچھا ہے۔ ابا جی بہت خوش ہوں گے کیونکہ کل جب میں گیت مالا کے سلسلے میں پرانے گیتوں پر کام کر رہی تھی تب وہ نیند سے اٹھ کر آئے اور تمہارا پوچھنے لگے۔ کہنے لگے فقیہہ کا کوئی میسج، کوئی فون آیا؟

اب لو فون تو ان کے پاس بھی ہے سیدھا تمہیں کر دیتے۔ خیر..... اب یوں ہے کہ تم پہنچو گی تو انہیں یقین آ جائے گا لیکن میں اس وقت ایک الگ مخمصے میں پھنسی ہوئی ہوں۔ ایک تو گیت ریکارڈ کرنے کے لیے مجھے استاد صاحب وقت نہیں دے رہے۔ اوپر سے اس گھر میں ہمیشہ کام والوں اور والیوں کے مسائل رہے ہیں۔ ایک لڑکی کو نکالا نبیل کی وجہ سے۔ تمہیں پتا ہوگا کہ نبیل کی وجہ سے کیوں۔ خیر چھوڑو جانے دو۔ آؤ گی تو پتا لگ جائے گا۔ ہاں تو میں بتا رہی ہوں، اب جو لڑکا آیا ہے سر جھاڑ منہ پہاڑ اس کا میرے کمرے میں گھس آنا مجھے عجیب لگتا ہے۔ دندناتا پھرتا ہے۔ کل خاص طور پر میں نے اسے سمجھایا کہ اگر کوئی تمہاری طرف دیکھ کر مسکرائے تو مسکراؤ اور اگر کہے کہ ہنسو تو پھر ہنسو۔ یہ بے وجہ کا مسکرانا اور ہنسنا یہاں کسی سے برداشت نہیں ہوگا۔

اور آج ابا جی نے میری اتنی سی بات پر اسے وارننگ دے دی کہ ٹھیک سے کام کرنا ہے تو کرو ورنہ میں ہفتے بھر میں کسی اور کا بندوبست کر لوں گا۔ لو بھلا اب یہ اسے دھمکی نہیں۔ دراصل مجھے تھی کہ اب اگر تمہیں کوئی شکایت ہوگی تو میں اسے نکال دوں گا۔

یہی وجہ ہے کہ اس لڑکے سے زیادہ فکر مند میں ہوں۔ آج دو وقت کی چائے خود بنائی ہے اپنی خیر..... اب آ کر خود دیکھ لینا جو بھی ہے بلکہ اچھا ہے تم آ کر کچھ ابا جی کو سمجھاؤ تو وہ سمجھیں۔ تم کب تک چلی ہو؟ تاکہ تمہارے پہنچنے کی ٹائمنگ نوٹ کر لوں؟“

اسے آخر میں یہ پوچھنے کا خیال آیا تھا، وہ ہنستے ہوئے مسکراہٹ روک نہ سکی۔

یہ فرحانہ کو کب اتنا یکمشت بولنے کا موقع ملا۔ خیر آڈیو میں اب وہی بولے گی ناں۔

وہ سر جھٹک کر اسے ایک چھوٹا سا ٹیکسٹ کرنے کے بعد سامان وہیں چھوڑ کر ریل کا پوچھنے اٹھی اور دروازے سے ہی دیکھنے لگی تھی کہ گلی سامنے آتا دکھائی دیا۔ اسے پتا لگا کہ ٹرین بس پندرہ منٹ مزید لیٹ ہو گئی ہے۔ ابھی پہنچتی ہی ہوگی۔ وہ کچھ تسلی سے اندر آ کر دوبارہ بیٹھ گئی تھی۔ ساتھ والی عورت اسے مخاطب کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ

pklibrary.com

ایک مصنوعی مسکراہٹ بھی دیتی تو پھنس جاتی۔ ادھر اگر اسے احساس ہوا فرحانہ ہوتی تو لمبی گپوں کے دوران آدھا انٹرویو تو اس کمرے میں بیٹھے ہر فرد کا وہ کر چکی ہوتی اور واپسی پر سفر کے دوران اپنی منی نوٹ بک پر آڑی ترچھی لکیروں کے درمیان لوگوں کی عمریں، انداز تاثرات نوٹ کرتی جاتی۔

اسے فرحانہ کا یہ مشغلہ دنیا کا فارغ ترین مشغلہ لگتا تھا لیکن سب سے بڑی بات کہ فرحانہ خوش رہتی تھی اپنے مشاغل میں اور یہ کتنی بڑی بات تھی کہ کوئی اپنے کام میں خوش ہو، مطمئن ہو، اسے زندگی میں کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ کمی ہو بھی تو وہ جھٹلا دے۔ یہی تو اس کی خصوصیت تھی جس سے وہ ہمیشہ متاثر تو رہی تھی لیکن خود میں پیدا نہ کر سکی تھی۔

اسے ٹرین کے آنے کا پتا لگا۔ اور چھک چھک کرتی گاڑی کے شور نے سارے ماحول کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ گاڑی آنے سے پہلے اعلان کرتی تھی۔ وہ اپنا سامان لیے بوگی میں آ بیٹھی۔ یہ سفر نو گھنٹے کا، تھکا دینے والا ہوگا۔ اسے بیٹھتے ہی احساس ہوا کہ وہ پہلے ہی تھکی ہوئی تھی اور دوسری طرف سے ایک مروت کا میسج تک نہ تھا کہ پہنچ کر بتانا یا خیریت بتانا۔

ویسے بھی صرف فارمیلیٹی کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ اپنی ہی سوچ پر نفرین بھیج گئی۔ اکثر خوش فہمیاں فریب ہوتی ہیں، اور وہ شخص..... اور اس سے وابستہ خوش فہمی بھی بس ایک فریب ہی تھا۔ میرے ساتھ تو دو بار ایسا ہی ہوا۔ کتنی آسانی سے عبید نے اسے کہہ دیا الگ ہونے کا۔ کتنی آسانی سے کہ وہ اس گھر سے نکلی تو گھر میں کوئی بھونچال نہیں آیا۔ گھر کی دیواریں اسے دیکھتی رہیں اور وہ ہر اس چیز کو دیکھتی رہی جس کے ساتھ یہ تین سال بتائے تھے۔ ہر چیز اسے لگا اس کی عادی ہو گئی ہے اور اب ایک شخص کے انجان بننے سے ہر ایک چیز جیسے انجان لگ رہی تھی اور وہ اسی انجان پنے سے اکھڑ لی تھی۔

گھر کا ماحول ایسا کہاں دیکھا تھا کہ عادت ہوتی۔ وہاں صرف ایک ٹیبل ہی تو ایسا تھا۔ باقی سب تو ایک سے تھے۔

ایک انوکھا لگنے والا دغا دینا جانتا تھا اور وہ بھی بڑی مکاری کے ساتھ۔ اسے اب بھی نبیل کی اب سے پہلے آخری ملاقات یاد تھی۔ ماضی قریب کی فقط چھ سات سال ہی تو ہوئے تھے اور اسے اس کا کہا گیا حرف حرف یاد تھا۔ وہ کیسے جو چاہتا کر لیتا جو کہتا ہو جاتا اور بات کرتا تو اگلا بندہ فقط سنتا رہ جاتا۔ خصوصاً اس کے ساتھ تو یہی ہوتا اس کا فنکارانہ انداز اپنا مدعا پیش کرنا کہ جیت ہی جاتا۔ جانے کا فیصلہ کیا اور اس پر قائم رہا، اسے بس اپنے طریقے سے اطلاع دینے آیا تھا اور قائل کر کے گیا۔

''دیکھو فقیہہ! میں تم سے کوئی جھوٹ بولنے نہیں آیا۔ نہ کوئی وضاحت دینے، میں تمہیں بتانے آیا ہوں۔''

وہ برآمدے کی سیڑھی پر اس کے برابر آ بیٹھا تھا جب وہ پھولوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس کے جانے کی سن گن تو اسے تھی اور اسے پتا تھا کہ اس سال شادی طے کرنے کا سوچا تھا بڑوں کے درمیان۔

''دیکھو، ہمارا رشتہ ہم دونوں کی مرضی سے ہوا۔ اور ہم شادی بھی کریں گے لیکن ضروری نہیں کہ شادی اتنی جلدی کی جائے۔ دیکھو تمہیں پتا ہے کہ ایسا چانس روز روز نہیں ملتا اور پھر جب شادی ہونی ہی ہے تو کیا دیر سویر۔ اب اتنی بھی عجلت کیا ہے۔''

''تم نے کہا تھا، ہم جلدی شادی کریں گے۔''

وہ اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

''ہاں، میرا یہی ارادہ تھا۔''

''تو پھر کیوں بدلا؟'' وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اتنی ہمت بھی وہ کبھی کبھار فرحانہ کے دیے گئے حوصلے پر کر جاتی تھی۔

''دیکھو، حالات کے ساتھ ارادے بدل بھی جاتے ہیں۔'' اس نے آسانی سے رات کی رانی کی ٹہنی کو چھیڑ کر کہا۔ وہ اس سے بغیر نظر ملائے بات کر رہا تھا کہ کہیں اسے دیکھ کر کمزور نہ پڑ جائے۔

وہ چار زینے اتر کر اس کے ٹھیک سامنے

آ کھڑی ہوئی۔

''تو پھر محبت کا کیا؟ اتنی بے چینی، اتنی عجلت جو کچھ ماہ پہلے تمہیں تھی، وہ ارادے کے ساتھ بدل گئی؟ فقط سات آٹھ ماہ میں؟''

''دیکھو دیکھو۔ بدلنے کے لیے تو لمحہ بھی کبھی کافی ہوتا ہے۔'' وہ بے ساختہ کہتے پچھتایا۔

''میرا مطلب ہے رائے بدلتے۔''

''میری طرف دیکھ کر بات کر بیل!''

''ہاں۔ دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے ناچار نظر ملائی۔ ''دیکھو فقیہہ! ایک بات سنو۔ یہ حقیقت ہے۔ تم نے سنا ہوگا، اکثر لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم تمہیں ہمیشہ چاہیں گے۔ وہ ہمیشہ فقط اسی لمحہ کا ہمیشہ ہوتا ہے۔

اسی لیے میں تو کہتا ہوں کہ محبت پر اتنا بھی اعتبار مت کرنا۔ یہ صرف دکھ دیتی ہے۔ یہ بس نام کی ہے۔ اس لیے میں تو تمہیں کوئی ڈاج نہیں دینا چاہتا۔ میں تمہیں کوئی جھوٹا آسرا نہیں دوں گا۔ میں جاؤں تو میرے پیچھے تم پریشان مت ہونا۔''

وہ پینترا بدلنا بھی خوب جانتا تھا۔ اپنے تئیں وہ اس کے سامنے حقائق رکھ رہا تھا اور بری الذمہ ہو گیا تھا۔

''تمہیں اس پر یقین نہیں ہے مطلب؟ تمہیں محبت پر یقین نہیں ہے؟'' دل گرفتہ سا پوچھنا کمزور کر دیتا تھا۔ وہ کمزور ہی ہو جاتی تھی۔ ناچاہتے ہوئے بھی۔

''دیکھو فاقی! بات یہ ہے کہ ہر احساس اپنے وقت پر پروان چڑھتا ہے اور پھر بڑھتا یا گھٹتا رہتا ہے۔'' اس کی کمزوری کو دیکھ کر بھی اس نے سر جھٹک دیا۔

''تم کب بڑی ہو گی۔ کب تمہیں حقائق کا پتا چلے گا۔ دیکھو، میں محبت کا انکار نہیں کر رہا۔ پوری طرح سے یہ بھی نہیں کہہ رہا کہ تم میرے لیے اہم نہیں ہو۔ تم میری منگیتر ہو، میں تمہیں اون کرتا ہوں لیکن میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کرتا کہ جلد لوٹ آؤں گا یا یہ کہ میرا ہمیشہ انتظار کرنا۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر میں جلدی لوٹ آیا تو تمہارا۔ نہ لوٹا تو تم انتظار مت کرنا۔ تم آزاد ہو۔ میں تمہیں باؤنڈ کرنا نہیں چاہتا اصل میں۔''

وہ اس کی پانی سے بھری آنکھوں کو دیکھتے کچھ نرم پڑا۔ ''دیکھو، مجھے فریب دینا نہیں آتا۔ ابھی میں جا رہا ہوں پھر خدا جانے سیٹل ہونے تک کتنا عرصہ لگے۔ پھر تم کیوں انتظار میں بیٹھو..... پھر یہ کہ ہم مزا لے چکے ہیں محبت کا۔ باتیں کرنا، ساتھ گھومنا پھرنا۔ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ منگنی ہوئی اور ہم نے خوب اچھی باتیں کر کے وقت گزارا۔ کم از کم وہ وقت تو اچھا تھا ناں۔ اب یہ جو وقت ہے یہ کام کا ہے۔ کچھ کرنا، کچھ بننا تا کہ آگے زندگی میں دقت نہ ہو۔''

''میں نے تمہیں اس سب سے کب روکا ہے نبیل! تم تو سرے سے محبت سے ہی ہاتھ اٹھا رہے ہو۔'' ابھی مزید وہ کچھ کہتی کہ وہ بول پڑا۔

''دیکھو، تمہیں میری بات سمجھنی ہوگی فاقی! مجھے جانا ہے۔ مجھے جانا پڑے گا۔ ٹھیک ہے تم انتظار کرنا چاہتی ہو تو کرنا۔ لیکن میں تم کو بہر حال پابند کر کے نہیں جا رہا۔ خیر پھر بات ہوگی۔ مجھے پیکنگ کرنی ہے۔''

وہ جاتے ہوئے اپنی بات مکمل کر کے اپنی دانست میں کوئی آسرا نہ دے کر انصاف کر گیا تھا۔

اور وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے نہ لڑنا آتا تھا۔ نہ احتجاج کرنا، نہ باتوں کے ذریعے قائل کرنا۔ بس بات کرنا آتی تھی جو کی۔ وہ فرحانہ سے بہت مختلف تھی۔ ابا اس سے فرحانہ سے زیادہ محبت کرتے لیکن فخر ہمیشہ فرحانہ پر کرتے تھے اور اسے نبیل اور فرحانہ دنیا کے سفاک ترین لوگ لگتے تھے۔ وہ خود کو اور ابا جی کو حساس ترین سمجھتی تھی۔ سمجھ یہاں بھی تھی۔ سمجھ وہاں بھی۔ بس ہر کسی کا برتنے اور پرکھنے کا اپنا انداز تھا۔

لیکن اسے اس وقت معلوم ہو گیا کہ وہ بزدل

pklibrary.com

Monthly Shuaa July 2021

ہے، کمزور ہے۔ وہ اسے کچھ یاد نہ دلا سکی۔ نہ اس کے پرانے خواب، نہ پرانی باتیں، نہ اظہار محبت۔ کچھ بھی نہیں اور اگر دلاتی بھی تو کیا۔ وہ فقط محبت کی بات پر جھٹلا گیا سب۔ وہ نکل گیا اور وہ چپ رہ گئی۔ اس پوزیشن میں کہ کسی کو قصور وار ٹھہرانے کا اختیار بھی کھو چکی۔ وہ اپنا پتا صاف کر گیا تھا۔ وہ بچپن سے اسی طرح کا تھا اپنی مرضی چلانا۔

جب بڑوں نے فرحانہ کے ساتھ اس کی منگنی کا فیصلہ کیا تب اس نے خود ہی اسے چنا تھا۔ وہ حیران تھی کیونکہ بڑے ابا کے سب ہی بچوں کی دوستی فرحانہ سے زیادہ تھی بلکہ وہ تو ہر کام فرحانہ سے مشورہ لے کر کیا کرتا تھا لیکن اس انتخاب پر فرحانہ ہی حیران نہیں تھی۔ گھر والے حیران تھے۔ وہ حیران تھی۔ وہ نبیل سے تین سال چھوٹی تھی۔ وہ فرحانہ کی عمر کا تھا۔ فرحانہ سے جب ابا نے نبیل کی بات کی اور نبیل کا خیال سامنے رکھا تو وہ ہنس پڑی یہ کہتے ہوئے کہ اس میں کیا ہرج ہے۔

"تمہیں کوئی دکھ نہیں ہے؟ وہ تمہارا ہم عمر ہے۔ اس کی دوستی تم سے ہے۔ ہم نے تو تب سوچا تھا جب تم دونوں بہت چھوٹے تھے۔"

"تو کیا ہوا ابا جی! ہم نے تو نہیں سوچا ناں۔" فرحانہ نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"میں تب جیسی تھی، اب تک ویسی ہوں۔ نہیں بدلی۔ بالکل نہیں بدلی۔" وہ خود سے مخاطب تھی۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ محبت پر بالکل ہی بھروسا مت کرو۔ وقتی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ دیکھو وہ وقت اور تھا جب میں تم پر مرتا تھا۔ اب وہ وقت گزر گیا۔ ٹین ایج کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔

"میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تم انتظار مت کرنا۔ لیکن یہ بھی کہتا ہوں کہ زیادہ مت کرنا، اگر میں نہ لوٹوں تو تم آزاد ہو۔"

بس ایک جملہ تمام گفتگو پر بھاری تھا۔

اور پھر یا تو انتظار کی سولی پر لٹکنا تھا یا پھر قطع تعلق کر دینا تھا۔ وہ مصلحتاً تب بھی خاموش تھی اور فیصلہ وقت نے کیا تھا جو کہ اسے کرنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

"ہر کوئی اشتہار لگاتا ہے۔ کام کوئی نہیں کرتا، سب دکھاوا ہے۔ فقط وڈیو بنانے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ مزا نہیں آیا۔ کیسے آتا۔ فقط وڈیو بنانے سے کام نہیں چلتا۔ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کرنا پڑا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ سامنے کھڑی بوا نے تنقیدی انداز میں آنکھوں پر چشمہ درست کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"آتے ہی سلام نہ دعا۔ اس بلا کی گرمی میں تقریر کرنا شروع ہو گئیں۔"

"تقریر نہیں بوا۔ سچ بات ہے۔ کسی کے سینے میں درد نہیں۔ تف ہے ہم سب پر۔ اب میں کیسے نہ پگھلتی، اس کمزور یتیم بچے کے ہاتھوں میں کدال تھی۔ وہ ننھا سا بچہ مزدوری مانگ رہا تھا۔ میں نے اسے پیسے دیے، اس نے نہیں لیے۔ کہنے لگا اماں کہتی ہیں محنت کی روٹی کھانی ہے۔ کتنا بڑا دل تھا اس بچے کا۔ اس کی ماں گھروں میں کام کرتی ہے لیکن ان دنوں بیمار تھی تو وہ خود نکل آیا مزدوری ڈھونڈنے۔"

فرحانہ وڈیو بنا کر لوٹی تھی اور ہلکان تھی۔ اس نے بچے کو زبردستی کھانے کی دعوت دی اور کہا کہ کسی کی دعوت نہیں ٹھکراتے۔

وہ کہنے لگا اماں کہیں گی مانگ لائے ہو۔

وہ چپ ہو گئی۔ پھر پوچھنے لگی تو پتا چلا کہ اس کی ماں ان دنوں بیمار ہے۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ جہاں کام کرتی تھی، وہاں سے کھانا نہیں لاتی تو بچے نے کہا کہ نہیں وہ پیسے لاتی تھی۔ یا باہر سے خود کچھ خرید لاتی ہم گھر میں پکاتے۔

"تو اب تم یہاں کام ڈھونڈ رہے ہو؟"

بچے نے سر ہلایا۔

"تمہیں کام نہیں ملا؟"

سر نفی میں ہلا۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر ہاں میں ہلایا۔ "بس ایک دن ملا تھا۔"

اور پھر اس نے دو تین افراد کا کھانا لے کر اسے

پیک کر کے دیا کہ گھر جا کر کھائے۔ اس کے لیے الگ سے پیکٹ بنایا لیکن کب تک۔ ہر روز جب وہ اس سڑک پر کھڑا سیمنٹ فیکٹری کے سامنے مزدوری مانگا کرے گا، تب کون اس کی مدد کرے گا یا پھر اس کے لیے کوئی راستہ نکالے گا۔

وہ بچے کو جاتا دیکھ کر سوچتی رہی تھی کہ یہ کوئی اتنی بڑی مدد نہیں۔ وہ سڑک کے کنارے بنی جھگیوں کے اندر کی غربت کو ریکارڈ تو کرآئی۔ ''ایک ڈاکیومینٹری ایک سوال۔'' لیکن لوٹنے کے بعد راستے میں اس نے سوچا کہ وڈیو ادھوری ہے۔ وہ کل پھر جائے گی اسی جگہ اور اس بچے کو کسی کام دھندے سے لگا دے گی اور ابھی گاڑی میں ہی تھی تو اس نے سوچا کل کون سا۔ کیا کل وہ فارغ ہوگی۔ کیا گارنٹی ہے کہ کل وہ پھر آئے۔ ابھی کرنے کے لیے تو بہت سارے کام ہیں۔ کہیں بھی الجھاؤ پیدا ہوسکتا ہے، اس لیے اس نے واپس گاڑی موڑی اور اس علاقے کے دوکاندار سے ملی، اس کی منتیں کیں کہ بچے کو کل وہ اپنی شاپ پر ایک چانس دے۔ دوکاندار کو وہ نیکی کرنے پر قائل کر گئی پھر اس نے بچے کو بلایا۔

وہ قریب ہی کہیں رہتا تھا اور اسے دوکاندار سے ملوا کر کہا کہ تم کل سے یہاں کام کرو گے اور تمہیں مہینے کے کچھ پیسے اور روزانہ کچھ کھانے کی چیزیں مل جایا کریں گی۔ دوکاندار کے ساتھ وڈیو بنا کر آؤ راستہ بنو۔ کا ٹیگ ڈالا اور وڈیو ایڈیٹنگ کے لیے چھوڑی اسی لیے لوٹتے ہوئے آج وہ اتنی خوش تھی۔

''ایک تو اتنے مبارک مہینے میں تمہیں ان خرافات کی پڑی ہے۔ اوپر سے گھر آ کر شروع ہو جاتی ہو۔ بی بی شادی کرو جا کے اپنے بچے پیدا کرو اور ان کی فکر کرو۔ کیوں ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے تم نے۔ حد کرتی ہو۔''

بوا کا غصہ عروج پر تھا۔

''آپ کو بس یہی ایک دنیا کا ضروری کام یاد رہتا ہے۔ شادی کرو، اپنے بچے پیدا کرو، اور کوئی فکر ہے کہ نہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ آج کل کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ اپنے بچے بھی بڑے ہو کر چھوڑ جاتے ہیں۔ کوئی کسی کی فکر نہیں کرتا نہ ہی پروا، یہ بس نام کے دم چھلے ہیں۔''

اس نے چپلوں سے پاؤں آزاد کیے اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے میز پر ٹانگیں پسار دیں۔ پنکھے کی گھر گھر اسے بیزار کر رہی تھی لیکن اس وقت یہ بھی غنیمت تھا۔

''اب ایسا بھی کچھ نہیں ہے بوا۔ یہ تمہاری سوچیں ہیں۔ اب دیکھو فقیہہ نے گھر بسا لیا۔ بڑوں کی بات رکھ لی۔ ایک تم ہو کہ بے لگام گھوڑے کی طرح پھر رہی ہو اور کوئی لگام ڈالنے والا نہیں ہے۔ بڑے میاں کو کہو تو وہ لاپروائی برتتے ہیں۔ ڈرتے ہیں جیسے وہ بھی تم سے، سب کو دبا کر رکھنے کی سوچتی ہو۔ پچھتاؤ گی بری طرح۔''

''چلیں ٹھیک ہے، میں غلط ہوں۔ میں نے دبا کر رکھا ہے مگر آپ پوچھ لیں ابا جی سے، وہ بھی چاہتے ہیں کہ میں ایسا جو ٹھم بھرا کام کروں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں کہیں جاؤں۔ پوچھ لیجیے گا بے شک۔ نہیں رہ پائیں گے وہ اکیلے۔''

اس کی بات پر انہوں نے اونہہ کر کے منہ بسورا۔

''ویسے گئے کہاں ہیں؟'' اسے ابھی دھیان آیا۔

''جب سے سنا ہے، فقیہہ آ رہی ہے۔ سٹھیا گئے ہیں۔ اے سی ٹھیک کرنے والے کو فون کیا، وہ نہیں ملا اب فقیہہ کو خود لینے گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ فرحانہ کو کہنا کہ لڑکے کو ایک بار پھر فون کر لے یا جا کر لے آئے۔ تم سے تو یہ بھی نہ ہوا کہ بہن کو لیتی آتیں یا خود ہی ان سے کہتیں کہ بہن کو لے لوں گی میں۔ اب ایک تو اتنی گرمی ہے۔ اوپر سے روزہ بھی رکھا ہوا ہے انہوں نے۔ اللہ ہی جانے کیا حال ہوا ہوگا ان کا۔''

''لو بھلا فقیہہ خود آ جاتی۔ کوئی نئی نہیں ہے کہ شہر میں کھو جاتی۔ کیب لیتی اور سیدھی گھر پر ہوتی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا۔

میں کل لے آتی اس لڑکے کو یا پھر رات میں۔ اب فقیہہ اسی گھر کی ہے، کسی نئے گھر میں نہیں آرہی۔ اسے پتا ہے کہ میرے کمرے کا اے سی اتنا ہی بے بھروسا ہے۔ ابا کے کمرے میں بستر ڈال دیں گے آج اس کا۔ آپ لوگ تو بیاہی بیٹی کو وہ پروٹوکول دیتے ہیں کہ جیسے وہ کوئی دور کی رشتہ دار ہو۔ اتنے تکلفات..... حد ہے۔

پچھلی بار ابا جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گھر میں سجاوٹ کی جھنڈیاں لگا دیتے۔ بلکہ ذرا دھیان آتا تو بینر ہی بنوا لیتے یہ سوچ کر کہ بیٹی شادی کے بعد پہلی بار میکے آرہی ہے۔ پھولوں کی پتیوں، تالیوں کے ساتھ استقبال کرتے۔ خیر، اب ان کو بھی کیا دوش دیں۔ پہلی بار بیٹی بیاہی تھی۔ ناتجربہ کار تھے۔"

"چپ کر جاؤ فرحانہ! بس کردو۔ سال بھر بعد آرہی ہے بہن، کچھ رحم کرو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اب کسی کام کاج کی بھی پروا کرو۔"

"لو بھلا، میں نہیں کرتی تو بھلا گھر کے یہ سارے کام کاج کون کرتا ہے۔ بوا! آپ بھی حد کرتی ہیں، سارے کام تو میں کرتی ہوں۔ آج آف کیا تھا کچھ گھنٹے کیونکہ یہ وڈیو بنانے جانا تھا۔"

"تو یہ آج ہی تو ضروری نہیں تھی۔ پہلے گھر دیکھ لیتیں، بہن کے آنے کی خبر سنا کر بی بی بستہ اٹھا کر نکل گئیں۔ حد ہوتی ہے بے فکری کی۔"

"بس کردیں بوا! ویسے یہ نیا لاڈلا جور کھا ہے۔ وہ کدھر گیا؟ کل تک تو بڑے وعدے کررہا تھا، ایک وقت میں یہ کردوں گا۔ وہ کردوں گا۔ میں نہیں تھکتا جی۔ سب کردوں گا۔ ہنڈیا، روٹی، باہر کی دوڑ دھوپ، صفائی۔"

وہ باقاعدہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔

"عمر دیکھو اپنی فرحانہ! کیسے بچوں کی طرح نقل اتار رہی ہو۔ یہ سارا ستیاناس تمہارا ان بے ہودہ کاموں نے کیا ہے جو مردوں کے ساتھ دندناتی پھرتی ہو کیمرہ لے کر۔ نہ حیا نہ لحاظ۔ نہ شعور۔ کہاں گئی ساری سمجھ پڑھ لکھ کر۔ ارے تمیز نہ آئی تو کاہے کی پڑھائی، کس کام کی آخر؟"

"بوا! بس بہت ہوا۔" اس نے ٹانگیں نیچے رکھیں۔ "مجھے اب مزید نہیں سننا۔ میں جارہی ہوں کچھ دیر لیٹنے، پلیز جب تک خود نہ اٹھوں مجھے آواز دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بیٹھ کر اکیلے میں بول کر حسرت پوری کریں اور اس لفظ کی راہ دیکھیں۔"

"ارے راہ کیسی دیکھنی اس کی۔ وہ تو چلا گیا چھوڑ کر۔"

"ہائے بھری جوانی میں چھوڑ گیا۔ غلط کیا اس نے بہت۔" وہ ہنسی روک کر اٹھتے ہوئے بولی تو بوا نے سر پیٹ لیا۔

"کم بخت میں ہوئی جو تمہیں بتایا۔ ویسے گیا بھی تمہاری وجہ سے ہے۔"

"ہیں؟ میری وجہ سے آپ..... کو چھوڑ گیا ہے؟"

"تجھے ذرا لحاظ نہیں میری عمر کا چھوکری۔ ایک تو میں دن بھر کام دیکھوں، گھر دیکھوں۔ اوپر سے تم اٹھتے بیٹھتے میرا خون الگ جلاؤ، طنز الگ کرو۔"

"ارے بوا جی! طنز کہاں۔ وہ تو آپ کا شیوہ ہے۔ آئی مین آئی ایم سوری۔ لیکن سن کر بہت افسوس ہوا کہ ہمارا نیا کام والا بھی اب اس گھر میں نہیں رہا۔ رب اس کی بخشش کرے۔ جو دکھ وہ ان تھوڑے دنوں میں ہمیں دے کر گیا ہے۔ کہیں ٹکا ہوگا تو داستانیں رقم کی ہوں گی اپنی چرب زبانی اور نکتے پن کی۔ کام کے لیے آتا تو کم بخت ایک کام میں گھنٹہ لگا دیتا تھا۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے، اب ڈھونڈو تم کوئی نیک بخت ڈھنگ کا۔ اور لا کر بٹھا دو ہمارے سر پر۔"

"فکر نہ کریں، نیک بخت ملنا ہوتا تو مل چکا ہوتا اور پھر اسے آپ کے سر بھی نہ منڈھتی۔" وہ کہہ کر کمرے کی طرف جانے لگی۔

انہوں نے سر جھٹکا ہی تھا کہ باہر سے دروازہ کھولنے کی آواز آئی اور وہ رک گئی۔

ابا جی کے ساتھ فقیہہ تھی۔ فقیہہ کے چہرے پر

pklibrary.com

لکھی تھکن اس نے اسی وقت محسوس کر لی تھی۔
''کیا خیال ہے بھئی ملنا چاہیے؟ یا تمہیں بھی وہا کے واہمے ہیں؟ فرحانہ آگے بڑھتے ہوئے مزے سے بولی تو وہ مسکرا کر اس سے گلے ملی، بجھی ہوئی مسکراہٹ اور تھکے ہوئے لہجے میں حال پوچھا۔ کیسی ہو؟''
''کیسی لگ رہی ہوں؟'' فرحانہ مسکرائی۔
''اچھی لگ رہی ہو ہمیشہ کی طرح۔'' وہ کہہ کر تیزی سے بوا کی طرف بڑھی۔
''میری بچی۔ میری جان۔'' بوا نے اسے ساتھ لپٹا لیا تھا۔
''بس کر دیں بوا! بچی تھکی ہوئی ہے۔ جان مت نکال دیں بچی کی۔''
فرحانہ نے ٹوکنا مناسب سمجھا۔ فقیہہ مسکرائی۔ بوا نے فرحانہ پر کو گھورا جبکہ ابا جی موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ چکے تھے۔
''بھئی، بچی کو بیٹھنے تو دو۔ سامان اندر رکھواؤ فرحانہ!''
''جی بالکل۔'' وہ سامان دیکھ کر کچھ چونکی۔ سامان اچھا خاصا لگ رہا تھا۔ ایک سوٹ کیس پوری طرح سے بھرا ہوا اور ایک درمیانے سائز کا تھیلا۔ چھوٹا بیگ اس کے ہاتھ میں الگ تھا۔
''لگتا ہے اس مرتبہ فقیہہ بیگم مہینے بھر کے لیے آئی ہیں۔'' اس نے پیش گوئی کی اور تھیلا اندر لے جانے لگی۔
''میں خود رکھ دوں گی فرحانہ!'' اس نے کمزور سا احتجاج کیا۔
''تم فقط خود کو اندر تک پہنچا دو یہ کافی ہوگا۔ روزہ نہ ہوتا تو ابھی تمہیں پورا ٹینکر پانی کا پینے کے لیے دے دیتی۔'' وہ تیزی سے کہتی ہوئی اندر کمرے کی طرف چلی گئی اور فقیہہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''
''اری بیٹا! یہ جب باہر سے آتی ہے تو بجائے تھکنے کے اس کا دماغ اسی طرح چلنے لگتا ہے۔ تم چلو اندر چل کر بیٹھو ذرا۔ گرمی دیکھو کتنی ہے۔''
''تمہارے آنے کی خوشی میں ایسی ہو گئی ہوں۔'' وہ بیگ دروازے سے کھسکا کر بولی۔
''میں فریش ہو جاؤں پہلے۔'' وہ کہتے ہوئے اندر کمرے کی طرف گئی۔ چھوٹے تھیلے کی زپ کھول کر اوپر رکھا سوٹ نکالا۔
''پانی صحیح ہوگا اس وقت؟'' انہوں نے سیمنٹ کی ٹینکی کی جگہ جب سے نئی پلاسٹک کی ٹینکی لگائی تھی دوپہر کے وقت پانی گرم ہو جاتا تھا اس کا۔ وہ جب اس سے پہلے آئی تھی تو اسے اس دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
''سیمنٹ والی ٹینکی بنوا دی ہے دوبارہ سے۔ بے فکر رہو۔'' وہ اب اس کا سامان اندر اسٹور میں رکھنے لگی جو وارڈ روب کے ساتھ ہی تھا۔
''اچھا کیا۔'' وہ کپڑے لے کر اندر چلی گئی تب تک فرحانہ وہیں بیٹھی رہی تھی حالانکہ وہ سوچ رہی تھی کہ فی الحال کچھ دیر وہ اس سے کچھ نہ پوچھے۔
لیکن باہر نکلتے ہی فرحانہ نے اسے بغور دیکھا۔
''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''کیوں۔ بہن ہوں تمہاری۔ دیکھ نہیں سکتی کیا؟''
''ضرور دیکھو لیکن اس طریقے سے نہیں جیسے پولیس والی بن کر کھڑی ہو، بیٹھ جاؤ۔''
''فکر مت کرو۔ تم سے کچھ نہیں پوچھ رہی، فی الحال رعایت ہے جب تک تمہاری تھکن نہ اتر جائے لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں سمجھی نہیں۔''
''تمہیں ربیعہ کی کال آئی تھی؟''
''ربیعہ کی کال؟ آج۔ نہیں تو..... مطلب..... خیر ہے۔ تم نے ربیعہ کو کچھ بتایا ہے؟''
''چلو شکر ہے اس کی کال نہیں آئی تمہیں۔''
''ایک منٹ ٹھہرو۔ میرا فون باہر ہے دیکھتی ہوں لیکن رکو، میں اس سے کیوں پوچھوں۔ تم بتاؤ مجھے۔ سب ٹھیک ہے؟''
''ہاں سب صحیح ہے۔''

pklibrary.com

''مطلب صحیح ہے اچھا نہیں؟''

''مطلب یہ کہ میں یہاں آگئی ہوں تو آرام سے بات کرلیں گے۔ فی الحال میں ابا جی کے پاس جارہی ہوں۔''

''اوکے۔ جاؤ۔'' فرحانہ اس کے ساتھ باہر نکلی اور میز پہ فون اٹھایا تو دیکھا واقعی ربیعہ کی دو تین مسڈ کال تھیں۔ اسے نظروں ہی نظروں میں جیسے فقیہہ نے تنبیہہ کی کہ کال مت کرو اسے اور وہ فون لے کر اس کے ساتھ کمرے میں آکر بیٹھ گئی لیکن دھیان اس کا سارا فون کی طرف تھا۔

ابا جی اپنی چارپائی پر لیٹ کر نیند میں اس سے ایک دو سوالات کرتے ہی سو گئے۔ کہ عبید کیسا ہے؟ آیا کیوں نہیں؟ اس نے ایک سوال کا جواب دیا دوسرے جواب میں اتنی دیر لگائی کہ انہیں نیند آگئی۔ اس نے بھی سنگل بیڈ پر پیر پسار لیے۔

فرحانہ فون پر ربیعہ کو ٹیکسٹ کرتے افطار کی تیاری کا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جہاں بوا پہلے ہی اس کا انتظار کررہی تھیں لیکن اسے پہلی فرصت میں ربیعہ کو کال کرنی تھی۔ جس کا اندازہ فقیہہ کو بھی تھا لیکن فی الحال تھکن سے شل ذہن کے ساتھ وہ کچھ دیر نیند لینا چاہتی تھی جو سفر میں بھی نہیں لے سکی تھی۔

☆☆☆

تھر واسی گرمی کے مارے تھک رہے تھے۔ دھوپ نے پسینہ پانی کی شکل بہادیا تھا۔ اوڑھنیاں بھگو کر مائیاں بار بار اوڑھتیں۔ بھاونا نے چھت میں بانس کے لکڑ کے ساتھ ٹیڑھی لکڑی کو اٹکا کر کپڑا باندھ دیا تھا۔ وقتاً فوقتاً کپڑے پر پانی ڈالا جاتا اور نیچے ڈوری کو ہلاتی تو نیچے ٹھنڈا پانی بھری ہوا کا فوارہ چھوٹتا اور مائی جی کی جیسے سانس میں سانس آتی تھی اور بہو کو دعائیں دینے لگتی۔

''تیرا ور (شوہر) لوٹے۔ تیرا گھر والا بھارو آئے۔ تیرے ناز اٹھائے۔ تجھے سکھی کرے۔ تیرے دل کی برآئے۔''

دعا ایسے دیتی کہ بھاونا کی ڈوری مزید تیزی پکڑتی۔ پانی کی بوندیں ہوا کے شوکے کے ساتھ شرشرانی گرتیں۔ لو سے بے خبر ڈھور ڈنگر، پونچھ ہلاتے ہنہناتے ہوئے چارہ کھانے میں مگن تھے۔ باڑے کی بو سارے صحن میں رچی تھی جسے دھوپ جیسے جلادیتی تھی وہیں۔ اوپلے گھروں کی پیٹھ والی دیواروں پر قطار سے لگے ہوئے تھے۔

کچے کی مٹی دھوپ سے جلی تھی۔ جسے شام ہوتے ہی گرمی چھوڑنے کا حکم تھا۔ پہلے کچی مٹی بھاپ چھوڑتی۔ پھر عصر چڑھتے ہی صبر کا گھونٹ پی لیتی۔ ہوا کچھ لو چھانٹتی۔ ریت بھر بھرائی پی ہوئی کچھ مدھم سانس لیتی اور دیس واسی کھیتوں سے لوٹتے ہوئے وسیع عریض صحنوں میں بچھی چارپائیوں پر پیر پسارتے۔ ٹریکٹروں میں گیت کی آوازیں کچھ مدھم ہوتیں کہ دوسری باری رات کی تھی۔

اور ساتھ والی گیجیوں (دوکانوں) کی طرف بچے دوڑتے۔ صحنوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ سنائی دینے کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے ٹولے جو کبھی دھوپ میں لکن چھپی کھیلتے اب صحنوں میں نکل کر گھوم پھیری کھیلتے۔ پانی کی کھالوں کے کنارے نہاتے لڑکے اجلے کپڑے پہن کر کھیتوں کے آس پاس کھیل کود کا سامان لے کر نکل جاتے۔ علاقے میں تازہ تازہ ڈش انٹینا آیا تھا۔ بستی کے دو گھروں میں ٹیلی وژن تھا۔ ایک ساجن بھاؤ اور ایک ڈیلاں کے سسرال میں۔ ڈیلاں کو یہی لالچ دیا جارہا تھا کہ سسرال میں سارا دن مزے کرے گی۔ تیرے کمرے میں ٹی وی ہوگا تو دیکھا کرے گی۔ راسو جی نے ارادہ کا ٹیلی وژن لانے کا جسے بیوی نے ڈیلاں کی شادی تک روک دیا اور یہ بھی کہا کہ اس سے بہتر ٹریکٹر کی مرمت کرادی جائے جس کی کمائی سے گھر کی چوکی چولہا چلتا ہے۔

بھارو کی بلاوجہ کی جدوجہد اور جلاوطنی نے ان سبھوں کو پریشان کررکھا تھا۔

''آئیو ری ساجن آئیو۔'' بوڑھی مائی گیت کا سرا اپنی کرلاتی آواز میں گنگنانے کی کوشش سے ناکام

ہوکر ہانپنے لگی تو بھاونا نے اٹھ کر پانی کا پیالہ اسے تھمایا۔ گھونٹ گھونٹ پینے تک کی ساعتوں تک کھڑی رہی اور پھر پیالہ منجی کے نیچے رکھ کر ڈور کھینچنے لگی تھی۔

''آئیو، ری ساجن آئیو۔''

اس کا من دہرانے لگا تو سر جھٹکا۔ ہر جائی سمجھ کر بھارو کا خیال جھٹکنے کی کوشش کی اور خیال مزید سر پر بیٹھ کر ناچنے لگا تھا۔

خیال بھی بھارو جیسا ہی تھا۔

☆☆☆

دن ست روی سے کھسکنے لگا تھا اور گھر میں ڈیلاں کی شادی کا شور اٹھنے کا منتظر تھا۔ ہر کسی کو بھارو کا انتظار تھا۔ پر مائی نے ہمت کر کے کہہ دیا جس کے لیے بہت ہی مشکل تھا پر بڑی تھی۔ اسے خیال تھا سب کا، خصوصاً راسو کا۔ سو حکم دے دیا کہ اگر وہ آتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کچھ روز بعد بچی کی رخصتی کر دی جائے گی۔

اس بار بھاونا بھی چپ تھی۔

بھاونا جس کا احساس کومل سپنوں جیسا سجاؤ دیتا تھا۔

☆☆☆

چوکھٹ پر دھوپ چھپاکے سے پھیلی ہوئی تھی۔ ہر سال گرمی پہلے سال سے کچھ مزید بڑھ جاتی ہے۔ موسم پہلے سے زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ کسی سال کوئی نئی امید نہیں ابھرتی کہ موسم معتدل ہو۔ کام کرنا دوبھر ہو گیا ہے۔ فرحانہ نے اباجی کو دیکھ کر کہا تھا حالانکہ ان کو کوئی اور ہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

''آپ کو بھی گرمی نے نڈھال کیا ہے ناں؟''

''فرحانہ! ادھر آؤ۔ بیٹھو یہاں پر۔'' وہ لیپ ٹاپ ٹھک سے بند کر کے ان کی طرف آئی تھی۔

''جی کہیے، گرمی کے علاوہ کوئی مسئلہ ہے؟ ویسے میرے خیال میں آج کل گرمی کے علاوہ کچھ بھی ایسا نہیں جس سے پریشان ہوا جائے۔''

وہ ان کو بہلانے اور دھیان بٹانے کی ماہر تھی لیکن فی الحال اسے بھی معلوم تھا کہ یہ حربہ ناکام ہوگا۔

''چپ کر کے میری بات سنو۔''

''سنائیے۔'' وہ سنجیدہ ہو کر بیٹھی تھی۔

انہوں نے اسے دیکھ کر سر جھٹکا اور پھر جیسے جھک گیا۔

''فقیہہ کچھ کہتی ہے؟''

''کچھ نہیں۔ کیوں خیر ہے؟''

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ خیر ہے۔ اس سے پوچھو۔ اس سے بات کرو۔ وہ بہت مایوس ہے۔ کچھ ایسا ہے جو وہ کہہ نہیں رہی ہم سے لیکن میرا دل بہت بے چین ہے۔''

وہ چپ ہو گئی۔ اسے اندازہ تو تھا کہ وہ سمجھ جائیں گے۔

''تم کچھ جانتی ہو؟''

''اب تک نہیں۔'' اسے فی الحال یہی سوجھا۔

''تمہیں کچھ محسوس ہو رہا ہے؟''

''خدا کرے، وہ غلط ہو جو ہمیں محسوس ہو رہا ہے۔''

''تم نے میرے دل کی بات کی ہے، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ خدا خیر کرے۔'' اباجی نے کہا۔

''تم بہن ہو اس کی۔ کیسی رازدار ہو کہ وہ آئی ہے، پریشان ہے اور تمہیں کچھ بتا نہیں رہی۔ اس سے پوچھو، کیا پریشانی ہے۔ یہ دھیان رکھنا کہ اس کی سن لینا پھر تم بولنا اگر تم نے بولنا شروع کیا تو وہ بول نہیں پائے گی۔ پہلے اسے سمجھ لینا پھر اور مجھے بتانا۔ ہو سکتا ہے۔ ویسا نہ ہو۔ جو ہمیں محسوس ہو رہا ہے۔''

ان کے چہرے پر فکر کی لکیریں تھیں۔

''آپ صبح تو ٹھیک ٹھاک تھے۔ اپنا پسندیدہ کلام۔ ''مجھ کو بتا اے قاضیا'' سن رہے تھے۔ یہ بیٹھے بیٹھے اتنے کیسے پریشان ہو گئے۔''

وہ اسے پھر بے بسی سے دیکھنے لگے تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کی تسلی کر دی۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں بات کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کمرے میں جا کر کچھ آرام

pklibrary.com

کرلوں۔ راسو جی آج دفتر میں آئے تھے۔ بہت پریشان تھے۔ مسافر ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ گھر آجائیں۔ نیچے کا کمرہ کھلوالینا۔ وہ رہیں گے کچھ دن۔ اپنے بھائی بھارومل کو ڈھونڈنے آئے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔" پھر تاکید کرتے ہوئے بولے۔

"ابا جی کی عادت ہے بڑبڑ کی۔ تم خیال رکھنا شام میں پہنچیں گے۔"

وہ اس کا بازو پکڑ کر اٹھے۔ اس نے سہارا دیا۔

"اب گھٹنے دم توڑتے جارہے ہیں۔ دفتر کام نہ ہوتا تو کون جاتا لیکن آج اچھا کیا کہ گیا۔ راسو سے ملاقات ہوئی۔ سمجھو اللہ نے مجھے بھیجا کہ راسو کو میری ضرورت تھی۔"

"اب یہ راسو کون سی بلا ہے؟"

"راسو بلا نہیں انسان ہے۔ اس سے ذات پات، مذہب کی بنا پر کوئی بحث مباحثہ مت کرنا۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ میں کوئی گپ شپ مارنے بیٹھ جاؤں گی ایک مسافر کے ساتھ، یہاں تک کہ مذہب، ذات پات کا ذکر آئے گا۔ حد ہوگئی۔"

"تم ہو تو خیر ایسی ہی۔" وہ مسکرائے اسے تاؤ دلانے کو۔

"اب ایسی بھی نہیں اللہ جانے کس کو دعوت نامہ دے آئے ہیں۔" انہیں کمرے تک چھوڑ کر وہ بوا کی طرف آئی۔ فقیہہ بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

"آپ کے لیے بری خبر ہے۔" وہ دروازے سے سیدھی کرسی لے کر ان کے ساتھ آبیٹھی جہاں بجلی نہ ہونے کے سبب سولر ائیر کولر چل رہا تھا۔

"رب خیر کرے۔ تمہارے منہ سے اچھی خبریں کم ہی ملی ہیں۔" بوا نے ناک بھوں چڑھائی۔

"ابا جی کسی راسو جی کو دعوت دے آئے ہیں گھر آنے کی۔ وہ ٹھہریں گے' اب بھگتیے گا اچھی طرح۔"

"بھگت لیں گے تم فکر نہ کرو۔ بڑے میاں بھی ویسے حد ہی کرتے ہیں۔ ملازم ہوتا تو اور بات تھی۔ میں کچھ دیر کمر سیدھی کرلو۔" بوا اٹھتے ہوئے بولیں۔

وہ فقیہہ کی خاموشی کو پرکھنے لگی۔

"تم کیوں چپ ہو؟"

"بس یونہی۔"

"کچھ زیادہ ہی چپ رہنے لگی ہو۔"

"کچھ بات کرنے کے لیے ہے ہی نہیں۔" وہ بھی بوا کے ساتھ کچھ فاصلے پر لیٹ گئی۔ فرحانہ نے عادت کے مطابق پیر پسار لیے میز پر۔

"آج تو میرے بہنا پے پر حرف آگیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ابا جی فکرمند ہیں۔ ان کی نظر سے زیادہ دیر کچھ چھپ نہیں سکتا۔"

بوا دو منٹ میں خراٹے لینے لگیں۔ وہ آہستہ آواز میں بات کررہی تھی۔

"اس کا کوئی فون؟"

"نہیں۔" فقیہہ نے فقط اتنا کہا۔

"آئے گا؟"

"شاید آخری بار آئے۔"

"آخری بار۔" فرحانہ نے اسے دیکھا اور دکھی ہوگئی۔

"اس وقت کچھ مت پوچھنا۔ گرمی بہت ہے۔"

"بجلی کب آئے گی؟"

وہ لوڈ شیڈنگ کی ٹائمنگ سے آگاہی کے باوجود بھی نم آنکھوں کو اس کی نظر سے چراتے ہوئے کروٹ بدلنے لگی۔

"مجھے ابا جی کو جواب دینا ہے۔ بہتر ہے، تم ان سے تفصیلی بات کرلو۔"

"مجھے سونے دو۔ رات بھی نہیں سوئی۔" فقیہہ نے کہا جو ساری رات سونے کی اداکاری کیے لیٹی رہتی۔ صبح اس کے اٹھنے سے پہلے اٹھ جاتی تھی۔ اور رات کو اس کے لیٹنے سے پہلے لیٹ جاتی تھی۔

تب ہی اشعر کی کال آگئی۔ وہ وڈیو کی ایڈیٹنگ پر بات کرنا چاہ رہا تھا۔

pklibrary.com

فرحانہ فون لے کر باہر نکل آئی۔
ذہن میں بس ایک ہی جملہ وضاحت مانگ رہا تھا جو آخری بار پر ختم ہوا تھا۔

☆☆☆

''محبت وہ ہے جو آپ کو روک لیتی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو آپ رک نہیں سکتے۔ آپ جڑ نہیں سکتے۔
پہلے دن ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں رہنا مشکل نہ ہو جائے، وہ جو سن کر آئی تھی کہ کیا گھر ہے۔ عیش کرو گی، نہ کوئی ساس نہ نندوں کا جھنجھٹ۔ ایک سسر، ایک شوہر۔ ایک اکیلی عورت تم جس کے ہاتھ میں گھر کی بادشاہی ہو گی جس کے ہاتھ میں پورا گھر ہو گا جو گھر کی اکیلی مالکن کہلائے گی۔ سسر اس قدر تحمل والا، صبر والا اور شوہر اس حد تک سلجھا، پڑھا لکھا۔ اپنے کاروبار والا، خوش شکل، ہم عمر اور بھلا چاہیے ہی کیا تھا۔
ان سب کو تو نبیل کی جگہ پر یہ کوئی آسمان کا تارہ لگا تھا۔ وہ سب نظروں ہی نظروں میں نبیل کو جتاتے کہ وہ بہت خوش ہے۔ اگر اتفاق سے سامنا ہو بھی جاتا۔
فرحانہ تو اس کے سامنے نبیل کا ذکر تک نہیں کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ بھول جائے اسے اور اپنے گھر میں بس جائے، ایک کھٹکا سا تھا۔ اس کی لمبی خاموشی سے لیکن اب یہ تھا کہ وہ لوگ چین سے سونے لگے تھے کہ وہ خوش ہے۔ پتا تھا کہ اس نے اپنے لیے خود کچھ نہیں کرنا۔ اس لیے اچھا کیا اس کے لیے اچھا لڑکا، اچھا گھر ڈھونڈا ورنہ وہ ختم ہو جاتی۔ اس کی خاموشی اسے مار دیتی۔ فرحانہ تو بول دیتی ہے۔ وہ تو بولتی بھی نہیں۔
اور یہی خاموشی اس وقت بھی گھر والوں کو ایک عجیب تکلیف اور خدشات سے ہمکنار کر رہی تھی اور اب اسے پتا تھا کہ اب خاموشی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ فرحانہ نے کہا تھا کہ بولو گی تو معلوم ہو گا کہ ہوا کیا ہے اور کرنا کیا ہے۔ لیکن چپ رہو گی تو ابا جی اپنے خدشوں کے وزن سے جھک جائیں گے۔ جتنا دکھ اسے سننے سے ہو گا۔ اس سے کہیں زیادہ دکھ نہ سن کر خدشات کا جواب دیتے دیتے ہو گا، اور اسے یہ بات صحیح لگی تھی۔
وہ کتنا چپ رہتی۔ کتنی خاموشی آخر۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب فرحانہ کے سوالوں کے جواب اسے دینا پڑیں گے۔ سوال وہ کرے گی اور سن ابا جی لیں گے۔ اس سے پہلے کہ ان کی سوالیہ نگاہیں شکوے میں بدل جائیں۔ دکھ تو ہر حال میں ہوتا ہے اور ہو گا اور اب فرحانہ کے ساتھ وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔
''اس نے کہا۔ ہم ساتھ نہیں چل سکتے۔ بہتر ہے کہ عزت کے ساتھ الگ ہو جائیں۔''
''عزت کے ساتھ الگ ہونے کی بات ہے تو کون بے عزت ہونا پسند کرے گا۔''
''تم نے اس کا خیال رکھا تھا؟'' فرحانہ یہ کہتی تو اور بات تھی۔ ابا جی کہہ رہے تھے اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
''گھر کے کام کاج کے ساتھ جو کام وہ کہتا وہ کر دیتی جو نہ کہتا، وہ بھی فرض سمجھ کر کرتی۔ گھر کو اپنا ہی گھر سمجھا تھا، جیسے آپ نے کہا تھا کہ سمجھنا۔''
''گھر میں کام کرنے کے لیے ملازم نہیں تھے؟''
یہ بھی ابا جی نے ہی پوچھا تھا۔ بوا تو کلیجہ تھام کر کھڑی تھیں۔
فضیہ الرٹ ہو کر بس جوابات کی تفصیل سو فیصد گھڑے گئی۔
''نوکر گھر کی صفائی کرتے لیکن اتنا ہی وقت ان کے ساتھ کھڑے ہونا پڑتا۔ بس ہاتھ سے پکڑ کر جھاڑو ہی نہ دی۔ باقی سب کچھ تو کرنا پڑتا تھا۔ ابا جی کے کمرے کی آدھی ڈسٹنگ میں خود ہی کر دیتی تھی۔ اپنے کمرے میں ایک چیز ادھر سے ادھر نہ ہونے پائے۔ عبید غصہ نہیں کرتے مگر گھور کر دیکھتے۔ خفا ہو جاتے۔ بات نہیں کرتے، چائے نہیں پیتے۔''
وہ آج کھل گئی تھی پوری طرح سے۔
فرحانہ مطمئن تھی۔

pklibrary.com

بوا آب دیدہ جنہیں چپ رہ کر سننے کی خصوصی تلقین کی گئی تھی ابا جی کی طرف سے۔ وہ بس وقفے وقفے سے سب کو دیکھے جا رہی تھیں اور اس سے پہلے کہ کچھ کہہ دیتیں، بہتر سمجھا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر نکل گئیں۔

فقیہہ پریشان نہ تھی اور ان کی طرف دیکھ کر بول رہی تھی۔ ایسے جیسے دکھ کو پی گیا ہو ابندہ ہو۔

''ان کی جرابوں سے لے کر ان کے جوتے تک سنبھال کر رکھنے کے ذمہ داری میری تھی۔ ظاہر ہے، مجھے کوئی قباحت نہیں تھی۔ ان کے آتے ہی ان کو چائے پیش کرنا۔ معلوم نہ ہوتا کہ آج جوس کا موڈ ہے۔ جب چائے ٹھنڈی ہو جاتی تو پتا چلتا اور کپ اٹھا کر جوس کا گلاس رکھ آتی۔ کھانے پر مینیو پوچھتی تو ناگواری سے دیکھتے۔ باپ سے پوچھتی تو وہ اور سناتے کہ ایک عورت کو خود یہ طے کرنا چاہیے کہ اسے کیا پکانا ہے۔ خود سے مینیو ترتیب دیا تو اعتراضات کہ مرچ مسالوں والے کھانے ہیں۔ باہر سے منگواؤ تو فاسٹ فوڈ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ ترا کیب بدلیں تو ''مریضوں کے کھانے پکتے ہیں'' سن کر پریشان ہوئی۔ بیچ کا راستہ نکالا۔ کھانے کے معاملے میں حالات بہتر ہوتے تو مسائل کا رخ دوسری طرف مڑ جاتا۔

''منیر میاں تو ایسے نہ تھے۔'' وہ بڑبڑائے۔

''یہ بتاؤ، کیا بدلے میں تمہارا خیال نہیں رکھا اس نے؟ کیا تمہیں خرچا نہیں دیتا تھا؟''

''دیتا تھا، الماری میں رکھ دیتا تھا، میں لے لیتی۔''

''تم نے کبھی فرمائش کی؟''

''نہ خواہش تھی نہ ضرورت۔''

''دفتر سے واپسی پر تمہارے لیے کچھ لاتا ہوگا؟ دل جوئی تو کرتا ہوگا؟'' ابا جی کسی طرح سے معاملہ برابر کرنا چاہ رہے تھے۔

''شادی کے بعد دو مرتبہ لائے تھے۔ ایک مرتبہ کیک، ایک مرتبہ جوڑا۔''

''بس۔ تمہیں کہیں گھمانے پھرانے لے جاتا تھا؟'' اب کی بار فرحانہ بولی۔

''مجھے اجازت تھی کہ اکیلی جہاں چاہوں نکل جاؤں، لیکن گھر کی ذمہ داری کی صورت حال اسی طرح کی تھی کہ نکلنا ناممکن تھا۔''

''تم نے اس سے کہا؟ احساس دلایا؟ بات کی؟'' ابا جی فرحانہ سے پہلے بولے۔

''مجھے تو فرماں برداری کا ثبوت دینا تھا۔ مجھے صبر کرنا تھا۔ چپ رہنا تھا۔ شکایت کا موقع میں دیتی تو گناہ گار ٹھہرائی جاتی۔ گھر بسانا تھا۔ کسی معمولی جھگڑے کو بھی ہوا نہیں دینی تھی۔ بس صبر تھا۔ بس خاموشی تھی، بس یہی تھا۔

''منیر میاں زندہ ہوتے تو شاید یہ دن نہ آتا۔'' وہ دل گرفتہ ہوئے بیٹھے تھے۔

''ان ہی کے دم سے یہ سب ہوا ہے۔ وہ خود چلے گئے اور ماحول بنا گئے۔'' دکھ تلخی میں بدل گیا تھا۔ وہ کہتی ہوئی باہر گئی۔

ابا جی اور فرحانہ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

''وہ جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اگر آپ کے سامنے کہہ سکتی ہے تو سمجھیں، سچ ہی کہا ہے اس نے۔'' فرحانہ نے باپ کے سامنے بات کا وزن واضح کر دیا تھا۔

''منیر میاں نے تو بہت خوشی سے یہ رشتہ کیا تھا۔ وہ تو خوش تھے۔ انہوں نے تو بہت اصرار کیا تھا۔''

''یہ کہا تھا کہ ہم آپ کی بیٹی کو خوش رکھیں گے؟'' فرحانہ نے تلخی سے پوچھا۔

''یہ تو نہیں کہا مگر یہ ضرور کہا کہ تم سے رشتہ داری ہمارے لیے باعث اطمینان ہے۔ ہم اپنے گھر ایک اچھے گھر کی بچی لے جا رہے ہیں۔ وہ خوش رہے گی۔''

''خوش رہے گی اور خوش رکھیں گے۔ بڑا فرق ہے ان دو جملوں میں۔ بندہ جھوٹ موٹ ہی کہہ دیتا

pklibrary.com

ہے۔ نیت ہی باندھ لیتا ہے۔ کہہ ہی دیتا ہے کہ آپ کی بچی کو ہم خوشیاں دیں گے۔ اسے آپ کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ انہوں نے تو زبان سے بھی نہیں کہا۔ سب آپ کی بیٹی پر ہی ڈال دیا۔ اب اگر بیٹی پر ہی ڈالا تو سمجھیں کہ بیٹی ہی قصوروار ہے۔ وہی خوش نہیں رہ سکی۔"

"میں عبید میاں سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔ فون ملاؤ۔"

"ٹھہر جائیں، دو منٹ سوچ لیں پھر کریں۔ سوچ لیں کہ کیا کہنا ہے۔ سوچ لیں کہ کیا کہنا ضروری ہوگا اور یہ بھی سوچ لیں کہ کہنا کس لیے ہے بلکہ پہلے اس کی سن لیجیے گا پھر اپنی کہیے گا۔"

"حقیقت تو یہ ہے کہ میں اگر فقیہہ کی جگہ ہوتی تو پہلے ہفتے واپس آجاتی اور کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہوتی۔ میری زندگی میری مرضی۔ سمجھوتے بھی کرو اور خود کو بے قصور ثابت کرنے کے مرحلے سے گزرنے کے لیے سو سوالات کے جوابات تراشو۔ میں یا تو زبان سے لڑتی یا انہیں کی طرح ان سے خموشی میں جنگ کرتی اور بتا دیتی کہ عورت کیا ہے۔ گھر کیا ہے، انسان انسان ہے، گھر بنا کر رکھنے کے ذمہ داری فقط عورت ہی پر نہیں مرد پر بھی ہے۔ اگر گھر نہ بنا تو دونوں برابر کے قصوروار ہیں بلکہ قصوروار ہی کیوں۔ اگر نہیں بن سکی تو نہیں بن سکی۔ ڈھور ڈنگر نہیں کہ کھونٹے سے بندھے رہتے۔" فرحانہ تیز رفتاری سے کہہ گئی۔

وہ فون اٹھا کر ملانے لگے۔ نہ فرحانہ کے سوالوں کے جوابات تھے، نہ دے سکتے تھے پھر مایوس ہو کر اسے دیکھا۔ "نمبر بند ہے اس کا۔"

"رکھ دیں، بعد میں کر لیجیے گا۔"

"نہیں، بات کرنی ہوگی۔ کل چلو کراچی۔ کل ہی نکلتے ہیں۔ روبرو بات کریں گے۔" انہیں یہی بہتر لگا تھا۔

"کچھ دن ٹھہر جائیں۔"

"نہیں فرحانہ! بیٹی کا باپ ہوں۔ ڈرتا ہوں۔ دعا کرو، برا نہ ہو۔"

"یہ دعا نہ کروں کہ وہ ہو جس میں فقیہہ کی خوشی ہو؟"

"یہ دعا کرتے ہیں کہ جس میں بھلائی ہو۔" وہ عاجزی سے گویا ہوئے۔

"ہو گئے ناں روایتی باپ۔ خوشی سے زیادہ بہتری کا سوچتے ہیں جس میں بھلائی ہو۔" وہ بڑبڑائی۔

"باپ ہوں تب ہی بھلائی مانگ رہا ہوں۔ باپ نہ ہوتا تو حالات الگ ہوتے۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ لگ رہا تھا کہ خود پر ضبط کیے بیٹھے ہیں۔

"پریشان مت ہوئیے گا۔ بہتری مانگی ہے تو ہو بھی سکتی ہے۔ اسے پتا تھا، وہ نکلے گی کمرے سے تو وہ دل پکڑ لیں گے، متفکر ہو جائیں گے۔

انہیں تسلی دیتے باہر نکلی۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ گئی تب تک بوا دروازہ کھول چکی تھیں اور باہر کوئی آدمی کھڑا تھا۔

"کام کے لیے آیا ہے؟"

"جی۔ بی بی! بڑے صاحب سے ملنا ہے۔"

"شکر ہے۔ انہیں گھر کے کام کا کچھ احساس تو ہوا۔ آجاؤ، ویسے ہم نے اتنی بڑی عمر کا باورچی کبھی رکھا تو نہیں میاں! کوئی اور کام کر سکتے ہو۔ صفائی ستھرائی؟"

وہ اسے اندر لاتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے، کچھ ہانپتے ہوئے عجلت میں بولیں تو فرحانہ نے غور کیا۔

"انہیں گھر کے اندر کہاں گھسا رہی ہیں۔ بڑے میاں نام بتائیے اور یہ بھی کہ بڑے صاحب سے کیا کام ہے؟"

"ادی! میرا نام راسو جی ہے، عمر کوٹ سے آیا ہوں۔ تھرواسی ہوں جی۔"

"اوہ ہاں۔ آپ تو ہمارے مہمان ہوئے بوا انہیں گیسٹ روم میں بٹھائیں بلکہ چلیں، میں دکھاتی ہوں۔ آپ اندر جائیں۔ ابا جی کو بتائیں کہ راسو

صاحب آئے ہیں۔"

"ادی ماں (میں) کوئی صاحب واحب نہیں۔ بس راسو ہی نام ہے میرا۔ راسو بولیو جی۔"

"اچھا ٹھیک ہے کہیں خالی راسو آئے ہیں۔"

"آپ چلیں اس طرف۔"

بوا ہکا بکا رہ گئیں کہ یہ مہمان ہے۔ اب اس کی خاطر کرنی ہوگی۔ فرحانہ نے ان کی تسلی کرائی اور نکل گئی۔ کچن سے ٹھنڈا پانی اور کولڈ ڈرنک لے آئی۔

راسو جی نے دو گلاس پانی پیے اور پھر لمبا سانس لیا۔

تب تک ابا جی بھی پہنچ گئے لیکن وہ وہیں بیٹھی راسو جی کا لہجہ دلچسپی سے سنتی رہی۔ اسے مزا آرہا تھا یہ سن کر کہ راسو کا مسئلہ فقط بھارو کو ڈھونڈنا ہے۔ بیٹی کی شادی کی ڈیٹ فکس کی ہے، اور وہ بھائی کو لینے آئے ہیں۔

ساتھ بھارو سے جتنے شکوے تھے، اتنی ہی تعریفیں تھیں کہ "بھارو، سمجھ دار ہے۔ اخلاق والا ہے۔ سنجیدہ ہے۔ ذمہ دار ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ کتاب لکھتا ہے۔ اخبار پڑھتا ہے۔ بس ضدی ہے۔ بس باؤلا ہے۔ نکلا ہے تو لوٹ کر نہیں دیکھا اور بھاونا کے چہرے کی بتی بجھ گئی ہے، مایوس ہے۔ ہجر کا گیت گاتی ہے۔ رونی نہیں، رلا دیتی ہے، دل روتا ہے۔" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

فرحانہ نے سوالات کیے۔ گیتوں کے متعلق اور وہ گیت کی تاریخ پر شروع ہوئے تو اپنے مخصوص لہجے میں آدھا گھنٹہ بولتے رہے، فرحانہ خوش ہوگئی۔ ابا جی اطمینان سے سنتے رہے۔

فقیہہ کی پریشانی کا خیال تھا تو راسو کو سن کر لگا کہ دکھ اس دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے دکھ، ہر کوئی اپنے حصے کے دکھ لیے اس دنیا میں پھر رہا ہے۔

راسو جی اور ابا جی کو کھانا دے کر وہ آئی اور فقیہہ کو دیکھنے گئی کمرے کی طرف تو سامنے بالکنی میں ہی فقیہہ کی پریشان صورت اور ڈبڈبائی آنکھوں کی سیدھ میں دیکھا۔ سامنے مکاری سے مسکراتا نبیل کھڑا تھا وہ درمیان میں جا کھڑی ہوئی۔

"تم؟"

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ سازشی مکاری عیاری کے عکس نمایاں تھے۔

"تم کیوں آئے ہو ہمارے گھر؟ کس لیے؟ کیسے جرأت کی۔ تمہیں پتا ہے، تمہارا یہاں آنا منع ہے۔"

"میرے دادا کا گھر ہے، آبائی گھر۔ میں جب چاہوں آجاؤں۔"

"شٹ اپ۔ تمہیں کوئی حق نہیں ہے یہاں آنے کا۔ بلاؤں کسی کو یا خود جاؤ گے۔"

فقیہہ دونوں کے درمیان سے گزر کر کمرے کی طرف جانے لگی تو وہ راہ میں حائل ہوا۔

"کہاں جارہی ہو، میری بات سنو فقیہہ! پلیز میری بات سنو۔"

"تمہیں اسے کچھ بھی سنانے کا کیا حق ہے؟" فرحانہ نے تیزی سے اسے ٹوکا۔

"میں تم سے نہیں، اس سے بات کررہا ہوں۔" وہ بپھرا۔

"شٹ اپ۔ تمہیں مجھے کچھ بھی سنانے کا کوئی حق نہیں، جو نبیل میری زندگی میں تھا، وہ مرگیا اور جو سامنے کھڑا ہے، یہ کون ہے میں نہیں جانتی۔" اس کی آنکھیں نم تھیں مگر لہجہ کھرا۔

"فقیہہ! شادی تم نے بھی کی، میں نے بھی۔ اب میں لوٹ آیا ہوں۔ تم بھی لوٹ آئی ہو۔ ہم دوبارہ۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، فرحانہ نے اسے تھپڑ جڑ دیا۔ "یہ میری طرف سے، اس کی طرف سے آنے سے پہلے نکلو یہاں سے۔"

"شٹ اپ۔ منہ بند رکھو اپنا۔ تمہیں حق کیا ہے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کا۔" وہ چلایا۔ اتنی زور سے کہ بوا نے وہیں سے دیکھا۔

"نبیل۔" انہوں نے وہیں سے آواز دی تو وہ

pklibrary.com

رکا تھا، ورنہ فرحانہ کی طرف بڑھتا اس کا ہاتھ نہ رکتا۔
فرحانہ اتنی ہی تیزی سے آگے بڑھی۔
''لعنت بھیجتی ہوں میں تم پر۔'' اس نے کراہت سے کہا اور اندر چلی گئی۔
''بہت برا کیا، بہت برا میرے ساتھ۔'' وہ رو پڑا۔ رونے والا تو نہ تھا۔
فقیہہ نے آنسو رد کے اور اندر چلی گئی۔
بوا نے نبیل کو برا بھلا کہا اور وہ بڑبڑاتا نکل گیا۔ دوبارہ آنے کی دھمکی دے کر۔
فقیہہ کمرے میں آکر رو پڑی اور فرحانہ رو بھی نہ سکی۔ بس اسے روتا ہوا دیکھتی رہی۔
''ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔ تم تو فقیہہ ہو تم کیوں رو رہی ہو۔'' لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ فقیہہ کو روتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

دو مہینے گزر گئے تھے۔ انہیں لگا جیسے دو صدیاں بیتی ہوں۔ وقت اتنی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا اور گرمی کی شدت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ فقیہہ کا کوئی رابطہ نہیں ہو پایا اور نہ ہی وہاں سے کوئی خبر لی گئی تھی۔
نبیل کے لوٹنے سے خدشات اور خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ نبیل نہ تھا کوئی دلن تھا۔ کوئی ہولناک ہیولہ تھا۔ کوئی جان لیوا درندہ ہو جیسے، اسے اب فقیہہ کی خاموشی کھل رہی تھی۔ اس نے گھر کی ذمہ داریوں میں جی لگا لیا تھا اور ابا جی چپ کر کے بیٹھ گئے تھے۔
وہ کمپیوٹر پر بیٹھی وڈیو ایڈیٹنگ چیک کرتے ہوئے سوچنے لگی کہ ابا جی سے جا کر بات کر لی جائے۔ فقیہہ رات والی بحث کی وجہ سے اب تک خفا تھی لیکن صبح یہاں سے گزرتے ہوئے وہ بھی اسے اسی طرح دیکھ رہی تھی کہ کیا تم اب ان ہی چھوٹے موٹے کاموں میں خود کو ضائع کرو گی۔
اور اس نے اس کی طرف کچھ دوستانہ انداز سے دیکھا بھی تھا کہ بات ہو سکے۔
''میں سوچ رہی ہوں، کوئی مستقل جاب ڈھونڈوں اب۔ بہت وقت غیر سنجیدگی سے مختلف کام کر کے دیکھ لیے۔ پھر یہ نیا شوق چرایا کہ اپنی مرضی کی ریکارڈنگ کی جائے۔ وہ جو لمبے لمبے نیوز ٹاک شو دیکھتے کبھی نیشنل جیوگرافک، کبھی آرٹ میوویز کا چسکہ پورا تو کبھی سوشل موضوعات پر بنے پروگرامز پر مزید سدھار کی تنقید کرتے کئی بار خواہش جنم لیتی کہ یہ سب وہ کرتی تو اس طرح کرتی۔ وہ کرتی تو ایسا ہوتا اور اب یوٹیوب کے بڑھتے ہوئے رجحان سے اس نے بھی یہ سوچا کہ کچھ کیا جائے اور ایک دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر یہ شروع کیا۔
کیمرہ اسے بھی پکڑنا آتا تھا لیکن پروگرام کی سیٹنگ، اسکرپٹ اور ضرورت پڑنے پر آواز اور ہوسٹنگ اسے کرنی پڑتی۔ اب ایک اشعر ہی فارغ رہ گیا تھا جو کسی وقت ایڈیٹنگ کر لیتا تھا اور اسے لگا اب زیادہ وقت لگانے کا فائدہ نہیں ہے لیکن راسو سے اب ملنے کے بعد اسے کچھ اور نئے خیالات آنے لگے تھے کہ ان کے علاقے میں جا کر کوئی اچھی سی وڈیو ریکارڈ کرے۔
اسے راسو کی باتیں سن کر ایک نئی طرز کی توانائی ملی تھی۔ نیا دکھ، نئے سکھ اور نئی روشنی کی جھلک دکھی تھی۔ لہجوں اور فطرتوں کی سادگی تلے زندگی گزارتے ہوئے لوگ جو اپنوں سے محبت کرتے ہیں۔ لوگ جو ذات برادری کے وفادار اور پاسدار ہیں۔ جو شدید گرمی کی تپتی ریت کے ساتھ زندگی گزارنے والے لوگ۔
وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچتی تو حیران ہو جاتی تھی لیکن اس تپتے ہوئے موسم میں جا کر کچھ بھی کام کرنا سوہان روح تھا۔ اسے راسو نے کہا تھا کہ ''جب برساتیں برس جائیں تب آیئے گا۔ تھر مسکراتا ہے سارا۔''
وہ عجیب سرخوشی سے ہمکنار تھا۔ ''برسات کے بعد کارنجھر مہکتا ہے۔ سبزہ زمین سے ابل کر آتا ہے۔ سبزہ پتھروں کی دریوں درزوں سے جھانکتا ہے۔

pklibrary.com

جہاں جہاں سے سبزے کو جگہ ملتی ہے۔ سبزہ نکل آتا ہے، امڈ آتا ہے۔"

اور وہ سبزے کے تصور سے مہک گئی، اس دن راسو بھارو کے نہ ملنے سے ناامید ہو کر نکل گیا تھا۔

راسو گیا تو زندگی پھر اسی ڈھب پر آ گئی تھی۔ وہ راسو کی کمپنی سے خوش تھی، یہ چند دن اسے خوب گھمایا پھرایا۔ فقیہہ کسی وقت ساتھ ہوتی تو کبھی گھر پر بھی لگتی۔ اس نے راسو کو مشورہ دیا کہ "بیٹی کی شادی کرلو، مت انتظار کرو بھارو کا۔ اسے جب آنا ہوگا تب ہی آئے گا۔"

ابا جی نے راسو کو بہت امید دلائی تھی کہ وہ بھارو کو ڈھونڈ لیں گے۔

بوا جی پریشان تھیں اتنے بڑے شہر میں بڑے میاں کیسے ڈھونڈو گے۔

انہوں نے اس وقت انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر راسو جی کے جانے کے بعد بوا کو تسلی کرائی کہ وہ گاڑی لے کر کہاں گھومیں گے۔ تسلی دینا تو ضروری تھا، اور جب بندہ کسی کو کچھ نہ دے سکے تو کم از کم تسلی ضرور ہی دینی چاہیے۔

اور اس نے تب ہی سوچا تھا کہ وہ خود ڈھونڈے گی بھارو کو اور اپنے طور پر سرگرداں بھی تھی، لیکن اس وقت سر پر مسئلہ تھا فقیہہ کا، جب سے بیل آیا تھا۔ اسے کھٹکا سا تھا۔ وہ دوبارہ آیا تو نہیں لیکن کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ رابطے کی کوشش کر رہا تھا، اسے ڈر تھا کہ وہ فقیہہ کو اپنی باتوں میں لگا لے گا، اسے بھٹکا نہ دے اور دوسری طرف وہ انسان جس نے پلٹ کر حال تک نہ پوچھا تھا اس کا۔

اس نے کمپیوٹر بند کرتے ہوئے ابا جی سے بات کرنے کی ٹھانی، اور وہ اسی وقت گھر پر موجود بھی تھے، انہیں نماز سے فارغ ہوتا دیکھ کر وہ اس طرف آئی۔

"آخر معاملے کو طول دینے سے فائدہ کیا ہے؟"

وہ جائے نماز لپیٹ ہی رہے تھے جب وہ ان کے پاس آئی اور سامنے بیٹھ گئی برآمدے کے پلر سے ٹیک لگا کر۔ انہوں نے تسبیح پر پھیلی جائے نماز کا کونہ موڑا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کس معاملے کو؟"

"فقیہہ کے معاملے کو۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ فقیہہ سے پوچھ لو۔ میں سوچ رہا تھا کہ انہیں وقت دیں تاکہ یہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔" پلٹ کر اس نے پوچھا نہ اس نے مڑ کر دیکھا۔

"اب ایک بوڑھے باپ سے فیصلے کی توقع مت رکھو۔"

"دو ماہ گزر گئے اسے پوچھنا ہوتا تو پوچھ چکا ہوتا، آپ رابطہ کریں بلکہ چلیں کراچی چلتے ہیں ایک بار مل لیں گے اس سے۔ ہوسکتا ہے کہ مسئلے کا کوئی حل مل ہی جائے۔"

"ہوسکتا ہے کہ بات ایک طرف ہو جائے۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔ اس سے پوچھ لو۔

"اسے اگر کچھ کرنا ہوتا تو وہ کر چکی ہوتی۔ وہ خود کو حالات پر ڈال چکی ہے ابا جی۔ فیصلہ اب ہمیں کرنا پڑے گا۔ اس کی قوت فیصلہ دکھ کھا گئے ہیں۔ انتظار کھا گیا ہے۔ امیدیں کھا گئی ہیں۔" وہ کہتے ہوئے نم لہجے کو روکنے لگی۔

"کیا میں نے اپنی بیٹی کے ساتھ اتنا برا کیا ہے فرحانہ؟ کیا میں نے بیٹی مشکل لوگوں میں دے دی ہے؟"

"اب یہ سوچنے کا کیا فائدہ۔ کون مشکل ہے کون آسان، یہ ہمیں کیا پتا۔ ہماری تقدیروں کے فیصلے ہمیشہ مقدروں پر کھیلتے ہیں۔ ہماری تقدیروں کے فیصلوں کے نتائج وقت مقرر کرتا ہے۔ ہم تو بے بس ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ چپ کر کے بیٹھ جائیں۔ آپ نے بیٹی یتیموں کی طرح دے دی۔ ایک بار بھی وہاں جا کر اس کی خبر نہیں لی۔ مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر ڈال دی۔ ماں باپ آتے جاتے رہیں تو سسرال والوں کو کھٹکا ضرور رہتا ہے کہ اس

pklibrary.com

کے کوئی اپنے ہیں، جو زندہ ہیں، اس کی فکر رکھتے ہیں۔ کچھ برا ہوا تو اڑ جائیں گے ہم سے۔"

"رہنے دو فرحانہ! بیٹی کے گھر میں دخل دو تو حالات مزید بگڑ جاتے ہیں پھر میں بوڑھا، کمزور۔ بے چارہ۔" کہتے ہوئے رو پڑے۔

"خود کو بے چارہ سمجھیں گے ابا جی تو رونا ہی آئے گا اور سوائے رونے کے کچھ ہو نہ سکے گا۔ میں بات کرتی ہوں فقیہہ سے بلکہ کہہ کے آتی ہوں۔" وہ کہہ کر آنکھ کے کنارے صاف کرتی ہوئی اٹھی اور اس کے کمرے تک چلی گئی جہاں وہ بظاہر کتابیں کھنگال رہی تھی اور در پردہ کسی اور سوچ میں تھی۔ رات ان کا تازہ جھگڑا ہوا تھا، وہ بھی نبیل کو لے کر۔ نبیل کی مسلسل اس کے فون پر کالز آرہی تھیں۔

اس نے دیکھا تو بپھر گئی تھی، یہ نہیں کہا کہ نبیل تمہیں کال کر رہا ہے، اس سے بات مت کرو، کہہ دیا کہ اب تم نبیل سے بات کرو گی؟ اور فقیہہ اس بات کو لے کر بگڑ گئی۔ یہ نہیں کہا کہ میں کیوں بات کروں گی۔ کہہ دیا کہ ہاں اگر کر رہی ہوں تو؟ جیسا سوال ویسا ہی جواب تھا۔

جیسی بات تھی، ویسا ہی تاثر تھا۔

اور پھر ایک لایعنی بحث شروع ہو گئی تھی، دونوں کے درمیان اور اس بحث کا اختتام اس بات پر ہوا کہ تمہیں کوئی حق نہیں مجھے روکنے، مجھ پر رعب جمانے کا۔

فرحانہ کو لگا جیسے کہہ رہی ہو کہ تمہیں کوئی حق نہیں ہے فیصلہ کرنے کا۔

اور پھر وہ بول نہ سکی۔ یہ جملہ حتمی تھا۔

"مجھے کوئی حق نہیں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا۔" وہ آ کر کھڑی ہوئی اس کے برابر میں۔

فقیہہ نے اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ کتاب کے سرورق پر ٹھہر سے گئے۔

"میری بات سنو۔ ایم سوری۔ رات جو بھی کہا سنا۔ میں چاہتی ہوں فیصلہ تم کرو لیکن سوچ لو، اچھی طرح سے۔ عبید بھی اور نبیل بھی۔ جہاں تمہیں آسانی لگے، جہاں تمہارا دل مانے۔ ہم کل جائیں گے عبید سے بات کرنے۔ میں چاہتی ہوں وہ سب سوچو جو تم دونوں کے درمیان تھا۔ اچھا بھی اور برا۔ اور وہ بھی سوچو جو نبیل اور تمہارے درمیان تھا۔ شاید کچھ اچھا ہو لیکن بہت کچھ برا۔"

فقیہہ نے اس کی طرف بے چینی سے دیکھا۔

"فرحانہ! پلیز۔"

"میں کوئی بحث نہیں کر رہی فقیہہ! بس سمجھا رہی ہوں۔ نبیل کے اندر بہت شر ہے۔ اس نے کیسے تمہیں آسانی سے چھوڑ دیا تھا اور واپس چلا گیا تھا اور تمہیں ایسے محسوس کرایا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور اب جب وہاں سے ناکام ہو کر شادی توڑ کر لوٹا تو یہاں لڑکیاں تاڑنے لگا۔ وہ ہمارے گھر کی ملازمہ تھی جس کے ساتھ اس کا چکر چلا، لڑکی بھگا کر لے گیا، بتاؤ فقیہہ! کوئی ایسے بھی کرتا ہے کیا۔ اتنا بے بھروسا آدمی، اور اب جو اسے پتا چلا ہے کہ تم آئی ہو اور کچھ برا ہوا ہے تمہاری زندگی میں تو اسے یکدم ہی، پرانی محبت یاد آ گئی۔ یہ کیسی بددیانتی ہے فقیہہ! سوچو تو..... یہ کیسا فریب ہے جو عمر بھر اس نے دیا بھی ہے اور تم نے لیا۔ کب تک فریب میں جیو گی۔ کب تک فریب کے اندر رہو گی۔ اپنے لیے راستہ تلاش کرو۔ اپنے لیے راستہ دیکھو۔ خود سوچو فقیہہ! کیونکہ جب فیصلے کا وقت ہو اور تب فیصلہ نہ کیا جائے تو نقصان ہوتا ہے۔ پھر حالات فیصلہ کرتے ہیں اور آپ کو وہ فیصلہ ماننا پڑتا ہے۔"

کتاب اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی تھی۔

"جتنا حوصلہ ہو گا اتنی آسانی ہو گی۔"

"مجھے آج وڈیو کی ایڈیٹنگ کے بعد بھارو مل کا پتا مل گیا ہے، مجھے اس سے ملنے جانا ہو گا، ابا جی کا حکم ہے، اور میں چاہتی ہوں اس بندے سے مل کر اسے واپس جانے کے لیے قائل کروں۔ ہو سکتا ہے، وہ میری بات نہ سنے، نہ مانے۔ لیکن ابا جی کو وہ جانتا

pklibrary.com

Monthly Shuaa July 2021

ہے، عزت کرتا ہے ان کی۔ ہوسکتا ہے اسے یہاں لے آؤں اور پھر ایک دو دن میں ہم کراچی جائیں۔"

"تم لوگوں کو وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابا جی تھک جائیں گے سفر سے، اور سفر بھی وہ جو خدشات والا ہو۔ اور پھر عبید کا رویہ اتنا حوصلہ مند نہیں ہوگا تو وہ اور ٹوٹ جائیں گے۔ میں کوشش کرتی ہوں اس سے بات کرنے کی۔" یہ سب کہتے ہوئے اس کے لہجے میں نمی تھی۔

"تم کیا سوچ رہی ہو اس وقت، مجھے بتاؤ۔" اس نے فقیہہ کا ہاتھ تھاما۔ "دیکھو، ہم دوست بھی تو ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ کہ تم فقیہہ ہو، میں فرحانہ ہوں۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ بس یہ یاد رکھو کہ ہم دونوں دوست ہیں۔ بچپن کی، جو ساتھ کھیلتے تھے۔ ہم دوست ہیں جو ساتھ بڑے ہوئے۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے کھلونے شیئر کیے ہیں۔ کھانا شیئر کیا ہے۔ چیزیں شیئر کی ہیں۔ تم نے ہمیشہ میری ٹیپ کیسٹ توڑی تھی۔

تم نے میری نئی ویڈیوز کا ستیاناس کیا تھا۔ میں نے ہمیشہ تمہاری کتابوں پر پانی یا انک گرائی تھی۔ میں نے تمہارے نئے دوپٹے کی لیس ادھیڑی تھی۔ میں تمہارے کپڑے بے ڈھنگے انداز میں استعمال کرتی تھی اور تم میری بانسری، باجا، یا پیانو توڑ دیتیں، ہم ساتھی تھے۔ اسکول سے کالج تک۔ ہمارا تیسرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔ ہم دو ہی تھے۔ ہم دو ہی ہیں۔ تم اور میں۔ فقیہہ اور فرحانہ۔"

وہ لمحے کو رکی، اور فقیہہ نے اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

ہم دو ہی ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہیں تھا اور ابا جی ہمارے اوپر ہیں۔ بوا تو ہمیشہ ہی نیچے رہیں کبھی منوا نہ سکیں اپنی، ہم نے سدا اپنی من مانیاں کیں۔ ہم نے بچپن بہت اچھا گزارا۔ ہم نے ٹین ایج اچھی گزاری، ہم نے بہت وقت ساتھ گزارا اچھے والا۔ پھر ان چند سالوں نے کیوں ہمیں تھکا دیا ہے۔ میں زندگی سے نکال دینا چاہتی ہوں وہ لمحات جو قاتل تھے جن میں، میں نے نبیل سے محبت کی۔ جن میں بچپن کا نبیل جوان ہوگیا تھا اور وہ محبت کا جال بچھا رہا تھا اور پھر ترجیحات کی طرح محبت بدل دی اس نے اور اب پھر وہ میری زندگی میں کانٹے بو رہا ہے۔ میں نفرت کرنا چاہتی ہوں اس سے فرحانہ! سخت نفرت۔"

فرحانہ اسے ساتھ لگائے بیٹھ چکی تھی۔

"میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم اس سے نفرت کرو لیکن وہ اس کے قابل بھی نہیں لگتا مجھے۔ تکلیف دیتا ہے وہ مجھے۔ جب تمہارے پیچھے پڑ جاتا ہے۔"

"لیکن میں عبید کے پاس بھی نہیں جانا چاہتی فرحانہ! اسے میری قدر نہیں ہے۔ اس نے ایک دن بھی میری قدر نہیں کی۔ میں نے اس کے گھر کا خیال رکھا، اس کا خیال رکھا۔ لیکن وہ دو مرد بس مجھ پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ انہیں ان سیکیورٹی تھی کہ ایک عورت ان پر سبقت نہ لے جائے۔ وہ ڈرتے تھے۔ اور انہوں نے مجھے دبا کر رکھا۔

تمہیں پتا ہے فرحانہ! ایک بار عبید مجھے باہر کھانے پر لے گیا تھا۔ اس دن میں بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ اس دن میں خوش تھی بہت، ہم جب واپس آئے تو عبید کو کمرے میں بلا کر میرے سسر نے کہا کہ ایک عورت کو تم سر پر بٹھا رہے ہو، اب وہ تم پر حکومت کرے گی، اسے دبا کر رکھو، اسے اہمیت نہ دو، اسے سر نہ چڑھاؤ، اور اس کے بعد کبھی عبید نے گھر میں ہنس کر بات تک نہ کی مجھ سے۔ ہمیشہ ایک رعب، ایک خاموشی، ایک رعب دبدبہ، ایک سنجیدگی کا تناؤ رہا ہمارے درمیان۔ جو فاصلے بناتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے لگا کہ کام تو گھر کے نوکر بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ میری اتنی بھی کیا ضرورت، پھر میں کیا کرتی بتاؤ؟"

"تم اس سے لڑیں نہیں؟"

"لڑنا؟ کیسا لڑنا فرحانہ! جہاں اجنبیت کی دیواریں ہوں وہاں لڑائی کیسی۔ وہاں لڑنا کیسا۔ جہاں محبت ہی نہ ہو، وہاں کون پگھلے گا۔ کون پلٹے گا۔

pklibrary.com

کون آواز دے گا یا پھر سنے گا۔ میں تھک گئی ہوں فرحانہ! ایک سوال کرتی ہوں تم سے۔ کیا ضروری ہے کہ بندہ شادی کرے؟ کیا ضروری ہے کہ کوئی ساتھی ہو۔ کیا ضروری ہے کسی کو سر پر مسلط کرنا۔ کیا یہ سب ضروری ہے؟ مجھے اب کسی کے ساتھ نہیں رہنا۔ کسی کا نہیں سوچنا۔ میں تھک گئی ہوں فرحانہ! میں اب اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔ یہاں رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارے اور ابا جی کے ساتھ۔ جہاں کوئی اجنبیت نہیں۔ تناؤ نہیں، رکھائی نہیں۔ عبید جیسی لاپروائی نہیں ہے۔ جہاں کوئی فریب نہیں نبیل جیسا۔ کوئی دھوکا نہیں، کوئی جھوٹ نہیں۔ کوئی جھوٹا دعوا نہیں، کوئی مصیبت نہیں۔ مجھے سکون چاہیے فرحانہ! مجھے سکون چاہیے بس۔ مجھے وہ لادو۔"

وہ بول بول کر تھک چکی تو اس کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو جذب کر کے اپنے اندر اتار لیے۔

اور پہلی بار تھا کہ فرحانہ کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا یا پھر اسے خاموشی ہی بہتر لگی، اس نے فہیہ کو بظاہر تھام رکھا تھا اور ایک تسلی اپنے لیے بھی رکھی، زندگی کس قدر الجھاوے پر اڑی تھی۔

☆☆☆

کھڑی نیم کے نیچے ہوں تھاں ہیکلی
جاتر دو اتارو مانا چھانی مانی دیکھ لے

(میرے پریتم تیرے نیم کے نیچے میں اکیلی کھڑی ہوں، پریشان ہوں کہ کوئی آنے جانے والا دیکھ نہ لے، اب تو ہی بتا، تو نے مجھے یہ دوچھوڑا کیوں دیا ہے۔)

تھاناں پچھاں چھیل بھمر یا ہیکلی
مانا چھانی مانی دیکھ لے

مائی بھاگی کے گیت کا ردھم بھاؤنا کی آواز میں پھیلا ہوا تھا۔ گھر میں شادی کا ماحول تھا اور بھاونا نے گیت ہجر کا گایا ہوا تھا۔ اتنی افسردگی میں مدھم دکھتے جذبے کی لو۔ مائی نے شکوے سے بھاؤنا کو دیکھا کہ یہ تو چاؤ کا موقع ہے، تو نے کیا تھی گا رہی ہے۔

جھر مر جھر مر مینھ لا برسیں پون ہینڈولا کھائے
مور پپیہا بیٹھا بولین، کوئل شور مچائے
(رم جھم برسات برس رہی ہے، ہوا جھومنے لگی ہے، مور پپیہے بیٹھا بولتے ہیں
اور مجھے تیری راہ دیکھی ہے)

انتظار جب طویل ہو جائے تو یا تو ختم ہو جاتا ہے یا پھر ہمیشہ پر محیط ہو جاتا ہے۔

زندگی عجیب سرگم کھیل رہی تھی
اس پر مائی کی نگاہ پڑی تو ٹھہر سی گئی

گھر میں خوشی کا ماحول، ڈیلیاں روشی روشی اور بھاؤنا افسردہ، مائی فکرمند، بھرجائی کا دل ملول اور راسو جی نے سوچا۔ کیسے خوشی کی جائے۔ کیسے منائی جائے، کیسے رچایا جائے لیکن تاریخ رکھ لی تھی۔ آج رات مایوں کی رسم تھی اور بھارو کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔

ایک اکیلا میں، نہ کم کاج میں کوئی ساتھی، نہ سنگی، ماں تو نے تو دو جنے تھے پھر میں ایک کیسے ہو گیا۔ پھر یہ سب کیسے ہوا، بھارو اتم انجان کیسے ہو پوری فیملی سے گھرے۔ اپنے لوگوں سے، ضد کوئی اتنی بھی بڑی ہوتی ہے کیا کہ بندہ چھوٹا پڑ جائے، بندہ کم ظرف ہی ہو جائے۔ کوئی یاد کرے تو پہنچی نہ آئے۔ راسو نہ سہی تجھے بھاؤنا بھی نہ کھینچ سکی ہے۔ تیری لاڈلی بھتیجی کا ویاہ ہے بھارو، تو کیا اس میں بھی نہیں ہوگا۔ سر پر ہاتھ نہیں رکھے گا۔ آسرا نہ بن، ساتھی تو بن بھائی تو بن، بھارو تو بن۔ اور جب بھارو کہا تو آنکھیں بھیگ گئیں۔ ماں نے دیکھا اور ماں جو پہلے اداس تھی سو مزید ہو گئی۔

"راسو! دل نہ چھوٹا کر، بھارو جو لوٹا تو صبح کا بھولا۔ جے (اگر) نہ آیا تو ماں نہ اس کی نہ بھا۔ نہ بھرجائی، نہ بھاؤنا۔"

بھاؤنا پر مائی کی آواز دھیمی ہوئی اور اس کے لسی بلوتے ہاتھ تھم گئے۔ وہ جیسے ٹھہر سی گئی، رک سی گئی، لسی کی چھاج جو نکالنی تھی۔ مکھن کی صورت اوپر ابھر ابھر کر آ رہی تھی۔ وہ نکالنا بھول گئی۔ مائی میں گم ہو گئی، اور مکھن ایسے ہی گھل گیا تھا، دانہ دانہ ہو کر، پھیل گیا۔ گھل گیا۔ لیکن اس کی حلاوت رہی، ملاوٹ

pklibrary.com

رہی۔ بھاؤنا تو گاتی بھارو کے لیے تھی، بھارو تو نے تو بھاؤنا کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا، وہ دکھی تھی۔

گیت کے بول چپ ہو گئے تھے، خاموشی سارے میں پھیل گئی اور بھر جائی نے تھال اٹھا کر کچے فرش پر رکھا اور تھکے ہوئے انداز میں اندر کمرے میں ڈیلاں کے پاس گئی جو پہلے ہی چارپائی پر اوندھی خفا خفا سی لیٹی ہوئی تھی۔

وہ بیٹی کے برابر آ بیٹھی، سر پر ہاتھ پھیرا، بال ہٹائے۔

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''ڈیلاں، او ڈیلاں۔''

پیار سے پکارنے لگی تو ڈیلاں نے سر اٹھا کر شکوے سے ماں کو دیکھا۔

''اٹھ تجھے بتاؤں۔ تیرے پیو نے تیرے لیے ٹی وی خریدنے کا کہا ہے۔ دعا کر ٹریکٹر بک جائے۔ سودا ہو جائے۔ تجھے ٹی وی کے ساتھ ٹیپ بھی دوں گی۔ بہت اچھے جوڑے لیں گے سوہنڑے سوہنڑے۔ ادی کو کہا ہے۔ ادی سادھنا لے آوے گی۔ تیرے لیے پائی پائی جوڑ کر رکھی ہے ماں نے۔ شہری کپڑے منگائیں گے اور جوتے بھی، تو اٹھ تو سہی۔ چری، دیاہ اچھا ہے بڑا تو بڑی بھاگوں والی ہے۔''

''نہ اماں میں ڈیلاں ہوں، ناں مت بدل میرا میں تو بس ڈیلاں ہوں، ڈیلاں،
اچھا چری (پگلی) تو چری ڈیلاں ہی ہے۔''

''چری نہیں بس ڈیلاں۔''

''ہاں نی بس ڈیلاں، ڈیلاں ہے تو میری چاندنی، میری مٹھی، میری من موہنی، میری سوہنی، میری ڈیلاں۔'' ماں نے اس کے پورے بال چہرے سے ہٹا کر پیچھے ربڑ میں جکڑے اور اس کی کشادہ پیشانی پر ایک جان دار بوسہ دے کر اسے گلے لگایا۔

''میلے رنگ کے گج (کڑھائی دار گلا) کے شیشوں میں ڈیلاں کے چہرے کا عکس بٹ گیا تھا۔ دھاگہ میلا ہو گیا۔ رنگ پھیکے پڑ گئے مگر شیشہ جیسے پیوست تھا کپڑے کے جال میں۔ ڈیلاں نے ماں کے پسینہ ہوتے وجود کی مہک میں اپنا آپ چھپایا ہوا تھا جہاں اپنائیت کا ایک دیس بستا تھا۔ ڈیلاں تھی اور اور ماں کے وجود کی مہک، جیسے کوئی آسرا، جیسے کوئی امید کا سرا، وہ بچی تھی، بہل گئی۔

ماں کا دل اداس بھی تھا۔ وہ کم عمری میں گھر سے جا رہی ہے، اور خوش بھی کہ وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی۔

''اس کا راضی ہونا کتنا آسان تھا یک دم ہی ماں کو احساس ہوا، اور بھری آنکھوں کے چشمے سے آنسو امڈے تو اندر آتا را سوٹھنکا۔ پہلے بیوی کے چہرے کو دیکھا اور آ کر چارپائی پر ساتھ بیٹھا۔ بیٹی کے پشت پر بال سہلائے۔ ''ڈیلاں، میری دھیڑی۔ (بیٹی) امڑی (ماں) مٹھڑی (میٹھی) سوہنڑی۔''

وہ مڑ کر باپ کے ساتھ لگ گئی۔

''بابلیا!'' کس کر بانہیں ڈال دیں گلے میں۔

بابلیا کھل اٹھا، اور ماں پیو بیٹی کے لاڈ اٹھانے کے لمحے قیمتی جان کر گزارنے لگے۔ اس کے بعد پتا تھا، وہ کبھی کبھار آئے گی۔ مہمانوں کی طرح رہے گی۔ پر آسودگی بھی تھی کہ خوش ہو گی۔ گھر بسائے گی۔ بسی رہے تو کتنا اچھا، دعائیں تھیں جو آنسوؤں کے گولوں کا بار سہہ جاتی تھیں۔ امیدیں تھیں جو آس بن کر سہارا ہونے لگتیں۔

اور جیون کو جیسے کوئی ٹھنڈا سا آسرا مل جاتا تھا۔

☆☆☆

''عبید! میں جب آپ کی زندگی میں شامل ہوئی۔ مجھے لگا سب نارمل ہے، لیکن سب نارمل نہیں تھا۔ انکل کے لیے آپ، آپ کے لیے فقط انکل تھے اور ان دو کے بیچ میں ایک اکیلی عورت تھی۔ میں کیا کر لیتی۔ میں کیا کر سکتی تھی۔ فقط آپ کو اپنا بنانے کی کوشش یا پھر آپ کو خوش رکھنے کی کوشش۔ میں ابھی خوش رکھنے کے مرحلے میں تھی۔ مجھے ابھی یہ نہیں پتا کہ خوش ہوا کیسے جاتا ہے۔''

اسے یاد آیا..... یاد آیا کہ اس نے کیسے خیال رکھنا چاہا تھا۔ وہ ہر وقت اس خدشے میں گھرے رہتے کہ کہیں عبید بیوی کا ہو کر ان سے الگ تھلگ نہ ہو جائے بالکل ہی انہیں نظر انداز کرنا نہ شروع کردے۔ وہ عبید کی غیر موجودگی میں اسے جھڑکتے تو نہیں لیکن یکسر اجنبیت سے بات کرتے اسے ہمت نہ ہوتی کہ ان کے کمرے میں جا کر ان سے بات کرتی۔ ان سے دوستی ہو پاتی۔ وہ باپ جیسی اپنائیت تو کبھی نہیں ان میں وہ محبت، وہ شفقت، ہر وقت جیسے اپنے دائرے میں رہتے۔ ہر وقت ایک لیا دیا رویہ۔ جو اس نے کبھی اپنے باپ چچا میں نہیں دیکھا اور اس رکھائی نے بس اسے مجبور کیا کہ کام سے کام رکھے اور ہر جگہ جیسے ایک حد مقرر تھی۔ اوپر سے عبید بھی ایسا تھوڑا فریک ہونے ہی لگتا کہ جیسے اسے کوئی طاقت جکڑ لیتی۔ بس روکھا سا ایک تعلق تھا جس میں کوئی ہم آہنگی کوئی شگفتگی نہ تھی۔ کوئی ہنسی مذاق۔ کوئی دوستی نہ تھی۔

بس ہمراہی تھی۔ وہ بھی ایسی وہ اکثر سوچتی کسی سے شیئر کرے لیکن کس سے فرحانہ..... نہیں اس کے سامنے تو پھر ایک ایک لفظ، نکتہ بہ نکتہ واضح کرنا پڑتا۔ پھر اس کے سوالات، پھر ابا جان۔ کہیں انہیں کوئی معمولی بھی بے رنگی کا احساس نہ ہو۔ دل کٹتا جائے گا اور پھر تعلقات کو اسی سرد مہری کے ساتھ اس نے قبول کرنا شروع کیا۔

بس کسی وقت مدھم مسکراہٹ کسی وقت ایک ہلکا سا جواب، نہ اس گھر کے وہ دو افراد۔ شور کرتے۔ نہ ڈانٹ ڈپٹ۔ بس انہیں پسند نہ تھا کہ کوئی زیادہ ان کے قریب آئے۔ نہ ان کی کمزوریوں پر نظر رکھے، نہ ان پر کہیں سبقت لے جائے۔ بس اسے رہنا ہے تو اسی خول کے اندر رہے۔

اس نے سوچا کہ اولاد ہوگی تو نرمی بھی ہو جائے گی لیکن قدرت کی طرف سے اس مہربانی میں بھی دیر تھی۔ وہ بس زندگی گزار رہی تھی، زیادہ تر وقت گھر میں، گھر کے کام کاج کی نگرانی، ذمہ داری، پودوں کی رکھوالی، گھور خاموشی جیسی زندگی میں اگر اچانک ارتعاش آیا بھی تو ایسا، جو مزید کاٹ پیدا کردے، جو فاصلے بڑھا دے، جو فیصلے کو حتمی شکل دے دے۔

''عبید! میں جس کلاس سے تعلق رکھتی ہوں۔ وہاں بیٹیوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ خوش رکھنا پہلی ترجیح ہے اور پھر خوش رہنا نصیب کے ساتھ ہے جو کہ پہلی ترجیح کا اجر ہو سکتا ہے، خوش رکھو گے تو خوش رہو گے۔ اس نتیجے کو آگے بڑھایا۔

اور بچپن میں، میں سمجھتی تھی کہ جو خوش رکھتا ہے اسے آپ ہی آپ سب مل جاتا ہے۔ کھانے کھلونے، کتابیں سب، لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

عبید یہ سب وہ باتیں ہیں جو میں نے آپ کے ساتھ کبھی شیئر نہیں کیں کیونکہ ہماری ذہنی ہم آہنگی ہی نہیں۔ اب چونکہ الگ ہی ہونا ہے اگر تو میں چاہ رہی تھی کہ ہمارے پاس کچھ اچھی باتیں اور یادیں بھی ہوں جو بعد میں ہمیں یاد آئیں تو ہمیں خوشی کا کوئی احساس چھو کر ضرور گزرے۔ میں ویسے فرحانہ کی نسبت کم بولتی ہوں لیکن جب باتیں خزانے کی صورت جمع ہوں اور آپ تجوری کھولیں تو یک لخت ہی خانہ الٹ جاتا ہے۔ آپ سمجھیں ایسا ہی معاملہ ہے۔ آپ سمجھیں ایسا ہی ہوا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ سوائے ان اچھی چند باتوں کے۔ میرے گھر والوں کو آپ کا انتظار ہے لیکن آپ وقت لے لیں۔ بس جو فیصلہ ہو، وہ بتا دیجیے گا۔ اچھا ہے کہ انسان ایک دوسرے کے لیے معاملات کو آسان کردے۔

کم از کم آخری معاملات تو اچھے ہونے چاہئیں۔''

اس نے میل کر کے، ایک لمبی سانس لی، اور کھلی کھڑکی سے ابر آلود آسمان کو دیکھا۔

سامنے چچا کے گھر کا مین دروازہ کھلا تھا۔ ان کے کمرے کی کھڑکی کے عین سامنے کھلتا تھا۔ نبیل اپنا فون اٹھا کر عجلت میں نکل رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے کچھ لمحے رکا، اسے دیکھنے لگا۔

pklibrary.com

وہ ذرا ہٹ گئی کھڑکی سے۔
وہ آ کر کھڑا ہوا باہر لیکن کھڑکی کا پٹ اس نے فقط اتنا کھلا چھوڑا کہ ہوا اور روشنی آ سکے، آگے جالی تھی۔
اس کا فون بجا۔
دیکھا تو نبیل کا ٹیکسٹ تھا۔ ''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ بات کرتے ہیں، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''
لیکن اس نے میسج کا کوئی جواب نہیں دیا۔
دوبارہ آیا میسج۔ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''
اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا وہ سامنے کھڑا تھا اور کھڑکی کھولنے پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی مکاری والی۔
اس بار اس نے ذرا زور سے کھڑکی بند کی اور مڑ گئی۔
اب اسے پتا تھا کہ میسج پر میسج آئے گا۔
میل باکس میں لیکن میل ڈلیور ہونے کے بعد بھی۔ اس شخص کا کوئی اتا پتا نہ تھا، جس کے آگے دوبارہ سر خم کیا تھا۔

☆☆☆

گاڑی کی فضا خنک تھی، بھارو اس کے دائیں طرف بیٹھا تھا۔
وہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ اسے بہت اچھا لگا، ایک شہری لڑکی کو یوں ڈرائیو کرتے دیکھ کر، وہ شہر میں ایسی کئی عورتیں دیکھ چکا تھا، لیکن اسے فرحانہ سب سے ہٹ کر لگ رہی تھی۔
''ادی! آپ بہت بہادر عورت ہیں۔'' وہ کافی دیر بعد گویا ہوا۔
وہ مسکرائی۔ ''میں بہادر ہوں وہ بھلا کیسے؟''
''آپ ریڈیو والے بھائی سے کتنی بہادری سے بات کر رہی تھیں۔''
وہ ہنس پڑی۔ بھارو بھی سادگی میں راسو جیسا ہی تھا۔ بس کچھ زیادہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار لگتا تھا لیکن تحمل راسو میں کہیں زیادہ تھا۔
آج اسے اچانک ریڈیو اسٹیشن سے کال آئی تھی پروگرام کرنے کے لیے اور وہ بھارو کو فیکٹری سے لے کر وہاں چل پڑی کیونکہ اسٹیشن راستے میں ہی پڑ رہا تھا۔
اس کا انٹرویو بہت تسلی بخش ہوا تھا۔ اگلے ہی دن اسے جوائن کرنے کے لیے کہا گیا مگر اس نے ہفتے بھر کا وقت لیا تھا۔
اس کا ارادہ تھا کہ پہلے فقیر کے معاملے پر کوئی رائے آ جائے، یا وہ جا کر ملیں، یا عبید کو بلائیں، پھر کسی کام پر سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔
بھارو سے تھر کے لوک گیت اور راسوڑوں سہروں پر بات ہو رہی تھی۔ وہ ایک کتاب ترتیب دے رہا تھا لوک گیتوں پر۔ فرحانہ نے اس سے گیتوں کی دھنوں پر کام کرنے کا کہا۔ وہ اس کے لیے شہر میں کام نکال رہی تھی، اور اسے گاؤں واپس جانے کی صلاح بھی دے رہی تھی۔
''بھارو! تم بہت اچھے انسان ہو۔ معاف کرنا اب، یہ آپ جناب مجھ سے زیادہ دیر تک نہیں ہو سکتا کیوں کہ مجھے لگتا ہے ہم عمروں میں بھی تقریباً برابر ہی ہوں گے تو تم کہا جا سکتا ہے۔''
''ادی جو آپ کا من کہے وہ کہیں۔''
اس کی بات پر وہ مسکرائی۔ ''مجھے تھر کا ایک گیت بہت پسند ہے بھارو!'' اس نے ٹیپ ریکارڈر چلایا تھا۔

کھڑی نیم کے نیچے ہو تو ہیکلی
بھارو نے ہاتھ بڑھا کر ریکارڈ بند کیا

فرحانہ نے سوالیہ نظر اس پر ڈالی تو اس نے رخ بدل لیا تھا کھڑکی کی جانب۔
''یہ گیت دکھ دیتا ہے ناں؟'' اس نے پوچھا جب چہرے کے تاثر نہ پڑھ پائی تو۔
''نہ ادی! یہ گیت میری بھاؤنا نے ایک بار گایا تھا۔ جب میں دیر سے گھر پہنچا۔ ہو سکتا ہے وہ اب بھی ہجر کے مارے یہ گیت گاتی ہو۔''
''بالکل ہو سکتا ہے ادا بھارو!''

''ہاں، ہوسکتا ہے جیجی (محترم)۔'' وہ نم آنکھوں سے مسکرایا تھا۔ ''میرے کو پتا ہے، وہ مجھے یاد کرتی ہوگی۔''

تمہاری بھتیجی کی شادی تمہارے بغیر ہوگی بھارو! کتنا دکھ ہورہا ہوگا ان سب کو۔''

''ہاں جیجی۔ امڑی تو مجھے مار دے گی۔ ہتھ سے نہ مارے تو نظر سے مارے گی۔ گرا دے گی نظر سے۔''

''بھارو! تم کیوں آئے یہاں۔''

''جیجی تھر سوکھ رہا ہے کوئی روزگار نہ تھا۔ کھیتی برباد ہورہی تھی۔ روزگار کے لیے آرہا تھا پر ان سب نے ایسی ضد پکڑی کہ ضد میں نکل آیا۔''

''بھاونا یاد آتی ہے؟''

''یہ کوئی پچھنے کی گل ہے جی، یاد تو سبھی آتے ہیں جی۔''

''تمہاری کوئی اولاد نہیں۔ بھاونا کا علاج کیوں نہیں کروایا؟''

''ادی! بھاونا کے بڑے علاج کروائے۔ عمر کوٹ شہر بھی لے گیا۔ ڈاکٹرنی کو دکھایا، دائی کے ٹوٹکے کروائے، ایک بچہ ہوا مرا ہوا۔ وہ بھی ہجرت میں، جب بیراج کی طرف ہم ہجرت کرکے آرہے تھے۔ راستے میں بچہ ہوا جیجی۔ راستے میں اسے دفن کیا۔ علاقہ چھوڑ کر بدین سے قریب آکر بیٹھے، جب قحط چھٹا، برسات ہوئی۔ واپس جانے لگے تو بھاونا راستے میں قبر پر اتر گئی۔ اس نے بچے کی قبر پر وہ رومال چڑھایا جو خود سوئی سے ٹانکا تھا۔ اور اتنا روئی، اتنا روئی کہ میں نے سوچا اسے اب نہیں رلانا۔ ادی! کیا فائدہ پھر مرا ہوا بچہ ہو۔ میری بھاونا روئے۔''

''ہر بار ایسا نہیں ہوتا بھارو! تم دعا کرو ہوسکتا ہے کہ اب کی بار ایسا نہ ہو۔ کبھی تو خوش حالی بھی آتی ہے ناں۔''

''ادی بس پھر نہ بھاونا نے کہا۔ نہ میں نے۔ قدرت کی طرف سے بھی کچھ نہ ہوا۔ ہم کیا کرتے۔ بس ادی سب نصیبوں کا کھیل ہے یہ۔''

''بھارو ہم تمہارے گاؤں میں آکر گیتوں پر ریکارڈ کریں گے۔ بہت مزا آئے گا۔ اس بار تو برسات کا امکان بھی ہے۔''

''ہاں جیجی! بس روزگار اچھا مل گیا ہے ادھر۔ ڈیلاں کی شادی کب ہے؟ ادا راسو نے کیا بتایا؟''

''راسو جی نے شاید یہی تاریخیں بتائی تھیں۔''

''جیجی مجھے ذرا آگے اتار دو۔''

''کیوں؟''

''بس جیجی میں پیسے نکلوالوں۔''

''تم نے بینک میں پیسے رکھے ہیں؟''

''ہاں جیجی! مجھے تنخواہ ملتی ہے تو بینک میں رکھتا ہوں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ بہت سارے پیسے جمع کرکے جاؤں گا تو انہیں یقین آئے گا کہ بھارو شہر میں جھک نہیں مار رہا تھا۔ پر اب آپ نے بتایا کہ ڈیلاں کی شادی ہے تو اب جانا پڑے گا۔ ڈیلاں تو بہت چھوٹی ہے۔ راسو نے بڑی جلدی اس کے ہاتھ پیلے کرنے کا سوچا ہے جی۔''

''ہاں یہ تو ہے، خیر اچھا ہے ناں۔ وہ مطمئن تو ہوں گے۔ پھر اگر تم جاؤ گے تو ان کی خوشی دوبالا ہوجائے گی۔ یہ بہت اچھا وقت ہے بھارو لوٹنے کا۔''

اس نے گاڑی روکی۔ اے ٹی ایم مشین کے سامنے فٹ پاتھ پر۔ وہ نیچے اترا۔ کچھ دیر بعد آیا اور اپنا پرس اسے تھمایا۔

''جیجی یہ آپ اپنے تھیلے میں رکھو مجھ سے چھن نہ جائیں۔ کل میرے ساتھ خریداری پر چلیے گا پھر واپسی میں بس ریل کے اسٹاپ تک چھوڑ دیجیے گا۔''

''ارے واہ! تم نے واقعی جانے کا فیصلہ کرلیا ہے ناں۔''

''ہاں جیجی! فیصلہ تو اب کرنا ہی پڑ گیا۔''

''شکر ہے بھارو! اباجی سن کر بہت خوش ہوں گے۔ یقین کرو اور اس سے کہیں زیادہ تمہارے گھر والے۔ لیکن سب سے زیادہ بھاونا خوش ہوگی۔''

pklibrary.com

''مجھے پتا ہے جی۔ بھاؤنا تو بڑی خوش ہوگی۔ پہلے نخرہ کرے گی۔ پھر ہنس پڑے گی۔ ایسی ہی ہے وہ۔''

بقیہ سفر میں وہ مسلسل اس سے بھاؤنا کی باتیں کرتا رہا اور گھر آنے کے بعد فقیہہ نے سوچا کہ یہ تو ہر کسی کو دوست بنا لیتی ہے۔ فرحانہ کے سحر سے کوئی کیوں نہیں بچتا۔

☆☆☆

وہ آیا ہوا تھا، خاموش تھا، بس سن رہا تھا، ابا جی نے بھی کوئی زیادہ شکوہ شکایت نہیں کی، نہ کوئی گلہ، بس پوچھا ''میاں کیسے ہو؟''

''میاں کام کیسا چل رہا ہے؟''

فرحانہ انتظار کرتی رہی کہ وہ بات کریں جو بہت ضروری ہے، اور وہ فرحانہ کو نظروں ہی نظروں میں چپ رہنے کی تنبیہہ کرنے لگے تھے،

''ایک بار بھی آپ کو فکر نہیں ہوئی فقیہہ کی کہ خبر ہی لے لی جائے۔'' وہ بالآخر کہاں تک چپ رہ سکتی تھی۔

''فقیہہ اپنے والد کے گھر تھیں۔ ظاہر ہے خیریت سے ہوں گی۔'' اس نے بڑے تحمل سے جواب دیا تھا۔

فرحانہ مزید کچھ کہتی کہ ابا جی بول پڑے۔

''ہاں بیٹا! بالکل۔ باپ کے گھر میں کون خیریت سے نہیں ہوگا لیکن جب خیریت کو شوہر کے گھر سے جوڑا جائے تو پھر عورت کی خیریت وہاں سے زیادہ منسوب ہو جاتی ہے۔''

''وہ سمجھ دار ہیں، راستوں کا پتا ہے، میں نے سوچا پہنچ گئی ہیں تو، واپس بھی آ جائیں گی۔''

وہ بہت تحمل اور دھیمے لہجے میں بولتا تھا، اور عذر ایسا پیش کرتا کہ اپنی بچت کرا جاتا، اس طرح سے بھی کبھی اس نے سوالوں کے جواب نہیں دیے تھے۔

''آپ کہہ سکتے تھے اسے واپسی کا۔'' فرحانہ جھٹ سے بولی۔ ''وہ آ جاتیں۔''

''کس منہ سے؟ جب راستے الگ کرنے کی بات ہو چکی تھی، ساتھ رہنا مشکل ہے کا اظہار ہو چکا تھا۔''

وہ کیونکر چپ رہتی۔

''میں ان پر زبردستی نہیں کرنا چاہتا، جو وہ چاہیں۔ مجھے منظور ہے۔۔۔''

''کیوں؟ آپ کی کوئی رائے، کوئی چاہ نہیں ہے؟ یا اب تک آپ دوسروں کے فیصلے پر سر جھکاتے ہوئے آ رہے ہیں؟''

''فرحانہ!'' ابا جی نے ٹوکا۔

''بس کر دو۔''

''میں ان سے بات کرنا چاہوں گا۔'' وہ بولا۔

''ضرور اگر اس کی ہمت ہے تو کمرے میں جا کر ملنا پسند کریں گے یا کٹہرے میں کھڑا کریں اسے؟''

''فرحانہ!'' اس بار انہوں نے ذرا سختی سے ٹوکا لیکن اس پر ذرا اثر نہیں ہوا۔

''میں جانے سے پہلے ان سے بات کروں گا، چاہے تو بلا لیں، چاہے تو بتا دیں، جہاں ہیں وہ۔'' وہ فرحانہ کی بات کا جواب اسی انداز میں تحمل سے دیتے ہوئے اٹھا تھا کرسی سے۔

''اسے فقیہہ کا کمرہ دکھا دو، بیٹے بائیں طرف ہے، بالکنی کے سامنے۔''

''جی۔'' اس نے سر ہلایا۔ باہر جھانکا لیکن ایک قدم نہیں بڑھایا، جب تک فرحانہ باہر نہ نکلی کمرے سے۔

سامنے کمرے کے دروازے پر ہی فقیہہ کھڑی تھی، انہیں دیکھ کر کچھ پیچھے ہوئی۔

وہ اندر آیا، سلام کیا۔

اس نے جواب دیا۔

فرحانہ کا بس چلتا تو وہ کھڑی رہتی اور اسے مزید سنا آتی لیکن ان دونوں کی خاموشی نے اسے باہر جانے پر مجبور کر دیا۔

جہاں ابا اسے بہت تنبیہی انداز میں گھورنے لگے تو بوا جی نے اسے زبان بند رکھنے کی باقاعدہ تلقین

pklibrary.com

کردی اور وہ دونوں کو دیکھتے، سر جھٹکتے، بڑبڑاتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

اور دوسری طرف کمرے میں چپ کھڑے دو افراد کے درمیان کچھ بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس کا بولنا بھی جیسے ناگزیر ہو۔

''آپ چلیں گی ساتھ؟''

''آپ چاہیں گے تو ضرور۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''میں انسانوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

''میں ایسا ہی ہوں، کیا کرسکتا ہوں۔''

''میں ایسی مکمل طور پر بنی تو مرجاؤں گی، خاموش رہ رہ کر میرا دم گھٹنے لگا ہے۔''

''تو آپ بول لیا کریں۔''

''کس کے ساتھ بولوں؟ کیا بات کروں؟ آپ کے پاس وقت ہوتا ہے؟''

تین سوال یکے بعد دیگرے، اس نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ہلکی سی، اسے رحم سا آیا۔ اب ایسا بھی کیا کہہ دیا میں نے، اسے افسوس ہوا۔

''آپ میرے ساتھ خوش ہیں؟'' یہ ایسا سوال تھا جو ان تینوں سوالوں کو کھا گیا تھا۔ وہ جیسے ساکت رہ گیا، اور سوال کا جواب دینا ضروری ہوگیا تھا۔

''شاید خوش تھا۔''

''میرے وہاں سے آنے سے آپ کو فرق پڑا؟'' اس کی لفظ شاید سے تشفی نہیں ہوئی تھی۔

''گھر کو پڑا۔''

''گھر کی بات نہیں کررہی میں، آپ کی کررہی ہوں۔ آپ کی اور اپنی۔''

''ظاہر ہے۔ اگر آپ کو پڑا تو مجھے بھی پڑا ہوگا۔''

''اگر مگر نہیں پوچھا۔ آپ سے پوچھا ہے کہ آپ کو پڑا؟'' اس کا لہجہ تیز ہوگیا کچھ۔ وہ فکرمند سا دکھائی دینے لگا۔

''آپ میری بیوی ہیں، فرق تو پڑنا تھا۔''

وہ جواب دے کر جیسے پہاڑ سر کرچکا تھا۔

''آپ کو میں یاد آئی؟''

''فقیہہ! پلیز۔'' وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگا کہ بس کرو۔

''بس اتنی سی بات بھی نہیں کہہ سکتے، ایسی کیا انا ہے عبید؟''

''کوئی انا نہیں ہے۔ کچھ باتیں کہنے کی ہوتی ہیں فقیہہ! انہیں کہنا ضروری نہیں ہوتا۔''

''اچھا، ٹھیک ہے، پھر اسی طرح ڈمی کی سی زندگی گزاریں۔ خاموش، بغیر کچھ کہے۔ بس سمجھ کر، محسوس کرکے۔ لیکن وہ بھی کیسے عبید! جب رویے اتنے خشک ہوں۔ کم از کم رویے سے تو تعلق کی مہر و محبت عیاں ہو۔''

''ایسا ہے، لیکن مجھے عادت نہیں ہے۔''

''کس چیز کی عادت نہیں، رشتے نہ بنانے کی یا پھر نباہ نہ کرنے کی۔''

''ایسا مت کریں فقیہہ! مجھے نہیں آتا ان سب چیزوں کو فیس کرنا۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ میں کسی اور میں انوالو نہیں ہوں۔ میرا کہیں چکر نہیں ہے۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔''

''بہت ہے یہ بھی لیکن اس تختی کے آگے زندگی رک جاتی ہے۔ کم از کم رویے میں تو نرمی ہو۔''

''وقت لگتا ہے کچھ۔''

''کتنا وقت؟ کیا سال یا صدیاں؟''

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''میں تھک گیا ہوں، کچھ دیر ستانا چاہوں گا، پھر سفر کرنا ہے۔''

''شوق سے آرام کریں۔'' وہ بتی بجھا کر باہر جانے لگی۔

''آپ کہاں جارہی ہیں؟''

''آپ آرام کریں۔ ہم پھر بات کرلیں گے۔''

''بات کرنے کی نوبت رہتی ہے کیا؟ بات تو ہوگئی۔'' وہ واسکٹ اتار کر رکھتے ہوئے بولا۔

pklibrary.com

''ہاں ہوگئی۔'' وہ اسی کے انداز میں بولی۔
''تو پھر چل رہی ہیں ناں آپ۔''
''ہاں چل رہی ہوں، وہ خود بھی جیسے تھک گئی تھی۔''
''شکریہ۔'' وہ بیٹھنے کے بعد جوتے اتارنے لگا۔
''کس بات کا؟''
''موقع دینے کا۔'' اس نے تکیہ سیدھا کیا لیٹنے کے لیے اور سرہانے رکھا۔
''ہوں، سوجائیں۔ تب تک کھانا تیار ہوجائے گا۔ پھر رات تک نکلیں گے۔ مجھے پیکنگ کرنی ہوگی، آپ سوکر اٹھیں تو کرلوں گی۔
''مجھے نیند آئے تو آپ بتی کھول دیجیے گا۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد اٹھا دیجیے گا۔''
''بے فکر ہوکر رہیں، جلدی نہیں۔ آرام کریں۔''
وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکلی تو فرحانہ سامنے کھڑی امرود کھا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر نظروں میں پوچھنے لگی۔
''بات ہوئی؟'' اس کی خاموشی دیکھ کر بالآخر وہ بول پڑی۔
''ہاں ہوئی۔ اب یہ مت پوچھنا کہ کیا بات ہوئی، بس سرسری ہوگئی کہ چلنا ہے۔ وہ تھکے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا آرام کرلیں۔''
''بہت اچھے۔ چلو بات تو ہوئی۔
''خوش ہو تم پھر؟'' وہ بات بھی کررہی تھی اور اسے بغور دیکھ بھی رہی تھی۔
''پلیز فرحانہ!''
''کیوں۔ میرے سوال سے تمہیں اتنی بیزاری کیوں ہورہی ہے؟''
''فضول سوال مت کرو۔''
''سچ بتاؤ، سمجھوتا ہی کررہی ہو؟''
''ہاں کررہی ہوں۔''
''پھر خوش رہوگی؟''
''مطمئن ہوں یہ کافی ہے۔''
''بہت اچھے، بہادر بن گئی ہو۔ اچھی لگ رہی ہو۔''
''کھانے کا کچھ ہوا؟'' وہ اس کی بات نظر انداز کرکے کچن کی طرف بڑھی۔
''ہاں چڑھا آئی ہوں۔ کباب بنا کر رکھ آئی ہوں، بس تلنے ہوں گے۔''
''اچھا کیا۔'' وہ بغیر دیکھے آگے جانے لگی۔
''فریحہ! میں دعا کروں گی کہ تم خوش رہو۔''
وہ اچانک اس کی طرف دیکھنے لگی۔
''ظاہر ہے، تم میری بہن ہو۔ دوست، ساتھی، بچپن کی۔''
وہ مسکرائی اس کی بات پر۔ ''منہ صاف کرلو اپنا، بچوں کی طرح کھاتی ہو۔''
وہ گال رگڑنے لگی۔ ''شکر ہے یہ نہیں کہا کہ گدھوں کی طرح کھاتی ہو۔''
''تم خود شناس ہو۔'' وہ کہتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔
''تم شناس بھی ہوں۔'' وہ اپنے لیے فریج سے پانی کی بوتل لے کر کمرے کی طرف گئی جہاں کمپیوٹر پر وڈیو آخری مراحل میں اس کی منتظر تھی اور ساتھ میں اس نے گیت کیسریا بلما لگا لیا تھا۔
اور دوسری طرف تھر کی سرزمین میں تیز دوپہری کی حدت میں گاڑی کے اندر مورپو بجنے لگا جو بھارو کو بھلا لگتا۔

ارے موریا رے موریا، تھانے پرناواں،
پیڑے، پوپچی، پوپچی، پوپچی
مانرا پنجم واڑا پھیرا کانج آج موریا
میٹھوتوں بولیو، گڑتی رات رو، رات رو رات رو.....

(ارے موریا، تجھے پیلا رنگ پہناؤں، تیرے بیاہ کی گھڑی ہے، تو خوشی کے پنجم پھیرے پھیر، گرجتی ہوئی رات میں میٹھا بول)
رات تو رات لیکن دوپہری چمک اٹھی تھی

مانرو بالم وسے پردیس موریا،
مانرو بلالوو سے پردیس موریا
میٹھوتوں بولیو گڑتی، رات رو رات رو، رات رو

(اے موریا ساون کی پہلی رت آئی ہے، میں درختوں میں جھولے ٹانگوں، میرا پتی پردیس گیا تو بول، تو میٹھا بول)

مانری اڈگئی رے آکھڑیاں والی نیند موریا
مانری اڈگئی رے نیناں رے والی نیند موریا
آچھوتوں بولیو، گڑتی، رات رو رات رو، راترو

(اے موریا تو آدھی رات کو بولا تو میرے نینوں کی نیند اڑگئی، میرا پیا تو پردیس گیا ہے۔ تو گرجتی ہوئی رات میں میٹھا بول،)

بھارو کا من مہک رہا تھا۔

اور دوسری طرف تیز تپتی دوپہری، میں بھاونا، پدھارو گانے لگی تھی

مائی کا یقین تھا کہ پیا نہ آئے تو بس پیا کے آنے کا تصور کر کے ہی گیت "پدھارو" گایا کرو۔

بلما آئے نہ آئے بلما کا پیغام تو آوے گا۔

اور دھت دوپہر کی گرم لو کے تھپیڑوں میں، بھارو نے گھر کا راستہ جالیا تھا۔

پدھارو لفظ کے معنی تھے آؤ

آنکھڑلی، پھڑوکی، مانری گھراں نا پدھارو
تھاناں جوئی جوئی جیاں ھاں جی ری بلالا

(میری آنکھ پھڑکتی ہے، تم اب تک آئے نہیں، گھر لوٹ آؤ، میں تیری راہ دیکھ رہی ہوں)

بھاونا نے مائی بجی کی چوکی پر ٹکائی، بھرجائی نے جھاڑو کی تیلیاں سیدھی کرتے ہوئے گردن موڑی۔

مائی کمر پر ہاتھ رکھ کر برآمدے کے پلر کے پاس کھڑی جیسے بھری دوپہر کا حسن دیکھ رہی تھی۔ سورج چمک رہا تھا، لیکن ہوا گرم لو کے تھپیڑے لیے چلی آرہی تھی۔

کمرے میں ڈیلاں ٹیپ چلا کر خود ناچ کے جی خوش کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جب اتنے لوگوں کے سامنے یہ شوق پورا کرنے نہیں دیا جائے گا تو تنہائی میں کیوں نہ ارمان پورا کیا جائے۔

مایوں کی رسم ہو چکی تھی۔

صحن کے اندر آتے بھارو کے قدموں کی آہٹ نے توجہ کھینچی اور پھر صورت پر ٹھہر گئی۔ لمحے کے لیے جو جس حرکت میں تھا، وہیں ساکت ہو گیا اور ڈیلاں نے کھلے دروازے سے چاچے کی طرف دوڑ لگائی اور لپٹ گئی۔

کوٹھی کے دروازے کا پردہ راسو نے ہٹایا تو کھل اٹھا۔

بھارو بڑھ کر ماں کے قدموں میں جھکا۔ ماں نے اسے بانہوں میں بھرا۔ بوڑھی بانہوں میں جوان بیٹے کا سر تھا۔ وہ شرمندہ تھا اور ماں مہربان تھی، وہ لوٹ آیا تو لمحے میں سارا کچھ بھول گئی۔

راسو کے گلے لگا تپاک سے جھکا۔ ہاتھ چوما۔ اس نے کندھا تھپتھپایا۔

بھرجائی کے سر پر ہاتھ رکھا، اس نے ماں کی طرح سر تھپک کر دعا دی۔

اور جب بھاونا کی نم آنکھوں میں جھانکا تو دوپہری کے عکس میں رقص کرتی محبت کی تپش کو اندر تک جالیا۔

بھاونا یعنی کہ لمحہ خوشی کا، آس کا، خواب کا، حسرت کا۔ محبت کا، مسکراہٹ کا، ایک پیغام.....

جو فقط پیغام ہی نہیں۔ اس کی کشش کے کھنچاؤ پر پیا کو پردیس سے لایا تھا۔

دوپہری کا گیت سارے میں گونج اٹھا۔

دوپہری جو سخت ہوتی ہے، جو کڑی ہوتی ہے۔ اسی لمحے کا ساتھ سنگیوں کو جوڑ دیتا ہے۔ جو کڑے وقتوں کا ساتھی ہوتا ہے۔ ایک قہر بھری لمبی رات اور ایک گرمی کی دوپہر کا طویل ترین لمحہ، جو ہجر کے لمحوں میں وصال کی نوید لے کر آیا تھا۔

☆

pklibrary.com

pklibrary.com

"مما! یہ میری نئی دوست ہے حوریہ۔" سجل نے اپنی مما سے کہا۔ جو ابھی ابھی شاپنگ کر کے لوٹی تھی۔ گیٹ پہ ہی ان کا سامنا ہو گیا تھا۔ کیونکہ حوریہ بھی اسی وقت واپس جا رہی تھی۔

عروج نے اپنے گلاسز کو بالوں میں پھنسایا اور غور سے حوریہ کی طرف دیکھا اور ناگواری کی شدید لہر اپنے اندر اٹھتی محسوس کی۔

سجل نے اپنی مما کے چہرے کو دیکھ لیا۔ عروج نے ہلکا سا سر ہلایا اور ملازمہ کو شاپنگ بیگز لانے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ سجل کو بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے حوریہ کے سامنے اپنی مما کی خوش دلی اور خوش مزاجی کی بہت تعریفیں کی تھیں۔

"حوریہ! ٹھہرو میں ڈرائیور سے کہتی ہوں تمہیں گھر تک چھوڑ آئے گا۔" سجل نے کہا تو حوریہ گھبرا کر ایک دم سے بولی۔

"نہیں سجل! رہنے دو۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"مگر یار! یہاں سے کافی دور پڑے گا تمہارا گھر۔ اکیلی کیسے جاؤ گی؟"

سجل نے فکر مندی سے کہا۔

"میں اسٹاپ سے بس میں بیٹھ جاؤں گی۔ تم پریشان مت ہو۔ میں چلی جاؤں گی۔"

حوریہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ یہاں آ کر جتنی خوش ہوئی تھی۔ سجل کی مما کے رویے کو دیکھ کر اتنی ہی شرمندہ ہو گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سجل کی مما کو وہ پسند نہیں آئی تھی۔

"اچھا ٹھہرو! ڈرائیور تمہیں بس اسٹاپ تک چھوڑ آتا ہے۔ یہاں سے بس اسٹاپ بھی کافی دور ہے۔"

سجل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور ڈرائیور کو آواز دے کر حوریہ کو بس اسٹاپ تک چھوڑنے کا کہا۔

حوریہ سر ہلاتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مگر وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ مگر سجل کے پیار اور خلوص کی وجہ سے اسے مزید ضد کرنا بھی اچھا نہیں لگا۔ گاڑی کے باہر نکلتے ہی سجل تیزی سے اندر کی طرف مڑی۔

"آؤ سجل! کھانا کھالو۔" وہ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھی کافی دیر سے سجل کا انتظار کر رہی تھی۔ دوپہر کے وقت دونوں ماں بیٹی ہی گھر پہ ہوتے تھے اور کھانا اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ سجل کو دیکھ کر وہ اس کے لیے چاول نکالنے لگی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" سجل نے غصے سے کہا اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

عروج نے گہری سانس لی۔ وہ جانتی تھی کہ سجل اس سے ناراض ہو گئی ہے اور جب تک منان اسے منائیں گے نہیں وہ یوں ہی ناراض رہے گی۔ وہ اپنے باپ کی بہت لاڈلی بیٹی تھی اور عروج کی ہر شکایت اپنے باپ سے ضرور کرتی تھی۔ عروج بے دلی سے کھانا کھانے لگی۔ اب اسے رات کے کھانے تک انتظار کرنا تھا دونوں باپ بیٹی کا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے۔ آج میری بولتی مینا بہت چپ چپ ہے۔ کیا مما سے ڈانٹ پڑی ہے۔ جلدی سے بتاؤ! ہم ابھی اپنی بیٹی کا بدلہ لے لیتے ہیں تمہاری مما کو ڈانٹ کر۔"

منان نے کھانے کے دوران سجل کو مسلسل خاموش بیٹھے دیکھا تو سمجھ گئے کہ آج پھر دونوں ماں بیٹی میں ان بن ہوئی ہے۔ عروج نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا جسے سمجھتے ہوئے منان نے سر ہلا دیا اور سجل سے پوچھنے لگا۔

"پاپا! میں آپ کی مسز سے سخت ناراض ہوں۔" باپ کے پوچھتے ہی سجل شروع ہو گئی۔ جب وہ عروج سے خفا ہوتی تو اسے "آپ کی مسز" کہہ کر باپ سے شکایت لگاتی تھی۔ اس کا یہ انداز دونوں کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لے آیا۔ جسے منان نے تو نہیں چھپایا مگر عروج نے سر جھکا لیا اور بلاوجہ اپنی پلیٹ میں چمچ چلانے لگی۔

"میں بھی آپ کی بیٹی سے سخت ناراض ہوں۔" عروج نے بھی اس کی بات اسے لوٹائی۔

"مما! دس از ناٹ فیئر! زیادتی بھی آپ کریں اور ناراض بھی آپ ہوں۔" سجل نے نروٹھے پن سے کہا۔

"آپ دونوں مجھے بتائیں گے کہ آخر ہوا کیا ہے؟" منان نے ہلکی سی میز بجا کر دونوں کو متوجہ کیا تو عروج کندھے اچکا کر رہ گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ سجل سے پوچھ لیں۔ منان نے سوالیہ نظروں سے سجل کو دیکھا تو وہ بولی۔

"پاپا! آپ جانتے ہیں ناں کہ بچپن سے میری ایک ہی دوست تھی رشنا' جو ایک سال پہلے اپنے ماما پاپا کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی اور اس کے بعد مجھے کوئی اچھا دوست ملا ہی نہیں۔"

منان نے سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیٹی دوست بنانے میں بہت محتاط تھی۔ اسی لیے اس کے فرینڈز کی تعداد بہت کم تھی۔

"ہوں۔۔۔ تو اب کیا ہوا ہے؟" منان نے سجل کو اداس دیکھ کر بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہونا کیا ہے۔ کالج میں میری ایک نئی دوست بنی ہے۔ حوریہ۔۔۔۔ اسے کچھ ضروری نوٹس چاہیے تھے۔ اسی لیے کالج سے واپسی پہ وہ کچھ دیر کے لیے میرے گھر آ گئی تھی۔ اس نے اپنی ماما سے رکنے کے لیے پوچھا نہیں تھا۔ اسی لیے نوٹس لے کر بس دس منٹ بیٹھی اور جب وہ جا رہی تھی تو گیٹ پہ مما اسے ملیں اور۔۔۔"

سجل نے پلکیں اٹھاتے ہوئے عروج کی طرف دیکھا۔

"آپ کی مسز نے ٹھیک سے میری فرینڈ سے بات بھی نہیں بلکہ ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ مجھے اتنی شرمندگی محسوس ہوئی۔ حوریہ کے سامنے۔ وہ کیا سوچتی ہو گی۔"

سجل نے روہانسے لہجے میں کہا تو منان نے سوالیہ نظروں سے عروج کو دیکھا۔

عروج نے پانی کا گلاس میز پہ رکھا اور گہری سانس لے کر بولی۔

"منان! میں نے اسے ہزار بار سمجھایا ہے کہ دوستی صرف اپنے برابر کے لوگوں سے کرنی چاہیے مگر آپ کی بیٹی کی ہر بات ہی نرالی ہوتی ہے۔ ویسے تو کوئی دوست بناتی نہیں ہے اور جب بنائے گی تو بغیر سوچے سمجھے۔ صاف بات ہے مجھے اس کی فرینڈ اچھی نہیں لگی۔ میں لوئر یا مڈل کلاس سے دوستی رکھنے کے حق میں نہیں ہوں۔" عروج نے نخوت سے کہا۔

"مما! حوریہ غریب ضرور ہے۔ مگر بہت اچھی اور تمیز دار ہے۔ پلیز آپ میری دوست کے لیے ایسے الفاظ مت یوز کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے بھی آپ کی بہت سی فرینڈز سخت ناپسند ہیں۔ جو ہر وقت اپنی امارت کا رعب ہی جھاڑتی رہتی ہیں۔ میں نے تو کبھی آپ کو منع نہیں کیا ان سے ملنے سے یا کبھی منہ نہیں بنایا ان کے آنے پہ' بلکہ جھوٹی موٹی خوشی کا اظہار بھی کرتی ہوں ان کی تشریف آوری پہ اور آپ ہیں کہ۔۔۔!"

سجل نے منہ بسورتے ہوئے بچوں کی طرح کہا تو منان کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

"از اٹ فنی پاپا!" سجل نے باپ کو ہنستے دیکھا تو ناراضی سے پوچھا۔

"نہیں میری جان! ویسے میری بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس نے کتنی خندہ پیشانی سے ہمیشہ تمہاری فرینڈز کو برداشت کیا ہے۔" منان نے سجل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے عروج کی طرف دیکھتے شرارتاً کہا تو عروج برے برے منہ بنانے لگی۔

"چلو! اب دونوں صلح کرلو۔ آئندہ مما آپ کے دوستوں سے اچھی طرح ملیں گی کیوں عروج۔۔۔!" منان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں عروج کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا تو عروج سر ہلا کے رہ گئی۔ سجل اسی میں خوش ہوگئی۔

"آئی لو یو پاپا!" کہتی ہوئی باپ کے گلے لگ گئی تو منان نے مسکرا کر اس کا سر تھپتھپایا۔

عروج باپ بیٹی کو لاڈ کرتے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس کی بھی جان میں جان آئی تھی۔

سجل ان دونوں کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ ان کے گھر کی رونق اسی چہکتی مینا سے تھی۔ اسی لیے سجل اٹھارہ سال کی ہو کر بھی بچوں کی طرح لاڈ کرتی تھی۔

عروج اپنی بیٹی کے ساتھ کافی قریب ہونے کے باوجود کچھ باتوں میں سختی کر جاتی تھی' جنہیں منان اپنی عقل مندی سے سنبھال لیتا تھا۔ اسی لیے ان کے گھر کا سکون اور پیار مثالی تھا۔

☆ ☆ ☆

"عروج! تمہیں نہیں لگتا کہ اب تمہیں اپنا رویہ کچھ تبدیل کرلینا چاہیے۔"

لیپ ٹاپ بند کرکے رکھتے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے منان نے عروج کی طرف دیکھا۔ وہ کلینزنگ کرتے ہوئے رک گئی۔

"آپ کا مطلب ہے کہ میں غلط ہوں۔" عروج نے اپنے شوہر کی طرف رخ موڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! تم شروع سے سجل کے فرینڈز کو لے کر بہت کانشس رہی ہو۔ چلو اچھے برے لوگوں کی تو سمجھ میں آتی ہے مگر تم اسٹیٹس کانشس کب سے ہو گئی ہو؟ تم امیری' غریبی کا فرق کرو گی میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" منان نے سنجیدگی سے کہا تو عروج بری طرح شرمندہ ہوگئی۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں امیری' غریبی کا فرق بتانا چاہ رہی ہوں۔ دراصل میں جانتی ہوں کہ سجل بہت معصوم اور سادہ لڑکی ہے اور کالج جوائن کیے اس کو ابھی سال ہی ہوا ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ کالج میں ہر طرح کی لڑکیاں ہوتی ہیں اور سجل بہت جذباتی سی ہے۔ جس پہ اس کا دل آجائے' پھر اچھا برا نہیں دیکھتی۔ اسی لیے میں پریشان رہتی ہوں۔"

عروج نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"مگر سجل کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ حوریہ بہت اچھی اور سلجھی ہوئی بچی ہے پھر تمہیں اعتراض کیوں؟" منان نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ دراصل! آپ غلط مت سمجھیے گا مگر حوریہ

pklibrary.com

کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق لوئر کلاس سے ہے۔ آئی مین! اس کے حلیے وغیرہ سے اور دوستی میں اتنا زیادہ فرق میرے خیال سے کافی مسئلے پیدا کرتا ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے ماحول میں نہ ایڈجسٹ ہو سکتے ہیں اور نہ اپنا سکتے ہیں۔ صاف لفظوں میں اگر کہوں تو میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی ایسے ماحول سے کچھ بھی غلط سیکھے۔"

عروج نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو منان نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جو بھی ہے! تم سجل پہ نظر ضرور رکھو۔ مگر حوریہ کے حوالے سے بہت سخت رویہ رکھ کر اسے ہرٹ مت کرو۔ پیار اور محبت سے اسے سمجھاؤ۔ اگر کچھ غلط دیکھو اور ہاں پلیز! نیکسٹ ٹائم کوئی بھی مہمان گھر آئے تو اسے پوری طرح عزت دو۔ حوریہ کے ساتھ مجھے بھی تمہارا رویہ اچھا نہیں لگا۔"

منان نے دو ٹوک انداز میں کہا اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا۔ عروج اثبات میں سر ہلاتے مسلسل کسی سوچ میں گم تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! آپ جانتی ہیں کہ سجل کا گھر بہت بڑا اور خوب صورت ہے۔ جیسے ٹی وی ڈراموں میں نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے عالی شان گھر۔۔۔ ویسا ہی گھر ہے سجل کا۔"

حوریہ معصومیت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے۔ اپنی امی سے کہنے لگی۔ حوریہ کی امی 'سلائی مشین پہ جھکی کپڑے سی رہی تھیں۔ یہ آرڈر انہیں کل تک ہر حال میں مکمل کر کے دینا تھا۔ اسی لیے ان کے ہاتھ جلدی جلدی چل رہے تھے۔

حوریہ پاس ہی کتابیں پھیلائے کالج کا کام کر رہی تھی۔ دو کمروں کا یہ چھوٹا سا گھر دونوں ماں بیٹی کے لیے کافی تھا۔

اپنے کام میں مصروف حوریہ کی امی نے بیٹی کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ جو کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا۔ تمہارا دھیان کہاں ہے؟" انہوں نے منہ سے دھاگا توڑا اور دوبارہ جھک کر مشین چلانے لگیں۔

"امی! میں سوچ رہی ہوں کہ آپ اور سجل کی مما تقریباً ایک عمر کی ہوں گی۔۔۔"

حوریہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"آپ کتنی سادہ اور عام سی لگتی ہیں۔ جبکہ سجل کی مما اتنی فریش اور خوب صورت سی لگتی ہیں اپنی عمر سے بھی کم۔ بالکل ینگ۔" حوریہ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔

"اس لیے بیٹا! کہ جن کی قسمت ہی عام سی ہو' وہ بہت سے خاص چہروں کو بھی اپنا جیسا عام سا بنا دیتی ہے۔"

حوریہ کی امی نے خود کلامی کی اور پھر سے کام میں مصروف ہو گئیں۔ جبکہ حوریہ نے ماں کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ ابھی بھی ذہنی طور پر سجل کے گھر میں ہی موجود تھی۔

دونوں ذی نفس خاموشی سے اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم تھے۔ اس خاموشی میں صرف مشین کے چلنے کی آواز گونج رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مما! ایک بات تو بتائیں!" سجل نے لان میں موجود کرسی پہ بیٹھتے ہوئے پھولی سانسوں کے ساتھ عروج سے سوال کیا۔ جو سامنے والی کرسی پہ بیٹھی اپنی سانسوں کو اعتدال میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں ابھی بیڈمنٹن کھیل کر فارغ ہوئی تھیں۔ ملازمہ فریش جوس میز پہ رکھ کر چلی گئی۔

"یو نو واٹ سجل! تمہاری طرح میری بھی صرف ایک ہی خاص دوست تھی۔ لیلیٰ۔۔۔ ہم دونوں فرسٹ ایر میں دوست بنے تھے۔ اور ہماری یہ دوستی بی اے تک چلی۔ بلکہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی شادی

میں بھی شرکت کی تھی۔ بعد میں بھی اکثر فون پہ رابطہ رہتا تھا مگر پھر۔"

عروج جوش سے بتاتے بتاتے کہیں کھو سی گئی۔

"مگر کیا مما! اور اب کہاں ہیں آپ کی فرینڈ؟" سجل نے خوشی سے اچھلتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لیے یہ انکشاف ہی بہت دلچسپ تھا کہ اس کی مما کی بھی کوئی بیسٹ فرینڈ بھی تھی۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا کہ وہ اب کہاں ہے۔ مگر اب وہ مجھے اکثر بہت یاد آتی ہے۔" عروج نے اداس سے لہجے میں کہا۔

"تمہیں مزے کی بات بتاؤں؟"

سجل بہت شوق سے اپنی مما کو بولتے ہوئے سن رہی تھی۔ جس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور یادوں کے چمکتے ہوئے ستارے تھے۔

"لیلیٰ سے میری دوستی کالج کے فرسٹ ڈے ہوئی تھی۔ اس دن وہ بہت گھبرائی ہوئی اور کنفیوژ سی تھی۔

لیلیٰ بہت خوب صورت تھی۔ اس کی خاص بات اس کے چہرے کا بھولا پن تھا۔ لیلیٰ سے دوستی کرنے میں میرا ہاتھ تھا۔ بلکہ ہمیشہ ہی اس دوستی کو قائم رکھنا اور لیلیٰ کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلنا میرا ہی فرض تھا۔"

"وہ کیوں مما؟" سجل نے حیرانی سے سوال کیا۔

"لیلیٰ، حالات کی ستائی ہوئی تھی۔ رشتوں اور جذبوں سے ناآشنا، صرف تلخی اور نفرت ہی دیکھی تھی اس نے۔ اس کی وجہ سوتیلی ماں تھیں۔ باپ اس کی ذات سے مکمل لاپروا۔ سوتیلی ماں اس کے ساتھ کیسا بھی سلوک کرتی اس کے باپ نے کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا تھا۔ اس کے چھ سوتیلے بہن بھائی تھے۔ جن کی دیکھ بھال بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ اسے پڑھنے کی اجازت بھی بہت مشکل سے ملی تھی۔

مگر کالج آکر بھی وہ پریشان اور الجھی الجھی سی رہتی تھی۔ میں اس دنیا میں اس کی واحد دوست تھی۔ جس سے وہ سب کچھ شیئر کرلیتی تھی۔ اور میں بھی ہر وقت، ہر لمحہ اس کے مسئلوں کو حل کرنے میں لگی رہتی۔ ہر موقع، ہر چیز میں اس کا دھیان رکھتی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ اس میں ہر خوبی تھی سوائے ایک کے، وہ بہت جلدی بدگمان ہو جانے والوں میں سے تھی اور اکثر بہت تلخ بول جاتی تھی۔ جسے میں ہنس کر ٹال دیتی تھی۔ ایک بار میں بھی برا مان گئی تھی۔ مگر یہ بھول گئی تھی کہ ہم دونوں مان سکتے ہے۔ مگر منانے کا فن صرف مجھے آتا تھا۔ وہ اس فن میں نابلد تھی اور یہی ہوا۔ ہمارے راستے جدا ہو گئے۔"

عروج نے آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم بھی دوستی میں حد سے آگے نہ نکل جاؤ کہ بعد میں تمہیں تکلیف اٹھانی پڑے۔ ویسے بھی ان مڈل کلاس اور لوئر کلاس لڑکیوں کے مسئلے بہت ہوتے ہیں۔ جنہیں تم چاہو بھی تو ہینڈل نہیں کر سکو گی۔ اس لیے میں ایسی دوستی کے خلاف ہوں۔"

عروج نے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہا تو سجل سر ہلا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

سجل اور حوریہ کی دوستی دن بہ دن بہت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ سجل اکثر حوریہ کے گھر بھی چلی جاتی تھی اور حوریہ بہت شرمندہ ہوتی مگر سجل کا رویہ اتنا نارمل ہوتا تھا کہ حوریہ اپنے اور اس کے درمیان موجود امیری غریبی بھولنے لگتی۔

سجل کو حوریہ کی امی بھی بہت اچھی لگیں۔ خاموش سی، اپنے کام میں مگن، سجل کو دیکھ کر ہلکے سے مسکراتی ہوئی وہ اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔

اس دوستی پہ اگر کسی کو کچھ اعتراض تھا تو وہ عروج تھی۔ وہ سجل کو جتنا منع کرسکتی تھی کر چکی تھی۔ مگر وہ حوریہ پہ گہری تنقیدی نظر رکھتی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے ہر چیز پہ اس کی نظر ہوتی۔ حالانکہ حوریہ بہت سلجھی ہوئی لڑکی تھی مگر عروج کو وہ سجل کے سامنے کچھ بھی نہیں لگتی تھی۔

اس دن سجل کی سالگرہ تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی پارٹی رکھی تھی۔ جس میں بہت قریبی لوگ مدعو تھے۔ حوریہ کو بھی وہ صبح ہی سے اپنے گھر لے آئی تھی۔ حوریہ کی امی نے گھر جلدی چھوڑ جانے کے وعدہ کے ساتھ حوریہ کو بھیجا تھا۔

عروج نے بہت خوب صورت رنگوں والی فراک خاص آرڈر پہ، سجل کے لیے بنوائی تھی۔ اس فراک کے دھانی رنگ اور اس میں ہلکا سا کام بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مگر سجل کا دل سیاہ رنگ کی فراک پہننے پہ تھا۔ یہ فراک سجل نے کچھ دن پہلے ایک مشہور بوتیک سے خریدی تھی۔

ملازمہ نے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی تو عروج نے انہیں بٹھانے کے لیے کہا اور خود نک سک سی تیار کمرے کی طرف چل پڑی تاکہ سجل کی تیاری پہ ایک نظر ڈال سکے اور اسے جلد نیچے آنے کا کہے۔ عروج نے ہلکا سا کھٹکھٹا کر دروازہ کھولا۔

"سجل ــــ!" دھانی فراک میں ملبوس وجود پہ نظر پڑتے ہی عروج نے پکارا اور پھر اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

"مما آپ ــــ!" ڈریسنگ روم سے سیاہ فراک میں ملبوس ہاتھ میں چوڑیاں پہنتی سجل نے ماں کو گم صم کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ ــــ" عروج نے حوریہ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں جوتے پہن لوں۔" حوریہ نے عروج کی نظروں سے بچنے کے لیے فوراً بہانہ بنایا اور ڈریسنگ روم میں جانے لگی۔ ڈریسنگ روم کا دروازہ بند ہوتے ہی، عروج نے غصے سے سجل کا بازو کھینچا اور درشتی سے بولی۔

"تم نے میرا لایا ہوا ڈریس اس لڑکی کو دے دیا یہ سوچے بغیر کہ میں نے کتنے پیار اور شوق سے تمہارے لیے بنوایا تھا۔"

"اوہو! کیا ہو گیا ہے مما! اتنی سی بات پہ غصہ کیوں کر رہی ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے آپ نے دیکھا کہ حوریہ یہ وہ ڈریس کتنا اچھا لگ رہا ہے۔"

سجل نے اشتیاق سے اپنی مما کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم ــــ اپنا موازنہ اس دو ٹکے کی لڑکی سے کر رہی ہو۔ اس کی اوقات ہے اتنے مہنگے مہنگے کپڑے پہننے کی؟ وہ لڑکی تمہیں خوب اچھی طرح استعمال کر رہی ہے اور تم بے وقوف ــــ"

عروج نے غصے سے بولتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مما ــــ" سجل نے عروج کے اتنے سخت لفظوں پہ حیرانی اور دکھ سے دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ الفاظ اس کی مما نے بولے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"سجل! آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میری اوقات اور حیثیت نہیں ہے اتنے مہنگے اور قیمتی کپڑے پہننے کی۔"

پیچھے سے حوریہ کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز آئی تو دونوں چونک کر پلٹیں۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی اور اب اپنے اسی سادہ سے حلیے میں تھی۔ فراک اس کے ہاتھ میں تھی۔

"آنٹی! میں شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو ذہنی اذیت اٹھانا پڑی۔ میں آئندہ کوشش کروں گی کہ آپ کی بیٹی سے بھی دور رہوں اور اپنے برابر کے لوگوں سے ہی دوستی کروں۔"

حوریہ نے فراک عروج کے بے جان ہوتے ہاتھوں میں تھمائی اور بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"مما! میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ آپ اچھی مما نہیں ہیں۔"

سجل نے روتے ہوئے کہا اور ڈریسنگ روم میں جا کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔ عروج کے ہاتھوں سے فراک نیچے گر پڑی اور وہ سر تھام کر بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

وہ غصے میں بہت غلط بول گئی تھی۔ اسے اپنے لفظوں پہ شدید شرمندگی اور افسوس تھا۔ خاص کر سجل اور حوریہ کو روتے دیکھ کر اسے بہت برا لگ رہا تھا۔

"کیا تھا اگر میں اپنے غصے پہ قابو رکھ لیتی۔ کم از کم کسی کی دل آزاری تو نہ ہوتی۔" عروج نے افسوس

pklibrary.com

سے ہاتھ ملتے ہوئے سوچا۔

☆ ☆ ☆

"بیگم صاحبہ! کوئی عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔"

عروج ٹی وی لاؤنج میں کسلمندی سے بیٹھی چینل سرچنگ میں مصروف تھی جب ملازمہ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔

"کون ہے؟ تم نے پوچھا نہیں۔" عروج نے ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"پتا نہیں! مگر وہ کہہ رہی ہیں کہ سجل بی بی کی مدر سے ملنا ہے۔" ملازمہ نے جواب دیا تو عروج چونک گئی۔ یعنی وہ سجل کو بھی جانتی ہے۔

"اچھا انہیں یہیں لے آؤ۔" عروج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پچھلے تین دن سے سجل عروج سے سخت خفا اور اکھڑی اکھڑی سی تھی۔

اس دن سالگرہ میں وہ اپنے باپ کے کہنے پہ شامل ضرور ہو گئی تھی مگر بہت اداس اور بجھی بجھی سی۔ اکثر مہمانوں نے بھی سجل کی خاموشی کو محسوس کر کے سوال پوچھے تو عروج نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ سجل اتنے دن سے عروج سے ناراض تھی۔ سنان نے بھی اس بار دونوں ماں بیٹی کے معاملے میں آنے کے بجائے سجل کی ناراضی کو بجا سمجھا تھا۔ وہ خود سرزنش کر چکا تھا۔

عروج بہت شرمندہ ہونے کے باوجود، سجل کو منانے میں پہل نہیں کر رہی تھی۔ اس کی انا بار بار آڑے آ رہی تھی۔ عروج انہی سوچوں میں گم تھی کہ کسی نے کھنکھار کے اسے متوجہ کیا۔ عروج نے سر اٹھا کر سامنے کھڑی عورت کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بری طرح چونک گئیں۔ عروج بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کی گود میں پڑا ریموٹ نیچے گر گیا۔

"لیلیٰ تم ــــ!" عروج نے خوشی اور حیرانی سے سامنے کھڑی عورت سے کہا۔

"میں پچھلے تین دن سے یہ ہی سوچ رہی تھی کہ کس نے میری بیٹی کو اس کی اوقات یاد دلائی ہے مگر تمہیں دیکھ کر مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے۔" آنے والی نے گہری سانس لی۔

"ہاں تم واقعی کسی کو بھی اس کی اوقات اور حیثیت اچھی طرح یاد دلا سکتی ہو۔ جیسے آج سے بہت سال پہلے تم نے مجھے میری حیثیت اور اوقات یاد دلائی تھی۔"

لیلیٰ نے بہت سرد لہجے میں کہا تو عروج کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"حوریہ تمہاری ــــ!" عروج نے اٹکتے ہوئے کچھ پوچھنا چاہا۔

"ہاں! حوریہ میری بیٹی ہے۔ میں تو یہ سوچ کر یہاں آئی تھی کہ اپنی بیٹی کی تذلیل کرنے والی سے ایک بار ضرور پوچھوں گی کہ اس نے کیا سوچ کر میری بیٹی کی اتنی بے عزتی کی تھی ــــ!"

لیلیٰ نے بات ادھوری چھوڑ کر گہری سانس لی۔ "خیر میں چلتی ہوں۔" لیلیٰ نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

"لیلیٰ! رکو میری بات سنو! میں مانتی ہوں کہ اس دن غصے میں، میں نے حوریہ کے لیے غلط لفظ بول دیے تھے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرا مقصد وہ نہیں تھا۔ کیا تم میری غصے میں کہی باتوں کو درگزر نہیں کر سکتیں؟" عروج نے لجاجت سے کہا تو لیلیٰ ایک دم واپس مڑی۔ کچھ دیر تک عروج کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر سنجیدگی سے بولی۔

"کیا تم نے کبھی غصے میں کہی کسی کی باتوں کو درگزر کر کے صرف رشتہ بچانے کے لیے سوچا ہے۔ پھر تم یہ امید کسی اور سے کیسے رکھ سکتی ہو؟"

لیلیٰ کے سوال نے عروج کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"لیلیٰ! میں جانتی ہوں کہ اس وقت میں نے جذباتیت میں غلط قدم اٹھایا تھا۔ مگر تم یہ بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے لیے تم کیا تھیں۔ میری واحد دوست، میری رازداں۔ ہماری دوستی اور محبت تو مثالی

تھی ناں۔۔۔!"

عروج نے ماضی کے ورق پلٹے تو لیلیٰ تلخی سے مسکرا دی۔

"ہاں اور اسی مثالی دوستی کو اپنی جھوٹی انا کی قبر میں ہمیشہ کے لیے دفنا دیا تھا تم نے۔"

"مگر لیلیٰ! غلطی تمہاری تھی۔ میں تمہارے مزاج سے واقف تھی مگر منان نہیں۔ میری شادی کو صرف چھ مہینے ہوئے تھے اور میں ابھی منان کے مزاج کے سب رنگوں سے واقف نہیں ہوئی تھی۔ تمہیں اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ تم بعض اوقات بہت غلط لفظ بہت سخت لہجے میں بول جاتی تھیں۔ اس دن بھی منان نے تمہاری کال ریسیو کی تھی۔ تم نے مجھے بلانے کو کہا تھا۔ منان نے ہولڈ کرتے وقت تمہارا نام پوچھ لیا تھا اور تم نے انہیں بے نقط کی سنا دی تھیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ منان کوئی فلرٹ نہیں تھے۔ انہوں نے تمہارا نام مجھے پیغام دینے کے لیے پوچھا تھا۔ اتنا برا لگا تھا منان کو تمہارا رویہ اور ان کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔ بس پھر مجھے غصہ آگیا اور۔۔۔"

عروج نے ماضی کا وہ باب کھولا، جہاں ان کی دوستی کا اختتام لکھا ہوا تھا۔

"اور تم نے دوستی میں کیے اپنے سارے احسانات جتا کر مجھے کہا کہ اگر میں تمہیں برداشت نہ کرتی تو تمہیں کون منہ لگاتا۔ تمہاری تو اتنی حیثیت ہی نہیں ہے کہ تم کوئی اچھا دوست افورڈ کر سکو۔"

لیلیٰ نے عروج کے کہے لفظ اسے یاد دلائے تو عروج نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"عروج! مجھ سے دوستی کرتے وقت تم میرے سب عیبوں سے واقف تھیں۔ میرے مزاج اور لہجے کی کڑواہٹ منان بھائی کے لیے ضرور نئی تھی مگر تمہارے لیے نہیں۔ تم نے ہمیشہ مجھے درگزر کیا تھا۔ پھر اس دن کیوں نہیں؟" لیلیٰ نے اتنے سالوں کا دبا شکوہ کر ڈالا۔

"لیلیٰ! میں نے ہمیشہ تمہاری غلطیوں کو اگنور کیا تھا۔ ایک بار تم بھی کر دیتیں۔" عروج نے جواباً شکوہ کیا۔

"مگر تم اچھی طرح جانتی تھیں کہ لیلیٰ کو ایسا کوئی ہنر نہیں آتا تھا۔ لیلیٰ نے زندگی میں صرف سوتیلوں اور سگے رشتوں سے رویوں اور باتوں کا زہر پیا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ شادی کے بعد تم یہ سب اتنی جلدی کیسے بھول گئیں؟" لیلیٰ نے دھیرے سے کہا۔

"اس دن جب میں نے تمہیں فون کیا تھا تو میں بہت پریشان تھی۔" لیلیٰ نے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"فاروق کو ہسپتال میں ایڈمٹ ہوئے دس دن ہو چکے تھے۔" لیلیٰ نے اپنے شوہر کا نام لیتے ہوئے کہا تو عروج بری طرح چونکی۔

لیلیٰ کی شادی کچھ مہینے پہلے ہوئی تھی عروج کی شادی سے۔ لیلیٰ کی سوتیلی ماں نے یہ رشتہ پسند کیا تھا۔ فاروق لیلیٰ سے عمر میں بڑا اور کام چور تھا۔ لیلیٰ نے بہت کوشش کی تھی مگر اپنی قسمت سے نہ لڑ سکی۔ عروج اس کے آنسوؤں اور تکلیفوں کی گواہ تھی۔

"فاروق کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ جس میں ان کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی تھی۔ جب ڈاکٹرز نے یہ خبر مجھے سنائی تو میں بہت پریشان ہوئی۔ میری ساس نے مجھے منحوس کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس مشکل وقت میں مجھے تمہاری بہت شدت سے یاد آئی۔ کیونکہ میں نے اپنا ہر غم ہمیشہ تم سے ہی شیئر کیا تھا۔ اس دن میری ساس گھر پہ نہیں تھی اور فاروق دوائیوں کے زیر اثر سو رہے تھے۔ موقع غنیمت جان کر میں نے تم سے بات کرنے کے لیے فون ملایا۔ جب منان بھائی سے میں نے تمہیں بلانے کے لیے کہا۔ میرا دھیان بٹا ہوا تھا۔ فاروق اور ساس کی طرف۔ کسی بھی وقت میری ساس واپس آسکتی تھی اور اسی وقت منان بھائی نے میرا نام پوچھا تو میں جھنجلا گئی اور بولی۔ "پلیز نام پوچھنے میں ٹائم ضائع مت کریں اور جلدی سے عروج کو بلا دیں۔ میں اس کی فرینڈ بات کر رہی ہوں۔"

الفاظ سے زیادہ میرا لہجہ برا تھا۔ مگر مجھے پریشانی میں دھیان نہیں رہا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ یہ لہجہ اور کڑواہٹ میرے مزاج کا حصہ بن چکی تھیں۔ میں

pklibrary.com

ہولڈ پہ ہی تھی منان بھائی نے غصے میں تمہیں فون پکڑاتے ہوئے کہا تھا "کہ تم نے کیسی جاہل ـــــ دوست بنائی ہوئی ہیں۔ جنہیں بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ تمہارے استفسار پہ انہوں نے میرے لہجے کی بابت بتایا اور تم فون پکڑتے ہی غصے میں پھٹ پڑیں۔ میں نے شرمندہ ہو کر معذرت بھی کرنا چاہی تھی مگر تم نے کچھ نہیں سنا اور بول بول کے فون بند کر دیا تھا۔ پھر میں نے بہت بار فون کیے مگر تمہاری طرف سے کوئی رسپانس نہ آیا تو میں نے یہ سلسلہ ہی ترک کر دیا تھا۔ پھر زندگی نے ہی اتنی مہلت نہ دی کہ فراغت ملتی۔ فاروق اس حادثے کے بعد تین سال تک زندہ رہے۔ جب حوریہ ڈھائی سال کی تھی تو وہ ـــــ"

لیلیٰ نے اپنی چادر سے آنسو صاف کرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تم نے کبھی بتایا کیوں نہیں 'اتنا مشکل اور سخت مرحلہ تم نے اکیلے کیسے پار کر لیا۔ ایک بار تو مجھے پکار کر دیکھتیں۔"

عروج نے تڑپ کر کہا۔ لیلیٰ کے بیوہ ہونے کا سن کر اسے بہت دھچکا لگا تھا۔ لیلیٰ اداسی سے مسکرا دی۔

"تم بھول رہی ہو کہ مجھے پکارنے کا 'منانے کا' جوڑنے کا کوئی ہنر نہیں آتا تھا اور یقین مانو! تمہارے ہوتے ہوئے کبھی اس کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ مگر تم یقین کرو۔ حوریہ میں میری طرح کی کوئی خامی نہیں ہے۔ وہ رشتوں کو جوڑنا بھی جانتی ہے اور نبھانا بھی۔ اس لیے کہ اس کی تربیت کسی سوتیلی ماں نے نہیں اس کی سگی ماں نے کی ہے۔

میں محروم تھی مگر میری بیٹی محروم نہیں ہے رشتوں کے یقین سے ـــــ!"

لیلیٰ نے سنجیدگی سے کہا تو عروج نے بے ساختہ روتے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔

"آئی ایم سوری لیلیٰ! غلطی میری تھی میں تمہارے حالات سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ تمہیں سمجھتی تھی۔ پھر نجانے کیوں میں اپنی انا کے چکر میں آکر دوستی جیسے خوب صورت رشتے کو گنوا بیٹھی۔

مگر نہیں! اب یہ غلطی میں پھر نہیں کروں گی۔ ہماری نہیں 'مگر ہماری بیٹیوں کی دوستی ضرور وقت کے ساتھ پروان چڑھے گی اور مضبوط رہے گی۔"

"مما ـــ" عروج نے سجل کی حیران سی آواز پہ مڑ کے دیکھا۔ سجل کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ سب کچھ جان چکی تھی۔

"سوری بیٹا! میری وجہ سے آپ کو اور حوریہ کو اتنا ہرٹ ہونا پڑا۔ آج میں پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ میری بیٹی کو حوریہ سے اچھی اور بہتر دوست مل ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ حوریہ اس ماں کی بیٹی ہے جس نے لمحہ لمحہ کڑواہٹ میں جینے کے باوجود اپنی بیٹی کو اس آگ سے محفوظ رکھا۔ ایسے لوگ انمول ہوتے ہیں۔"

عروج نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ لیلیٰ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تو لیلیٰ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"بیٹا! کوئی بھی رشتہ 'کوئی بھی فرد خامیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ بس رشتوں کو ساتھ لے کر چلنے کے لیے برداشت اور درگزر سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور انہیں بچانے کے لیے اپنی "انا" سے لڑنا پڑتا ہے۔ "انا" رشتوں کی ہر خوب صورتی کو کھا جاتی ہے۔ اور اکثر تو رشتوں کو ہی بھیسے عروج اور میرے ساتھ ہوا۔ ہم دونوں اپنی اپنی انا کی جنگ میں جیت کے اپنی دوستی کو ہار گئے۔ مگر مجھے امید ہے کہ تمہارے اور حوریہ کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔"

لیلیٰ نے پیار سے سجل کا رخسار تھپتھپایا اور عروج کی طرف ایک نظر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

بہت سال پہلے وہ ایک رشتہ انا کی جنگ میں ہاری تھی اور آج اس انا کو ہرا کر اس نے اپنی بیٹی کو دوستی جیسا نایاب تحفہ دیا تھا۔

صراحی کا بھرم کھلتا نہ میری تشنگی ہوتی
ذرا تم نے نگاہِ ناز کو تکلیف دی ہوتی

جہاں بدلا مگر آدابِ میخانہ نہیں بدلے
کبھی اے گردشِ دوراں اِدھر بھی آگئی ہوتی

رہِ ہستی کے ہر منظر پہ رُکتی ہے نظر اپنی
وہ مل جاتے تو کیا دُنیا میں ایسی دلکشی ہوتی

مقامِ عاشقی دُنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ
جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی

تمہاری آرزو کیوں دل کے ویرانے میں آ پہنچی
بہاروں میں پلی ہوتی، ستاروں میں رہی ہوتی

زمانے کی شکایت کیا، زمانہ کس کی سُنتا ہے
مگر تم نے تو آوازِ جنوں پہچان لی ہوتی

رضائے دوست قابلؔ میرا معیارِ محبت ہے
انہیں بھی بھول سکتا تھا اگر ان کی خوشی ہوتی

قابل اجمیری

مجھ کو شکستِ دل کا مزا یاد آگیا
تم کیوں اُداس ہوگئے، کیا یاد آگیا

کہنے کو زندگی تھی بہت مختصر مگر
کچھ یوں بسر ہوئی کہ خدا یاد آگیا

واعظ سلام لے کہ چلا میکدے کو میں
فردوس گم شُدہ کا پتا یاد آگیا

برسے بغیر ہی جو گھٹا گھر کے کھُل گئی
اک بے وفا کا عہدِ وفا یاد آگیا

مانگیں گے اب دُعا کہ اسے بھول جائیں ہم
لیکن جو وہ بوقتِ دُعا یاد آگیا

حیرت ہے تم کو دیکھ کے مسجد میں اے خمارؔ
کیا بات ہوگئی جو خدا یاد آگیا

خمار بارہ بنکوی

pklibrary.com

لطیفوں کی سنچری

ہائے رے سوتن

ایک عورت نے مصور سے اپنا پورٹریٹ بنوایا۔ پھر کچھ سوچ کر مصور سے کہا کہ ”گلے میں نولکھا ہار بھی بنادو۔“

تصویر بننے کے بعد مصور نے پوچھا۔ ”آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

عورت نے کہا۔ ”اگر میں مرگئی تو میرے شوہر دوسری شادی کرلیں گے۔ نئی بیوی آئے گی تو یہ ہار ڈھونڈے گی اور جب یہ ہار نہیں ملے گا تو دونوں میں جھگڑا ہوگا اور تب میری روح کو بہت سکون ملے گا۔“

ناقابل برداشت

بیوی کو مارنے پیٹنے کے الزام میں ایک شخص کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ بیوی کی ایک آنکھ پر نیل پڑا ہوا تھا۔ جج صاحب نے شوہر کو تنبیہ کرکے چھوڑ دیا۔ دوسرے روز دونوں میاں بیوی پھر عدالت میں پیش ہوئے، بیوی کی دوسری آنکھ پر بھی نیل پڑا ہوا تھا۔

جج صاحب نے ملزم کو جیل بھیجنے سے پہلے اسے اپنا مؤقف بیان کرنے کی اجازت دی۔

ملزم نے نہایت متانت سے کہنا شروع کیا۔

”جناب والا! کل میں آپ کے فیصلے سے اتنا خوش ہوا کہ گھر جانے سے پہلے دوستوں کی ایک محفل میں پینے پلانے بیٹھ گیا۔ گھر پہنچا تو بیوی نے مجھے آوارہ، شرابی، نکما اور نکھٹو کہا۔ میں نے سوچا کہ چلو کوئی بات نہیں، پھر وہ بولی۔ ”اگر اس احمق جج میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ تمہیں کل ہی جیل بھجوا دیتا۔“

”بس جناب! مجھ سے آپ جیسے شریف، بلند مرتبہ اور محافظ قانون کی یہ توہین برداشت نہ ہوسکی۔ اور.....“

پسند

برنارڈ شا ہمیشہ اپنی پسند کی چیزیں خریدتا اور اپنی بیوی سے کہتا۔ ”تمہاری پسند معیاری نہیں ہوتی۔“

ایک دن بیوی نے جل کر کہا۔ ”آپ نے تو سمجھ رکھا ہے کہ جیسے میں نے کبھی کوئی بھی اچھی چیز پسند نہیں کی۔“

برنارڈ شا نے فوراً جواب دیا۔ ”نہیں، ایک بات کا تو میں بھی قائل ہوں۔ شادی کے وقت تمہاری پسند یقیناً میری پسند سے بہتر تھی۔“

یک نہ شد.....!

ٹریفک سارجنٹ نے طویل اور طوفانی تعاقب کے بعد ایک کار سوار صاحب کو روکا، جو سگنل توڑ کر تیز رفتاری سے فرار ہونے کی کوشش کررہے تھے۔

”تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم نے سگنل توڑا اور پھر اتنی تیزی سے گاڑی چلانے کی اجازت نہیں ہے۔“ سارجنٹ غصے سے بولا۔

”میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی، آپ میری بیوی سے پوچھ لیں۔“ وہ صاحب معصومیت سے بولے۔

”کیوں بیگم صاحبہ! کیا آپ گواہی دیں گی کہ

آپ کے شوہر نے نہ تو سگنل توڑا اور نہ ہی گاڑی تیز چلائی۔ میں آپ جیسی معزز خاتون سے جھوٹی گواہی کی توقع نہیں کرسکتا۔"

"میں تو ایک بات جانتی ہوں۔" خاتون نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ "جب میرے میاں نشے میں ہوں اور ڈرائیونگ لائسنس گھر بھول آئیں تو ان سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔"

ورزش کے اثرات

ایک نوجوان نے اپنے دوست کو بتایا۔ "زیادہ ورزش کی وجہ سے میں ان دنوں اعصابی انتشار کا مریض بن کر رہ گیا ہوں۔"

دوست نے مشورہ دیا۔ "تو پھر تم ورزش نہ کیا کرو۔"

نوجوان بولا۔ "ورزش میں نہیں..... سامنے فلیٹ میں رہنے والی شوخ و چنچل حسینہ کرتی ہے۔"

چاہت کے انداز

بیوی کو شادی کے چند سال بعد خیال آیا کہ اگر وہ اپنی شوہر کو چھوڑ کر چلی جائے تو شوہر کیسا محسوس کرے گا؟ یہ خیال اس نے کاغذ پر لکھا۔

"اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی، میں بہت بور ہوگئی ہوں۔ میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر جارہی ہوں۔" اس کاغذ کو اس نے میز پر رکھا اور شوہر کے آنے کا وقت ہوا تو اس کا ردعمل دیکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے چھپ گئی۔

شوہر جب آیا نے میز پر رکھا کاغذ کھول کر پڑھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کاغذ پر کچھ لکھا۔ پھر خوشی کے مارے جھومنے اور گیت گانے لگا۔ رقص کرتے ہوئے کپڑے بدلے۔ پھر اس نے اپنے فون سے کسی کو فون کیا اور کہا۔

"آج میں آزاد ہوں اور تم سے ملنے آرہا ہوں۔ تیار ہوکر میرے گھر کے سامنے والے پارک میں آجاؤ۔"

شوہر باہر نکل گیا تو آنسو بھری آنکھوں سے بیوی بیڈ کے نیچے سے نکلی اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے کاغذ پر لکھی لائن پڑھی، لکھا تھا۔

"بیڈ کے نیچے سے تمہارے پاؤں دکھائی دے رہے ہیں۔ میں پارک کی قریبی دکان سے بریڈ لے کر آرہا ہوں، تب تک چائے بنالینا۔"

نسخہ شادمانی

بیوی: "دیکھو نا، ہمارے پڑوسی نے پچاس انچ کی ایل سی ڈی خریدی ہے۔ آپ بھی خرید لائیے نا۔"

شوہر: "ارے ڈارلنگ! جس کے پاس تمہارے جیسی خوب صورت بیوی ہو، وہ کیوں کر فالتو وقت ٹی وی دیکھنے میں برباد کرے۔"

بیوی: "اوہ، آپ بھی نا..... میں ابھی آپ کے لیے پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔"

☆☆

بیوی: "آپ میری سالگرہ کا دن کیسے بھول گئے؟"

شوہر: "بھلا تمہاری سالگرہ کا دن کوئی کیسے یاد رکھے۔ تمہیں دیکھ کر ذرا بھی نہیں لگتا کہ تمہاری عمر بڑھ رہی ہے۔"

بیوی آنسو صاف کرتے ہوئے۔ "رکیں، ابھی آپ کے لیے کھیر لے کر آتی ہوں۔"

بے چارگی

"تمہاری یہ جرأت کہ تم میرے ڈیڈی کو بے ہودہ اور فضول انسان کہہ رہے ہو؟" لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"تو اور کیا کہوں۔" بوائے فرینڈ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "میں ان سے تمہارا رشتہ مانگنے گیا، میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس پر وہ بولے "کوئی بات نہیں، تدفین کا خرچ میں اٹھالوں گا۔"

☆

pklibrary.com

شگفتہ جاہ

یادگار حدیث

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

"کون سا اسلام بہتر ہے؟" (یعنی اس کی کون سی خصلت یا کون سی خصلت والا شخص بہتر ہے؟)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم کھانا کھلاؤ لوگوں کو سلام کرو، چاہے تم پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔"

(بخاری)

دیدارِ الٰہی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت جبرائیل علیہ السلام سے فرمائے گا۔

"اے جبرائیل! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں جس کی بصارت چھین لوں اس کا اجر کیا ہے؟ اس کا اجر یہ ہے کہ میں اسے اپنے دیدار کی دولت دوں گا۔"

فتنوں کا دور،

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"فتنوں سے بچ کر رہو، اور کوئی آدمی خود اُٹھ کر فتنوں کی طرف نہ جائے کیونکہ اللہ کی قسم! جو بھی از خود اُٹھ کر فتنوں کی طرف جائے گا، اسے فتنے بہا کر لے جائیں گے جیسے سیلاب کوڑے کے ڈھیروں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ فتنہ جب آتا ہے تو بالکل حق جیسا لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جاہل کہتا ہے کہ یہ تو حق جیسا ہے۔ (اس وجہ سے لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں) لیکن جب جاتا ہے تو اس وقت صاف پتا چل جاتا ہے کہ یہ تو فتنہ تھا۔ لہٰذا جب تم فتنے کو دیکھو تو اس سے بچ کر رہو اور گھروں میں بیٹھ جاؤ اور تلواریں توڑ ڈالو اور کمان کی تانت کے ٹکڑے کر دو۔"

صبر کی جزاء،

حضرت داؤد علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے دریافت کیا۔

"الٰہی! اس شخص کی جزا کیا ہے جس نے مصیبت اور غم میں تیرے واسطے صبر کیا۔"

فرمایا "اس کو ایمان کی خلعت پہناؤں گا اور اس کو کبھی اس سے چھینوں گا نہیں۔"

سامانِ دُنیا،

ایک روز حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ لوگوں کے ساتھ گفتگو میں مشغول تھے، اتنے میں ان کی بیوی آئیں اور کہا۔

"تم یہاں بے فکر بیٹھے ہو۔ خدا کی قسم آج گھر میں کچھ خرچ کو نہیں ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "اے بیوی! ہمارے سامنے ایک مشکل اور دشوار گزار پہاڑ ہے۔ اس پر سے وہ گزر سکے گا، جس پر بوجھ کم ہوگا۔"

یہ سن کر ان کی بیوی خوش ہو کر واپس چلی گئیں۔

نفس امارہ انسان کو رسوا کر دیتا ہے،

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ کسی درویش کو بخار ہو گیا تو کسی نے اس سے کہا کہ فلاں شخص سے گل قند لے کر کھا لو کہ تمہارا

بخار جاتا رہے گا۔

اس درویش نے کہا: "میں موت کی تلخی تو برداشت کر سکتا ہوں مگر اس بد اخلاق اور ظالم سے گل قند لے کر نہیں کھا سکتا۔"

دانا اس سے کچھ نہیں لیتا جو متکبر ہو۔ اکثر خواہشات انسان کو رسوا کر دیتی ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس پر قابو پائے۔ اگر وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتا رہے گا۔ تو نامراد ہی رہے گا۔

تنگی کے وقت اس شخص کی حالت خراب ہو جاتی ہے جو فراخی کے وقت اپنے معدے کو پُر رکھتا ہے۔ زیادہ کھانے والے کو اس کا پیٹ ہی مار ڈالتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خالی اور بھوکا پیٹ مانگنے سے بہتر ہے۔

(حکایات سعدی۔ گلستان)

آخرت کے بدلے

ایک شخص عامر بن عبد قیسؒ کے پاس گیا۔ اس وقت وہ جو کی روٹی اور سبزی کھا رہے تھے۔ اس شخص نے دریافت کیا۔

"کیا تم نے دُنیا سے بس اتنے ہی پر قناعت کر لی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اس سے کم درجہ اور کم پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔"

اس شخص نے پوچھا: "وہ کون ہے؟"

جواب دیا: "وہ جس نے دُنیا دے کر آخرت خریدی ہے، وہ اس سے بھی کم پر قناعت کرتا ہے۔"

حکومت کیسے چلائیں؟

ہشام بن عبدالملک کا دورِ خلافت تھا۔ اس نے شیخ ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ سے جو بہت بڑے عالم تھے، دریافت کیا۔

حکومت و ریاست میں نجات کی تدبیر کیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔

"اس کی تدبیر یہ ہے کہ جو درہم تم لیتے ہو، حلال طور پر لو اسے ایسے شخص کو دو جو اس کا حق دار ہے۔"

ہشام نے دریافت کیا: "یہ کام کون شخص انجام دے سکتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "یہ کام وہ کر سکے گا جو دوزخ کے عذاب سے ڈرے اور بہشت کو دوست رکھتا ہو۔"

اسمِ اعظم

کسی نے خواجہ ابراہیم بن ادھم سے پوچھا۔

"کیا آپ کو اسمِ اعظم یاد ہے؟ فرمائیے کہ وہ کون سا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "معدے کو لقمۂ حرام سے پاک رکھو اور دل کو دُنیا کی محبت سے خالی کر لو تو پھر جو اسم — پڑھو گے، وہی اسمِ اعظم ہے۔"

ارجمند یاسر۔ کراچی

انمول موتی

- سخت کلامی آگ کا وہ شعلہ ہے جو ہمیشہ کے لیے داغ چھوڑ جاتا ہے۔
(افلاطون)
- مصیبت سب سے بہترین کسوٹی ہے جس پر دوست یار پرکھے جا سکتے ہیں۔
(تلسی داس)
- جو شخص وعدہ خلاف ہے، وہ ساری قوم کے لیے وجہِ شرمندگی ہے۔
(زرتشت)
- کوئی بھی چیز مفت میں اتنی نہیں ملتی، جتنی کہ نصیحت۔ (ڈک ڈی لا)
- خواہشات کی یلغار انسان کو کمزور بنا دیتی ہے۔ (سقراط)

نمرہ، اقرا۔ کراچی

اچھی باتیں،

- دُکھ انسان کے مرنے کا نہیں ہوتا، بلکہ محبت اور خلوص کے رشتوں کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔
- کوئی گناہ لذت کے لیے مت کرنا، کیونکہ لذت ختم ہو جائے گی، گناہ باقی رہ جائے گا اور کوئی نیکی تکلیف کی وجہ سے مت چھوڑنا کیونکہ تکلیف ختم ہو جائے گی، نیکی باقی رہ جائے گی۔
- دوستی، بھروسا، دل، رشتہ، وعدہ، پیار کبھی مت توڑنا، کیونکہ جب یہ ٹوٹ جاتے ہیں تو آواز نہیں آتی لیکن درد بہت ہوتا ہے۔
- اپنے خیالات کو اپنا جیل خانہ نہ بناؤ۔
- تاریخ کو یاد رکھنے کے بجائے تاریخ بنانے کی فکر کرنا چاہیے۔

نادیہ یاسر۔ گوجر خان

حضرت بایزید بسطامیؒ کا چراغ،

حضرت بایزید بسطامیؒ کے پڑوس میں ایک آتش پرست رہتا تھا۔ اس کا ایک شیر خوار بچہ رات کی تاریکی میں رو تا رہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ آتش پرست ایک غریب شخص تھا۔ اور چراغ جلانے کے لیے بھی اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک رات بچہ بہت رویا۔ حضرت بایزید بسطامی اٹھے اور اپنا چراغ اس کے گھر چھوڑ آئے۔ بچہ چپ ہو گیا۔ دوسری رات بھی حضرت بایزید بسطامیؒ نے ایسا ہی کیا۔ اور پھر تیسری رات بھی۔ آپ کے اس سلوک کا اس آتش پرست کے دل پر بڑا اثر ہوا اور اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"جب شیخ بایزید بسطامیؒ کی روشنی ہمارے گھر میں آ پہنچی ہے تو اب ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم کفر کی تاریکی میں ہی بھٹکتے رہیں۔"

وہ دونوں اٹھے — شیخ بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔

(تذکرہ اولیاء)

گوہر نایاب،

- جب تم کسی شہر میں چوروں کو حکمران بنتے دیکھو تو اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یا تو اس ملک کا سسٹم کرپٹ ہے یا وہاں کی عوام۔

(ول کوان یو)

- دُنیا کے کسی موضوع پر اتنی خرافات نہیں لکھی گئیں جتنی شادی کے مسئلے پر۔

(جارج برنارڈ شا)

- جنگ محبت سے بہتر ہے کیونکہ جنگ کے آخر میں تم زندہ رہتے ہو یا مر جاتے ہو لیکن محبت کے آخر میں تم نہ مرتے ہو نہ جیتے ہو۔

(ہسٹلر)

- عام لوگوں کی خواہشات اور امیدیں ہوتی ہیں، کامیاب لوگوں کے مقصد اور منصوبے ہوتے ہیں۔

(بل گیٹس)

- خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیاروں کا کام دیتی ہیں۔

(البیرونی)

نمرہ، اقرا۔ کراچی

برکت،

حضرت یحییٰ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

"تین چیزیں جس گھر میں ہوں، اس سے برکت اُٹھ جاتی ہے اور وہ تین چیزیں یہ ہیں۔

1۔ فضول خرچی۔
2۔ بدکاری۔
3۔ خیانت۔

عابدہ نثار۔ کراچی

خالد مجید جامی

ریحانہ چوہدری _____ مدوکے

دل تمنا نہ بنے آنکھ تماشائی نہ ہو
کام ایسے کر دو جگ میں رسوائی نہ ہو
اس زمانے میں ہے رواج ریاکاری کا
اُٹھ وہاں سے جہاں قدر سا فزائی نہ ہو

سعدیہ _____ لاہور

پھر کسی دن رجوع کر لیں گے
ہجر ہے ... تیسری طلاق نہیں

زبیدہ _____ پشاور

یہ کہہ کے پھینک دیے اہل کارواں نے چراغ
ہمیں تو شہر میں ہونا ہے شام سے پہلے

ثمینہ خان _____ مردان

کہاں تک اور بھلا جاں کا ہم زیاں کرتے
بچھڑ گیا ہے تو یہ اس کی مہربانی ہے

اقصیٰ ناصر _____ گلستان جوہر

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گزر کیوں نہیں جاتا
وہ ایک ہی چہرہ تو نہیں سارے جہاں میں
جو دور ہے وہ دل سے اتر کیوں نہیں جاتا

نمرہ اقرا _____ کراچی

کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے، دل کی بستی
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

ثوبیہ شہزادی _____ قصور

ٹھیک ہے جرأت انکار نہیں ہے لیکن
ہم تیری بات پہ پہلو تو بدل سکتے ہیں

فاکہہ سہیل _____ کراچی

ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغ بے وفا نکلا
یہ پوچھے ان سے کوئی، وہ غلام کس کا تھا
گزر گیا وہ زمانہ کہوں تو کس سے کہوں
خیال دل کو میرے صبح و شام کس کا تھا

حاجرہ _____ سیالکوٹ

وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مسیحا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

صدف عمران _____ کراچی

دل کو تری چاہت پہ بھروسا بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

ندا طارق _____ فیصل آباد

سو گئی شہر کی ہر ایک گلی
اب تو آجا کہ رات بھیگ چلی

نشاء اویس _____ کراچی

ہے دعا ان کے فریبوں کی تپش میں نہ جلو
تم نے جس جس پہ بھی احسانوں کی بارش کی ہے

زرینہ خانم لغاری _____ مظفر گڑھ

تیرے دن اچھے ہیں سو ہم سے کنارہ کر لے
ہم برے لوگ برے وقت میں کام آتے ہیں

فضہ بلال _____ کراچی

ہم خرابوں میں ایک خوبی ہے
ہم مصیبت میں کام آتے ہیں

ارم کمال _____ فیصل آباد

وہ گلے ملتا ہے ملبوس بچا کر اپنا
زندگی کیسی تکلف دار بنا لی اس نے

نادیہ یاسر _____ کراچی

آمد دوست کی نوید کوئے وفا میں عام تھی
میں نے بھی ایک چراغ ساحل سر عام رکھ دیا

ہما کامران _____ کراچی

ہر حال میں ہنسنے کا ہنر پاس تھا جن کے
وہ رونے لگے ہیں تو کوئی بات تو ہو گی

pklibrary.com

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔37۔اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

سلمیٰ مسرت نے خیابان سرسید راولپنڈی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

35 سال ہو گئے بلکہ اب تو 36 سال ہونے لگے ہیں۔اس محبوب ڈائجسٹ کے ساتھ مستقل تعلق کو۔

یہ چند مہینے مصروفیت کی انتہا لے کر آئے۔عید کے بعد شوال کے چھ روزے، مہمانوں کی مستقل آمد، دراصل اسلام آباد کے مرکز میں رہنے کی وجہ سے لاہور والے اور دیگر میرے میاں کے بھانجے بھتیجے شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے ان دنوں میں ضرور آتے ہیں پھر میرے گھر میں ماشاءاللہ جنوری میں آنے والے دو ننھے فرشتے میری پوتی سارہ اور پوتا محمد زید بہت شرارتی ہو گئے ہیں، ان کی وجہ سے وقت بہت کم ملتا ہے۔

مکمل ناول اچھے جا رہے ہیں شعاع میں اور خواتین میں سمیرا حمید اور سائرہ رضا یا عنیزہ سید کا خوب صورت سا ناول شروع کریں۔

نئی رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں پرانی رائیٹرز کو بھی اللہ تعالیٰ ہر قسم کا سکون اور خوشی عطا کرے تاکہ وہ اپنے خوب صورت لفظوں سے ہماری رہنمائی کرتی رہیں آمین۔

ج: پیاری سلمیٰ! سمیرا حمید، سائرہ رضا اور عنیزہ سید تینوں ہی ہماری بہت اچھی مصنفین ہیں۔ ہمیں بے حد پسند ہیں۔ کوشش کریں گے کہ ان کے ناول شامل کیے جائیں۔

پوتی اور پوتے کی آمد پر مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور خوش بختی سے نوازے۔ آمین۔

الفت زہرہ ہراج، اقصیٰ ماہ نور ہراج۔ داؤد والا، تلمبہ سے شرکت کی ہے

شعاع کا ٹائٹل بے حد پسند آیا۔ پہلی شعاع، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں کو پڑھا اور دوڑ لگائی اپنے فیورٹ ناول عسر یسرا کی طرف جو کہ بہت ہی پیارے انداز سے آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس اور جنت کا بچپن کرب ناک ہے۔ جنت کی معصومانہ حرکتیں بے حد بھائیں اور ڈاکٹر مصطفیٰ کس قدر فرشتہ صفت انسان ہیں اور اعظم شیرازی ہاشل میں جب فارس کو انتہائی حقارت سے پیسے دیتا ہے۔ بلکہ پھینکتا ہے تو بے ساختہ رونا آیا۔

اس کے بعد نور القلوب پڑھا۔ شیریں صندل بی کی بات مان کر ہدایت پر آ گئی۔ اچھا لگا لیکن کچھ لوگ پیروں فقیروں کو خدا کا درجہ دے دیتے ہیں اور سارا یقین پیروں پر رکھتے ہیں خیر، گلے بے چاری لاریب کو کیا کیا سمجھائے، لاریب کی کتوں سے محبت اور ہر وقت بیزاری، اکتاہٹ گلے جی، یہ لاریب آپ کو بہت مف ٹائم دینے والی ہے۔ خوشل خان کا ذکر بہت کم تھا۔ حال میں داؤد دکھی ہے لیکن مہر افروز کا کوئی ذکر نہیں۔

''شام کی حویلی'' بہت سست روی سے چل رہا ہے۔ سارے کردار ہی دکھی اور پریشان۔ کسی کو تو ٹھیک کریں۔ موحد اور کشف ہیں تو وہ ناراض۔ ڈھائی سال ہو گئے لیکن سونیا آذر کی آپس میں کوئی نہ کوئی لڑائی ہی دکھائی۔ یہ شائستہ ہے کون؟ اور ثمینہ اپنے شوہر اور بیٹے کو جتنا تنگ کر رہی ہے۔ حیدر اسے نکال باہر کرے فضول عورت کو۔

شناخت مہوش طالب کی کہانی نے دماغ کی دہی بنا

ڈالی، اف بڑی مشکل سے کہانی سمجھ میں آئی۔ جادو ایسے ہی زلیل و رسوا کرتا ہے جیسے بانو بیگم ہوئی۔ شعاع کے ساتھ میں ریحانہ وقاص اور فرحانہ مہناز کا انٹرویو پسند آیا اور صائمہ اکرم سے ملاقات زبردست رہی۔

ج: الفت، زہرہ، اقصیٰ اور ماہ نور! کہاں غائب تھیں آپ؟ کافی عرصہ بعد آپ نے شعاع میں شرکت کی۔

شام کی حویلی اب اختتام کی طرف جا رہا ہے۔ جلد ہی ساری گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ حیدر نے آپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ثمینہ کو اپنی زندگی سے باہر نکال دیا ہے شائستہ طاہرہ بیگم کی بھانجی ہے جو باہر رہتی ہے۔

اقراء سرور ڈی جی خان سے لکھتی ہیں

آج بنت سرور شعاع کی دہلیز پر اپنے ہاتھوں میں تبصرہ لیے کھڑی ہے۔ اسے یہاں آنے پر حسنہ حسین نے مجبور کیا ہے۔ حسنہ حسین بھی کمال کرتی ہیں۔ حرف حرف اچھوتا احساس دلاتا۔ ہر منظر سحر میں جکڑتا۔ ایسے کہ بندہ خود کو شیراز ولا میں موجود پائے.....

رفعت یوسف سحر کے انتظار میں پہلی کاوش چھپنے پر مبارک باد۔ ''شام کی حویلی میں'' زینب کا کردار پسند ہے کشف بلال کو ملنی چاہیے بس یوں ہی میرا دل کر رہا ہے۔ ردا کی موت نہیں بھولتی کیونکہ ان ہی دنوں میری بھانجی صغریٰ مر گئی۔ کینسر تو چلو شاید جان بخش دیتا۔ لیکن جہالت اس کو نگل گئی۔ حق ہا؟

''بہت کام ہیں'' مریم جی! بہت اچھی تحریر۔ جون کا شمارہ اور اس میں منعم ملک کا افسانہ ''فریب'' جزاک اللہ منعم جی؟ اللہ ہر لڑکی کو دل کے اس فریب سے بچائے۔ خوش گمانیاں کبھی کبھی مروا بھی دیتی ہیں۔ شازیہ الطاف ہاشمی ایک بہترین افسانہ نگار ہیں۔ مجھے ان کا افسانہ ''کالا پتھر'' نمبر ون افسانہ لگتا ہے۔ ''تو میری آرزو'' نام جچ نہیں رہا تحریر کے ساتھ۔

''خط آپ کے'' جناب ہمارے سر آنکھوں پر، سب سے پہلے پڑھا جانے والا سلسلہ ڈی جی خان والیو؟ خوش آمدید۔ ڈاکٹر فریال صاحبہ آپ خود کسی بہن کو یاد نہیں فرماتیں..... اور ہم آپ کی پڑتال نہ کریں تو شکوے۔

اف بھول گئی، نازیہ رزاق بہت اعلا قسم کی تحریریں ہوتی ہیں ان کی۔ تو ان کو دعائیں میری۔ منشاء محسن بھی خط بھی لکھو۔ میری چھوٹی سی خواہش ہے۔ پوری کر دو؟ پتا ہے منشاء میں بھی گاؤں والی ہوں۔ سرائیکی اور پینڈو۔

ساڈے بے شک کوٹھے کچے ہن
اساں رب کا دا شکر کریندے ہین

صفیہ مہر ماہ شاہ اللہ اتنا پیارا مسکن..... بیر کھانے کے ہم بچپن سے شوقین ہیں۔ آپ کے گھر بھاگے آئیں گے بیر کھانے۔ ہمارا حصہ بچا کر رکھیے۔ پاپا ''بنت سحر'' یاد ہے کی کو مجھے نہیں بھولتی نجانے کیوں وہ میری دعاؤں میں آجاتی ہے۔ ''کچھ لڑکیوں کو دیو قید کر لیتے ہیں لیکن ان کو کوئی شہزادہ آزاد کروانے نہیں آتا۔ کیونکہ وہ شہزادیاں نہیں ہوتیں۔''

ہم عام سی لڑکیوں کے لیے کچھ بھی خاص نہیں ہوتا ذہن ماؤف سا ہے دل راکھ ہے۔ ایک خصوصی فرمائش، میں نے اپنی بھانجی کی موت پر ایک تحریر لکھی ہے، کیا آپ وہ شائع کریں گی؟

ج: پیاری اقراء! اس بار آپ کا خط پڑھ کر لگا۔ آپ کا ذہن منتشر ہے۔ یکسوئی کی کمی نظر آئی، بہت بے ربطی کا احساس ہوا۔ حالانکہ آپ نے تبصرہ بہت اچھا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام پریشانیاں دور فرمائے۔ آمین۔

آپ کی بھانجی کی وفات کا بہت افسوس ہوا۔ اس کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔ آپ اس کے بارے میں لکھنا چاہتی ہیں۔ ضرور لکھیں۔

مدیحہ پتافی نے راولپنڈی سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین گزشتہ چوبیس برسوں سے پڑھ رہی ہوں۔ جب میں کلاس نہم کی طالبہ ہوتی تھی، پچھلے ماہ خواتین ڈائجسٹ میں خط بھیجا تو سوچا شعاع بھی تو میرا ویسے ہی پیارا ہے جیسے خواتین اور خط لکھنے کی تو میں ہمیشہ سے شوقین رہی ہوں۔

کسی بھی ڈائجسٹ، کتاب، ناول کو پڑھنے کے لیے میرا پڑھنے کا موڈ آن ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ موڈ اگر آن ہو تو..... راولپنڈی سے جام پور کا آٹھ گھنٹے کا طویل سفر کرتے ہوئے کار میں بھی شعاع، خواتین پڑھتی رہتی ہوں اور اگر یہ موڈ آف ہو تو بہت اہتمام کے ساتھ رقیہ کی بنائی ہوئی چائے، ٹیرس پر رکھی آرام کرسی اور ٹھنڈی ہوا بھی کچھ کارگر ثابت نہیں ہوتیں اور میں بند دماغ کے

pklibrary.com

ساتھ صفحہ پر صفحہ الٹائے جاتی ہوں۔

اب کل دوپہر کو جب گرمی چالیس درجے کی تھی۔ بیل ہونے پر رقیہ نے شعاع لاکر مجھے دیا تو چونکہ پڑھنے کا موڈ آن تھا تو وہیں کچن کے پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور پیاری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری باتوں سے ہوتی ہوئی تاریخ کے جھروکوں میں جا جھکی میرے میں نے میاں جی کو ''تاریخ کے جھروکوں سے'' بہت پسند ہے۔ ''آئینہ خانہ'' کو دیکھتے ہوئے شاعری پر آرکی۔ گلزار صاحب اور محسن نقوی صاحب کی شاعری بہت پسند آئی۔ ''خط آپ کے'' کی طرف آئی اور سب بہنوں کے خطوط خوب دل لگا کر پڑھے۔ صفیہ مہر کا خط سب سے اچھا لگا وجہ! ایک تو ان کی تحریر کی بے ساختگی اور دوسرا میری اپنی سرائیکی زبان کے الفاظ ''دریاں (کھڑکیاں)'' اور ''اندھاری (آندھی)''! اب تحریر کی طرف آئی تو سب سے پہلے ''ایک فیس بک سوافسانے'' ناولٹ پڑھا بہت پیاری تحریر جس نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ جب کہانی اختتام کو پہنچی تو میں چونک کر اپنی دنیا میں واپس آئی۔ شمائلہ والعباد بہت شاندار لکھا آپ نے۔ اپنی پیاری مصنفہ صائمہ اکرم چوہدری کا انٹرویو پڑھا۔ ''شعاع کے ساتھ ساتھ'' میں ریحانہ وقاص اور فرحانہ مہناز سے ملاقات کی، ریحانہ وقاص سے ریحانہ چوہدری یاد آگئیں جو مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ کافی دنوں سے ان کا کوئی خط یا تحریر نہیں پڑھی۔

عندلیب زہرا کی تحریر ''ہاں قبول ہے'' پڑھی شروع شروع میں بہت روایتی تحریر لگی مجھے، جس میں سوتیلی ماں اور بیٹی کی گھسی پٹی کہانی ہوتی ہے مگر جیسے جیسے پڑھتی گئی۔ میری رائے تبدیل ہوتی گئی اور جب ہانیہ، نبیلہ بیگم کے گلے لگ کے روئی تو ان ماں بیٹی کے ساتھ میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

رقیہ جھٹ سے دم والی چائے بنا لائی اور تاکید کی کہ باجی خواتین ڈائجسٹ والے خط میں آپ نے سیف اللہ (ملازم) کا نام لکھا تھا۔ اب میرا نام شامل نہ کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔ اس کی باتیں سن کر میری بڑی بیٹی ماہم (عمر بارہ سال) بھاگ کر میرے پاس آئی اور کہا ''امی! شعاع والوں کو بتایئے گا میں رقیہ سے اچھی چائے بناتی ہوں!

ماہ وش طالب کا افسانہ ''شناخت'' شروع میں متاثر کن لگا مگر اختتام تک پہنچتے پہنچتے میری رائے تبدیل ہوگئی حالانکہ مصنفہ کا انداز تحریر بہت متاثر کن تھا مگر میری ذاتی رائے میں، کرداروں سے انصاف نہ کر سکیں وہ!

اور ہاں ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آپ سب سے ایسی اپنائیت محسوس کرتی ہوں جیسے میرے گھر کے افراد ہوں سب۔

ج: پیاری مدیحہ! آپ کا خط بہت اچھا ہے لیکن خط سے بھی اچھی آپ کی لکھائی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے موتی پروئے ہوں۔ بہت صاف ستھری تحریر ہے۔ آپ کی شعاع کی محفل میں آپ کی شرکت سے خوشی ہوئی۔ اب ہماری محفل میں باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

ماہم! اچھی چائے تو ہماری کمزوری ہے، کبھی آپ کے ہاتھ کی بنی چائے پینے ضرور آئیں گے۔

گلشن شفیع، وائف آف احمد شہزاد نے گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ایم اے اردو، ایم اے پولیٹکل سائنس اور بی ایڈ کیا ہے عمر چونتیس سال اور گزشتہ سات سال سے خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہوں، لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں میرے لیے خاص دعا کریں۔ ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہوں اور گزشتہ بیس سال سے آپ کے تینوں پرچوں کی مستقل اور مسلسل قاری ہوں مجھے لگتا ہے کہ میری تربیت ہی ان پرچوں نے کی ہے۔ کیوں کہ میری والدہ ان پڑھ تھیں۔ انہوں نے ہمیں پالا لیکن باقی ساری تربیت ان پرچوں نے کی۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ یہ ایک دوست ہے جو ساری پریشانیاں سمیٹ لیتا ہے۔ کبھی سمیرا حمید کے لفظوں کی صورت تو کبھی عمیرہ احمد کے خوب صورت فلسفۂ زندگی کی صورت۔ میں تب سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں جب صائمہ اکرم خط لکھتی تھیں گزرتے سالوں میں شازیہ چوہدری و فرحانہ ناز ملک، خالدہ جیلانی، معیز اکرم اور آسیہ رزاقی کی المناک وفات کے صدمے سہے پر آپ کو خط لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اب حوصلہ کیا ہے اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ایک افسانہ بھی لکھا ہے۔

پیاری گلشن تاخیر سے سہی آپ نے ہماری محفل میں شرکت تو کی، بہت خوشی ہوئی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو نیک اور خوش بخت اولاد کی نعمت سے نوازے۔ آمین

افسانہ بھجوا، دیں قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔

ارم کمال فیصل آباد سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے آپ کو اور شعاع کی ساری ٹیم کو عید قربان کی بہت بہت مبارک باد۔

ٹائٹل نہایت جاذب نظر اور دلکش رہا۔ پہلی شعاع سے ہوتے ہوئے حمد اور نعت سے دل کو سرور بخشتا پیاری۔ نبی کی پیاری باتیں میرا موسٹ فیورٹ سلسلہ ہے جس سے زندگی کے سفر میں آگے بڑھنے کا راستہ نظر آتا ہے۔ وہ راستہ جس پر چل کر ہم اللہ کے محبوب بندے بن سکتے ہیں۔ ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' میں بہن ن۔ش کے لیے دل بے حد تڑپا میری دعا ہے ن۔ش بہن کے لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شوہر کے دل میں ان کے لیے ڈھیر ساری محبت اور عزت بھر دے آمین۔ بندھن میں مہوش اختر سے ملاقات مزے دار رہی۔ دستک میں میری پسندیدہ رائٹر صائمہ اکرم چوہدری سے ملاقات دل گارڈن گارڈن کر گئی۔ ''شام کی حویلی میں'' جھٹکے پہ جھٹکے لگ رہے ہیں۔ شمارے کی سب سے زبردست اور اچھوتی تحریر شائمہ العباد کی رہی ''ایک فیس بک سو افسانے'' صد شکر یہ سب خواب تھا نیہہ کا۔ میری نانی مرحومہ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، کہا کرتی تھیں کہ بیٹا صبر کرتے ہیں۔ کسی کی ریس (نقل) نہیں کرتے۔ کسی کا منہ لال ہو تو اپنا چپڑیں مار کر لال نہیں کرتے۔ ''تو ہی میرا مہربان ہے'' کچھ خاص متاثر نہیں کر سکی۔ کچھ فلمی سا ٹچ تھا۔ عندلیب زہرا ''ہاں قبول ہے'' دل سرشار کر گئیں۔ سلسلے وار ناول ''عسر یسرا'' سوپر ڈوپر جا رہا ہے۔ جنت کہاں گئی ہوگی۔ دل کو پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے سلسلے وار ناول ''نور القلوب'' نے تو مسمرائز کر دیا ہے۔ بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرتا، اگلی قسط کا بے حد بے چینی سے انتظار ہے۔ خط آپ کے کسی دلچسپ افسانے سے کم نہیں۔

ج: پیاری ارم! آپ کی نانی کی نصیحت بہت اچھی تھی، سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں بہت ساری نعمتوں سے نوازا ہے۔ دوسروں کی باتوں میں آ کر ناشکری نہیں کرنا چاہیے۔ پھر زندگی میں اگر کچھ کمی ہے، کوئی خواہش یا تمنا ہے تو اللہ سے دعا مانگنا چاہیے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دعا کی قبولیت میں کچھ وقت لگ جائے لیکن دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی، اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ شائمہ نے اپنے ناولٹ میں بڑی خوب صورتی سے اس نکتہ کو اجاگر کیا ہے۔

ملتان سے کرن بخاری نے لکھا ہے

بچپن سے شعاع اور خواتین پڑھتی آئی ہوں۔ اور اب چار بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی ان کا اور میرا ساتھ جاری ہے۔

شعاع کی سب ہی کہانیاں اچھی اور سبق آموز ہوتی ہیں، سب سلسلے وار ناولز بھی اچھے جا رہے ہیں۔ ''شام کی حویلی میں'' کا اب اینڈ کر دینا چاہیے اس کا ڈپریسیو پیریڈ بہت لمبا ہو گیا ہے۔ اس ماہ قرۃ العین ہاشمی کا افسانہ ''ایک دن تمہارے ساتھ'' بہت اچھا لگا۔ اپنی اپنی اینڈنگ کے ساتھ مزہ دے گیا۔ مگر جس کہانی نے اس ماہ مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا، وہ ''ایک فیس بک سو افسانے'' ہے اس کا مرکزی خیال بہت اچھا تھا کہ لڑکیوں کو ادھر ادھر کی باتوں میں آ کر اپنا گھر خراب نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن کیا آپ سب کو بھی یہی لگتا ہے کہ نیہہ کا گھر خراب کرنے میں صرف فیس بک کی باجیوں کا ہاتھ تھا؟

کیا اس سب میں وہ غیر منصفانہ نظام ذمہ دار نہیں ہے جس کے تحت گھر کے سب کام صرف بہو کے ذمہ لگا دیے جاتے ہیں اور بیٹیوں کو صرف آرام سے بٹھایا جاتا ہے چاہے وہ غیر شادی شدہ بیٹیاں ہوں یا گھر بیٹھی مطلقہ یا بیوہ بیٹیاں۔ گھر کا ہر کام جب صرف ایک ہی فرد کی ذمہ داری بنا دیا جائے گا تو کیا وہ چڑچڑے پن کا شکار نہیں ہوگا اور ہمارے معاشرے میں جس میں بیشتر آبادی کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور بہویں جوائنٹ سسٹم میں ہی رہتی ہیں اور باہر جا کے روز روز کیا مہینے میں ایک آدھ بار کی

pklibrary.com

عیاشی بھی صرف سسرال والوں کی ناراضی کے خوف سے نہیں افورڈ کرسکتے تو وہاں اگر بیوی فرمائش کرکے کچھ منگوالے اور وہ اسے فہمیہ جتنا ہی ملے تو کیا اس کا دل نہیں جلے گا اور اس پر آپ کا شوہر بھی آپ کے جذبات سمجھنے کی بجائے آپ کو ہی نیت کا خراب کہے تو دل تو دکھتا ہے نا۔

گھر بگاڑنے میں باہر کے لوگوں کو یا سوشل میڈیا کو ذمہ دار ٹھہرانا ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی گھر کو آگ گھر کے چراغ سے ہی لگ جاتی ہے۔

ج: پیاری کرن! ہم آپ سے متفق ہیں۔ گھر میں بہو نوکرانی بن کر نہیں آتی، وہ گھر کا فرد ہوتی ہے۔ وہ اس گھر سے جہاں اس کی پرورش ہوتی ہے، نکل کر بالکل نئے ماحول میں آتی ہے۔ اس کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کے لیے سسرال والوں کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ سسرال والوں سے زیادہ یہ فرض شوہر کا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی ضروریات کا خیال رکھے۔ اس کی معصوم سی خواہشات کو پورا کرنے میں تنگ دلی سے کام نہ لے۔ آپ نے نوٹ نہیں کیا کہ شوہر کو بھی پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کا خیال کیوں نہیں رکھا، اس کو چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے کیوں ترسایا۔

جہاں تک گھر کے کام کاج کا تعلق ہے تو وہ سب کو مل جل کر ہی کرنا چاہیے۔ کسی ایک فرد پر کام ڈالنے سے کوئی بھی کام صحیح طریقے انجام نہیں پاتا اور ناانصافی سے بہت سے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔

کراچی سے تسنیم کوثر نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

گزشتہ ہفتہ ہم لوگ بچہ پارٹی، کچھ بچوں کی تھوڑی بہت شاپنگ کے لیے گئے تھے۔ گاڑی میں آگے میں اپنے دو سالہ پوتے کو لے کر بیٹھی تھی اور پیچھے میری بہو اور بیٹی بیٹھے تھے۔ جب ہم بچہ پارٹی کے سامنے پہنچے اور میرا بیٹا گاڑی پارک کرنے لگا تو فوراً ہی ایک شخص، آیا اور کہنے لگا۔ یہاں نہیں بلکہ تھوڑا اور آگے کھڑی کریں۔ خیر بیٹے نے تھوڑا آگے ہٹ کر گاڑی کھڑی کی، یقین جانیے جیسے ہی دروازہ کھلا، فوراً ہی سامنے اور پیچھے سے بائیک آکر رکی اور گن پوائنٹ پہ بیٹے سے موبائل اور والٹ حتیٰ کہ گاڑی کی چابی تک لے لی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ پارکنگ والا شخص غائب۔ چلتا ہوا مین روڈ جبکہ سامنے گارڈ بھی نظر آرہے تھے۔ ہم نے غور کیا ہے کہ کرونا کی آڑ میں ماسک سے چہرہ چھپا ہونے کی وجہ سے وارداتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔

اس بار شمائلہ والعباد کا ناول ایک ''فیس بک سو افسانے'' بہترین لگا۔ حقیقت یہی کہ فیس بک وغیرہ جیسی چیزیں پڑھنے اور اچھوائے کرنے کی حد تک تو ٹھیک ہے ان پر عمل کرنا دانائی ہے اور ہاں ہم یہ کچھ نہیں سمجھ سکے کہ فہمیہ کا یہ سب کچھ خواب ہی تھا نا، مطلب وہ اپنے گھر یعنی شوہر کے ساتھ ہی تھی، پلیز بتایئے گا۔

دستک میں شاہین رشید نے صائمہ اکرام سے عمدہ ملاقات کروائی۔ ''شام کی حویلی میں'' کی کہانی کو اب تیزی سے بڑھنا چاہیے، لگتا ہے بالکل تھم سی گئی ہے۔

☆ پیاری تسنیم! حالات ٹھیک کرنا ریاست اور حکومت کی ذمہ داری ہے۔ مہنگائی کا حال آپ کے سامنے ہے۔ صبح ایک چیز کی قیمت کچھ ہوتی ہے، شام کو کچھ ہوتی ہے۔ ہر دکان دار اپنی مرضی سے قیمتوں میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس پر بے روزگاری۔ جرائم تو بڑھنا ہی ہیں۔

شعاع آپ کو اچھا لگا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ شمائلہ والعباد کے ناول میں فہمیہ خواب دیکھ رہی تھی، حقیقت میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہی تھی۔

ریحانہ وقاص لاہور سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

''ایک فیس بک سو افسانے'' انتہائی شان دار تحریر تھی۔ ہم نے دو فعہ پڑھی، بہت مزا آیا پڑھ کر۔ ''حاضر جناب'' بھی اچھی تحریر تھی۔ ''تو ہی میرا مہربان ہے'' بس ٹھیک تھی۔ ''ہاں قبول ہے'' ایک عام سی تحریر تھی۔ ''عسر یسرا'' کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ انتہائی زبردست تحریر ہے۔ حسنہ حسین کو خصوصی مبارک باد، اتنا خوب صورت لکھنے پر۔ ''فریب'' ایک اچھی سبق آموز تحریر تھی۔ ''غلط فہمی'' بھی ایک خوب صورت افسانہ تھی۔ ''تو میری آرزو'' سبق آموز تحریر تھی۔ سارا رسالہ ہی شان دار تھا۔

☆ پیاری ریحانہ! ہماری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صالح، صحت مند، ذہین، خوش شکل اور اچھی قسمت والے بیٹے سے نوازے، آمین۔

pklibrary.com

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔

زوبیہ مظہر کوٹلی قاضی سے لکھتی ہیں

شعاع سے تعلق چھٹی ساتویں جماعت میں استوار ہوا اور اب تک قائم ہے۔ جب ہم ماسٹرز کو بھی گڈ بائے کہنے والے ہیں۔ شعاع کے معیار نے کبھی اس سے تعلق ٹوٹنے ہی نہیں دیا۔ سب سے پہلے رخسانہ نگار کے ناول پر پہنچے جو بہت سست روی سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ حسنہ حسین کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں، بہت خوب صورت، زبردست۔ جنت کے دوستوں نے بہت مزا دیا اور کاکا کی مچھلیاں..... اف، ہاہاہا۔ ٹیپو کے گھوڑے کے جب پر نکلیں گے تو میں ضرور دیکھنا چاہوں گی اور جنت کا پری ہونے یا نہ ہونے کے لیے خود کا ٹیسٹ..... بہت مزا آیا، بہت زبردست تحریر ہے، ویل ڈن حسنہ!

"ہاں قبول ہے" عندلیب زہرا نے بھی بہت اچھا لکھا۔ بہت اچھا سبق دیا مصنفہ نے۔ "حاضر جناب" پڑھ کر سعدیہ کے فیصلے پر خوشی محسوس ہوئی۔ "تو ہی میرا مہربان" نوشین فیاض نے بھی بہت اچھا لکھا۔ فرح تو آستین کا سانپ ثابت ہوئی۔ نیناں کا وزن کم ہونے کی خوشی ہمیں خود نیناں سے بھی زیادہ ہوئی۔ "نور القلوب" نے پہلی قسط میں ہی ٹھاہ کر کے ہیروئن کا کردار توڑ دیا۔ لو جی یہ کیسا ناول ہے جس میں ہیروئن کی انٹری اسٹارٹ میں ہی اتنی خطرناک قسم کی ہے۔ "ایک فیس بک سو افسانے" نام ہی اچھا نہیں لگا، اس لیے ابھی تک پڑھا نہیں ہے۔ ناولز کے نام ناولز جیسے ہی ہونے چاہئیں۔ معاشرے کے مسائل بیان ضرور کریں پر نام تو اتنے عجیب نہ رکھیں نا۔ "کھلتا کسی پہ" ہر بار کی طرح بہترین۔ صائمہ اکرم چوہدری سے ملاقات اچھی رہی۔ فرزانہ کھرل کی تحریروں کا انتظار رہتا ہے، بہت منفرد انداز بیاں ہے۔ ہر تحریر ہی پہلے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

اور ایک پیغامی میری ممانی (مصباح) نے کہا تھا کہ جب کبھی تم شعاع میں خط لکھو، یہ بھی لکھنا کہ جون جولائی میں "چھپا کے چھپئی" جیسی تحریریں ضرور دیا کریں، ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے (لیں جی آنٹی! مجھے یاد تھا آپ کا پیغام)۔

پیاری زوبیہ: شمائلہ دالعباد کا ناول آپ نے صرف نام دیکھ کر چھوڑ دیا۔ آپ یہ ناول ضرور پڑھیں۔ بہت دلچسپ ہے۔ صرف نام دیکھ کر فیصلہ کرنا تو درست نہیں۔ اسی طرح لاریب کے متعلق فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں، وہ بری لڑکی نہیں ہے۔ آپ کا تبصرہ جامع اور خوب صورت ہے۔ رابطہ رکھیے گا۔ آپ کی ممانی کا مشورہ فرزانہ کھرل تک پہنچا دیا ہے۔ ممانی کو ہمارا سلام پہنچا دیں۔

مظفر گڑھ سے زرینہ خانم لغاری نے لکھا ہے "شام کی حویلی میں" کشف کو کوئی سمجھائے۔ ایسے حالات میں ایسے بچوں کو اسٹرکٹر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ زینب نے اپنی جوانی تجھ پر وار دی۔ کنواری ہوتے ہوئے شادی شدہ کا زبردستی کا لیبل لگا دیا گیا۔ اس کو یہ صلہ دے رہی ہیں محترمہ کشف صاحبہ۔ "نور القلوب" بہترین جا رہا ہے۔ "تاریخ کے جھروکے" مزے دار سلسلہ ہے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" میں بھی ایک عزیزہ کا ناتا بھیجا تھا، کب تک چھپے گا۔ اس بہنا کا نام عائشہ منصور ہے۔ منصور اس کے شوہر کا نام ہے۔

☆ پیاری زرینہ! کشف ایک جذباتی اور قدرے بے وقوف لڑکی ہے جو بے سوچے سمجھے ہر کام کرنے کی عادی ہے۔ تھوڑا غور و فکر کرتی تو ان حالات کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ زینب نے جس محبت سے اس کی پرورش کی، محنت مشقت کر کے پڑھایا لکھایا۔ اس کا رویہ زینب کے ساتھ انتہائی نامناسب ہے۔ زینب ایک بے آسرا لڑکی تھی۔ اس کا کیا قصور ہے اس سب میں۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس، حریم فاطمہ

گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ٹائٹل اچھا لگا۔ مگر اف یہ گرمی۔ اتنی جیولری۔ شدید جھٹکا تو تب لگا جب دکاندار نے 70 کے بجائے 80 روپے دھروا لیے۔ "پہلی شعاع" کی باتیں پسند آئیں۔ اس بار عید کے چاند نے تو حد ہی کر دی۔ میرے چھوٹے ماموں رفیق، ان کی بہو شائستہ اور پوتی لائبہ عطاری اعتکاف میں بیٹھی تھیں۔ لو جی ماموں جی جو مسجد میں اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات بارہ بجے میسج آیا "بیٹا کیا عید ہو گئی؟" ہم نے کہا۔ "ہاں جی، اب صبح ہی آپ کو لینے آئیں گے۔"

"جب تجھ سے ناتا جوڑا" دونوں ناتے حسب حال

pklibrary.com

رہے۔ سب یہی لکھتی ہیں سسرالی ظالم دیو جیسا سلوک کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا جو بہویں یہ کہتی ہیں کہ بیٹا بیاہ دیا تو ماں باپ کا ان کی کمائی پر کوئی حق نہیں ہوتا، تو جن کی ایک ہی اولاد ہو تو کیا وہ بیٹے کو بیاہ کر خود قبروں میں جا کر لیٹ جائیں اور جہاں سسرال والے بہو کو کسی کی بیٹی نہیں سمجھتے، وہ سمجھتے ہیں۔ بہو نہیں بلکہ روٹی کپڑے کے بدلے میں نوکرانیاں لے آئے ہیں۔ نوکرانیاں تو پھر بھی ہر ماہ پیسے لیتی ہیں اور اپنی مرضی بھی کر لیتی ہیں مگر بہو کو ایسے عیش میسر نہیں ہوتے۔

''بندھن'' میں مہوش اختر کی باتیں اچھی تھیں۔

''دستک'' میں صائمہ اکرم ویل ڈن، اتنا اچھا ڈرامہ لکھا۔

''شعاع کے ساتھ ساتھ'' ریحانہ وقاص چھائی رہیں۔

''شام کی حویلی میں'' کشف اچھا نہیں کر رہی زینب کے ساتھ۔ میرے خیال میں بلال کو ایما کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہیے۔ نہ حیدر نے کوئی سکھ دیکھا زندگی کا نہ زینب نے۔ ثمینہ کیسی عورت ہے۔

''نور القلوب'' دل میں جگہ بنا رہا ہے۔ میرا اندازہ غلط نکلا کہ شیریں صندل بی بی ہے، ویسے مہر افروز کا اصلی دشمن کون ہے۔ کیا خود داؤد تھا، جو چاہتا تھا کہ شیریں بی بی ٹھیک نہ ہو، اریب اچھی ہیں۔ ''عسر یسرا'' شکر کہ قسط موجود تھی۔ جنت اور فارس کی ایک ماہ اور پچیس دن کی ملاقات ہمیں بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

جون کی بیسٹ تحریر مجھے نوشین فیاض کی ''تو ہی میرا مہرباں'' لگی۔ اتنی مزاحیہ تحریر اور اتنا افسوس ناک انجام قسم سے آنکھوں کی برسات شروع ہوگئی۔ نیناں از بیسٹ مگر کمال کی شخصیت ہارون بھی تھا۔ فرح نے اچھا نہیں کیا دونوں کے ساتھ۔ ناولٹ دونوں پسند آئے۔ میری تو چیخ نکل گئی جب اینڈ میں پڑھا کہ یہ سب خواب تھا۔ صد شکر اسے خواب ہی رہنا چاہیے ویسے بڑا بھیانک خواب تھا ناں۔ دوسرا ناول ''ہاں قبول ہے'' اچھا تھا۔ بات ہو جائے افسانوں کی تو جناب ایک دن تمہارے ساتھ صد شکر، ماں، بیوی دونوں نے سمجھوتا کر لیا اور ہیپی ہیپی لائف گزارنے لگے ورنہ بات معمولی سی تھی، وہی کے کسی جیسی۔

حاضر جناب بڑا کمینہ نکلا۔ منعم ملک معذرت کے ساتھ ''فریب'' کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ ابن آدم کی اولاد ہے تو لغزش نہ کرے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

''غلط فہمی'' رشتوں کو جوڑنے والی تحریر تھی۔

''شناخت'' کالا جادو والا تو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ کرنے والا بھی اور کروانے والا بھی۔

رمضان ختم ہوتے ہی گرمی نے انت اٹھائی ہے۔ اب جن کے گھر میں درخت ہیں یا بڑے بڑے (صحن) ہیں وہ تو رات خوب مزے سے سوتے ہوں گے۔ ٹھنڈی ہوائیں، تاروں بھرا آسمان اور آسمان پر ٹکا چاند، سہانے سپنے تو خود بخود آئیں گے نا۔ اور جنہوں نے کمروں میں لوہے کی چارپائیوں پر سونا ہو اور رات کو دو دو گھنٹے لائٹ غائب رہے، تو پھر سہانے سپنوں کا حشر نشر ہی ہونا ہے۔

''تاریخ کے جھروکے'' سے مصر کی تہذیب کے بارے میں لکھیں میرے ''نامے میرے نام'' کیا خوب محفل سجائی تھی میرے بغیر۔ مجھے صفیہ مہر کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ کیا رومانٹک گھر ہے۔ پیاری صفیہ مہر ایسے گھر تو آئیڈیلز ہوتے ہیں۔ پرندے، پھل دار درخت، گلاب کے پھول، شیشے کی لمبی والی کھڑکیاں اور پرندوں کا رومانس۔ صبح و شام نظر اتارا کرو اپنی اور گھر کی۔

☆ پیاری فوزیہ! کہاں غائب تھیں آپ پچھلے دو تین ماہ سے؟ مستقل قارئین دیر تک غائب رہیں تو تشویش ہونے لگتی ہے۔

ناتا جوڑا ہے کے سلسلے میں ابھی تک صرف ایک فریق کے تجربات سامنے آرہے ہیں۔ اگر سسرال والوں کے تجربات لکھے جائیں تو یقیناً بہت سے سسرال والے بھی مظلوم نظر آئیں گے۔ مسئلہ صرف ساس نندوں کی خرابی کا نہیں، ساری ساس، نندیں بری نہیں ہوتیں نہ ہی ساری بہوئیں خراب ہوتی ہیں۔ درحقیقت انسان اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ جھگڑالو، تنگ دل، کم ظرف، حاسد۔ عورت بیٹی ہو یا بہو، ساس ہو یا نند، کبھی بھی اچھی ثابت نہیں ہوتی جبکہ صلح جو محبت کرنے والے، نرم دل لوگ ہر روپ میں اچھے ہوتے ہیں۔

جہاں تک قیمت کی بات کی ہے تو پیاری بہن! پچھلے دو ڈھائی سالوں میں ہر شے کی قیمت میں دو سے تین سو گنا اضافہ ہوا ہے۔ سب اشیاء کے ساتھ ساتھ دیگر پرچوں کی

Monthly Shuaa July 2021

قیمت بھی کافی پہلے بڑھ چکی ہے۔ اب جب اخراجات قابو سے باہر ہوگئے تو ہم نے قیمت بڑھائی ہے۔ اب بھی ادارے کے پرچوں کی قیمت دوسرے پرچوں سے کم ہے۔ ہمیں خود پرچے کی قیمت میں اضافہ کرنا اچھا نہیں لگتا مگر کیا کریں، حالات آپ کے سامنے ہیں۔

ام رقیہ اوکاڑہ سے شریک محفل ہیں

ہم تو آپ سے ناراض بھی نہیں ہوسکتے کہ آپ سے پیار جو بہت ہے۔ چلیں ناراض تو نہیں ہوتے مگر ناراضی کی وجہ بتادیتے ہیں۔ اس بندیٔ ناچیز نے افسانہ بھیجا تھا ''خیرات'' نام سے۔

اب کچھ تذکرہ ہوجائے شعاع کا۔ سب سے پہلے موسٹ فیورٹ ناول ''عمر یسرا'' حسنہ حسین جی ویل ڈن۔ ''شام کی حویلی میں'' ہر بات دروازے کے پیچھے کھڑے ہوکر ہی سنی جارہی ہے۔ منصور یقیناً زینب کے ساتھ کوئی چال چل رہا ہے۔ میری کزنز کا خیال ہے کہ شائستہ کی پہلے سے کوئی دشمنی ہوگی طاہرہ لوگوں کے ساتھ۔ ''نورالقلوب'' آتے ہی چھا گئی۔ نازیہ رزاق بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ معذرت کے ساتھ۔ فرزانہ کھرل اور نازیہ رزاق کی کہانیاں پڑھنے سے پہلے سر میں دیسی گھی کی مالش اور ایک کلو بادام کھالینے چاہئیں۔ ہمارے چلبلی سی رائٹر ''سمیرا حمید'' کو بھی پکڑ لائیے۔ افشین نعیم پھر کوئی مسکراہٹوں سے بھرپور ناول لکھیے نا۔ عمیرہ احمد کا شدت سے انتظار ہورہا ہے۔ فائزہ بھٹی کو شادی کی مبارک باد۔

☆ ام رقیہ! رخسانہ نگار کے ناول کی دو یا تین اقساط باقی ہیں۔ آپ کے اندازے کتنے صحیح ہیں۔ پتا چل جائے گا، فی الحال تو ہم کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔

آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ بھائی کی غزل کے لیے معذرت۔

ہانیہ ہارون ضلع بھاول نگر سے لکھتی ہیں

آپ کو بتادیں کہ ہم تو وہی چلبلی، نٹ کھٹ سی ہانیہ ہیں کہ جس کا دل کرتا ہے کہ آپ کو ایسا انداز تحریر اپناتے ہوئے خط لکھیں کہ آپ تروتازہ کلی کی مانند کھل اٹھیں۔ آج کل تو ویسے بھی ہماری مصروفیت کا گراف کافی بڑھ گیا ہے کہ مسلسل ٹیسٹ ہورہے ہیں۔ جس دن شعاع موصول ہوا اس کے اگلے روز ہماری فزکس کی ہاف بک کا ٹیسٹ تھا۔ لیکن سلام ہے ہمیں کہ پھر بھی رات کو شعاع لے کر بیٹھ گئے۔ اللہ کریم کا شکر ہے کہ پڑھائی میں بہت اچھے ہیں۔ حسنہ حسین نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے لیے نیک تمنائیں۔ بقیہ شمارہ اگلے روز ٹیسٹ دینے کے بعد پڑھنا شروع کیا۔ ''شام کی حویلی میں'' پتا نہیں کہانی کس سمت جارہی ہے؟ ''نورالقلوب'' میں صندل کی کچھ باتیں ناقابل فہم سی معلوم ہوئیں۔ اور عبرا فرد کے بھائی کا نظریہ مجھے تو درست لگا۔ باقی پتا نہیں۔ ''تو ہی میرا مہربان'' ٹھیک تھی۔ ''ایک فیس بک سو افسانے'' پڑھنا شروع کیا تو نام کو دیکھتے ہی اشفاق احمد کی کہانی ''کانچ کا سائبان'' ذہن میں گردش کرنے لگی۔ شکر ہے کہ آخر میں مصنفہ نے اس کو ایک بھیانک خواب کی شکل دے دی۔ ''ہاں قبول ہے'' اچھی تحریر تھی اور نو عمر لڑکیوں کے لیے کئی اسباق پوشیدہ تھے۔ ''شناخت'' کچھ غیر حقیقی سا معلوم ہوا۔ خیر اب تو ہم کچھ بھی غیر یقینی یا غیر حقیقی نہیں کہہ سکتے کہ دنیا میں تو پتا نہیں کیا کچھ ہورہا ہے۔ ''فریب'' میں بھی اچھا سبق موجود تھا۔

☆ پیاری ہانیہ! آپ واٹس ایپ پر خط بھیج سکتی ہیں لیکن ہماری پہلی ترجیح ڈاک سے آئے خطوط ہوتے ہیں۔

آپ کا تبصرہ بہت اچھا ہے۔

آپ ہمیں کسی بھی انداز میں خط لکھیں، اپنی پیاری قارئین کے خط پاکر ہمارا دل ہمیشہ شاد ہوجاتا ہے۔

گوجرانوالہ سے صدف ناصر نے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ٹائٹل خلاف توقع بس ٹھیک تھا۔ کنزہ ہاشمی، عائزہ خان، حبہ بخاری کو جگہ دیجیے ٹائٹل پر۔ زبردستی کی چاند رات کا دکھ تازہ ہوگیا۔ اپنی پوری زندگی میں کسی نے ایسی بے رنگ عید نہیں دیکھی ہوگی۔

''حمد'' اور ''نعت'' ہمیشہ کی طرح پسند آئیں ''پیارے نبی کی باتیں'' آنکھیں کھولنے کو کافی ہوتی ہیں۔ ''فتنہ'' میں نبی پاک نے عورتوں کو زینت والا لباس پہننے اور تفاخر والی چال چلنے سے منع فرمایا جبکہ افسوس اب۔

''ناتا جوڑا'' دونوں ہی بہنوں کے کمال کے سبق آموز تھے۔ آفرین ہے دونوں اچھی بہنوں پر فائف''

pklibrary.com

شاہین رشید" کی جانب گامزن ہوئے کیونکہ "فہرست" بتا رہی تھی کہ وہاں "صائمہ اکرم" موجود ہیں۔ قرۃ العین خرم، رخسانہ نگار کے انٹرویو بھی لیں۔

"مکمل ناول کی طرف آئے۔ "تو ہی میرا مہرباں" بے حد سادہ سی اسٹوری۔ بے اختیار "نیناں" کے کھانے پینے پر ہنسی بھی آتی رہی اور پھر دکھ بھی ہوا۔ "دل تو سب کے پاس ہے، چاہے وہ موٹا ہو یا اسمارٹ! "عسریسرا" بھی بہت خوش کر دیتی ہے بھی اداس۔

"ناولٹ "شامہ والعباد" "ایک فیس بک سوافسانے" ہینڈرڈ پرسنٹ حقیقت پر مبنی۔ مگر کوئی "سیف" جیسے دو غلے مردوں کو بھی تو عقل دے کہ بیوی بھی بہر حال انسان ہوتی ہے ذرا ذرا سی خواہشات کے پیچھے عورت کی اتنی ذلت کہاں کا انصاف ہے۔ صرف اتنا کیجیے کہ چند روپوں کا بیوی کا پیکٹ الگ لے لیجیے۔ سو، پچاس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ہاں قبول ہے" عندلیب زہرا نے بہت پیاری تحریر دی۔

"افسانوں کی دنیا" اصل میں ہے پوری حقیقت کی دنیا پر مبنی۔ حسب عادت سب سے پہلے "قرۃ العین خرم" کو پڑھا۔ زبردست تحریر، ناسمجھ، جلد باز لڑکیوں دار عورتوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے پر اثر ہے۔ "حاضر جناب" اور "فریب" متاثر نہیں کر پائیں۔ معذرت! "عنبرین ابدال" کی "غلط فہمی" اچھی لگی۔ "مہوش طالب" دل دہلا دینے والی تحریر "شناخت" لے کر آئیں۔ اچھی تحریر مگر بہت حیران ہیں کہ آج سے پہلے اتنی سنسنی خیز اور تھوڑی ہارر سی تحریر تو شعاع میں کبھی آئی۔

☆ پیاری صدف! تفصیلی تبصرہ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آپ کا تبصرہ تو ہمیشہ ہی بہت جان دار ہوتا ہے۔ ہر تحریر، ہر سلسلے پر بھرپور تبصرہ کرتی ہیں، آپ کا پورا خط صفحات کی مجبوری کی وجہ سے شامل نہیں کر پاتے لیکن ہم آپ کا خط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

مافیہ ارشد بسرور سیالکوٹ سے شریک محفل ہیں افسانے اس بار سب ہی متاثر کن تھے۔ ناولٹ ایک فیس بک سوافسانے جان دار اسٹوری تھی۔ "ہاں قبول ہے" بس ایویں تھا۔ "عسریسرا" شمارے کی جان ہے۔ نورالقلوب شمارے کا دل ہے اور شام کی حویلی شمارے کا دماغ ہے جواب کھل رہا ہے۔ پہلی شعاع پڑھی۔ ہماری عیدیں پہلے کون سی خاص ہوا کرتی تھیں جواب رہی سہی کسر لاک ڈاؤن پوری کر رہا ہے۔ حمد و نعت، پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا رہتا ہے۔ بند مٹھی میں مہوش اختر سے ملاقات اچھی رہی۔ دستک میں صائمہ کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ غزل گزاری پسند آئی۔ خط آپ کے میں گڑیا راجپوت کا خط شامل نہیں تھا۔ بھئی گڑیا راجپوت سے دوستی کی خواہش مند ہوں۔ برادری کی بہن جو ہوئی۔ "خوب صورت بنیے" میں یہ نہیں بتایا کہ ناشتے میں انڈے بوائل کرنے ہیں یا فرائی۔

آپی جان ایک ریکویسٹ تھی آپ سے۔ پلیز برا مت مانیے گا۔ آپی ٹائٹل پر اگر ماڈل کی جگہ کوئی اور تصویر ہو یعنی کہ پھولوں کی یا سرسبز پہاڑ یا کوئی وادی آپی یہ ماڈل کی تصویر پرچے کو مشکوک بنا دیتی ہے، دیکھنے والے کہتے ہیں لڑکی کی فوٹو بنی ہوئی ہے، پتا نہیں اندر کیا ہے۔ چھپا چھپا کر رکھنی پڑتی ہے اور ہر وقت کا ڈر اگر کسی کے ہاتھ لگ گئی تو خیر نہیں۔ آپی جان پلیز عید نمبر پر مہندی کا بھی کوئی ڈیزائن دے دیا کریں پلیز۔ اور آپی میرا پیٹ بڑھ رہا ہے دن بدن۔ اس کا کوئی علاج بتائیں اور آپی وہ میں نے تین افسانے بھیجے تھے ان کا کیا بنا بتا دیں۔

☆ پیاری مافیہ! انڈے بوائل کر کے کھائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ بوائل انڈا پسند نہ ہو تو فرائی کرنے میں آئل برائے نام استعمال کریں۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن ابھی آپ کو محنت کی ضرورت ہے۔ کہانی تو آپ کی ٹھیک ہوتی ہے لیکن آپ کا لکھنے کا اسٹائل تھوڑا کمزور ہے۔

ٹائٹل کے بارے میں آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے۔

☆☆

اعتذار

ناگزیر وجوہات کی بنا پر تنزیلہ ریاض ناول "نورالقلوب" کی قسط نہیں لکھ پائیں، اس لیے نورالقلوب اس ماہ شامل اشاعت نہیں ہے۔ بہنیں آئندہ ماہ قسط پڑھ سکیں گی۔

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

pklibrary.com

گوما تا کی وجہ سے شکست

محمد غوری نے جب دوسری مرتبہ دلی پر حملہ کیا تو اپنی فوج کے آگے گائیوں کا بہت بڑا گلہ کر دیا۔ اور اس کی آڑ میں پیش قدمی جاری رکھی۔ گائیوں کے احترام کے سبب چوہان اپنی تلواریں بند کیے پیچھے ہٹتے رہے اور محمد غوری کی فوج آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گائیوں کی ڈھال کی آڑ میں دلی فتح کر لیا اور چوہان گائیوں کو کاٹ کر ترکوں تک نہ پہنچ سکے۔ یوں لڑے بغیر دلی فتح ہو گیا۔

تاجر کی عیاری

انگریزوں کا برصغیر میں نزول تاریخی دلچسپی کا حامل ہے۔ عظیم مغل بادشاہ، شاہ جہاں کی بیٹی ایک حادثے میں آگ سے جھلس گئی۔ انگریز ڈاکٹر کی مسیحائی نے اسے صحت دی تو احسان مند بادشاہ نے بطور اظہار ممنونیت کمپنی کو تجارتی حقوق مرحمت کر ڈالے۔ یہی حکم برصغیر کی تاریخ میں اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ انگریزوں نے ساحل سمندر پر بے شمار چھوٹے بڑے قلعے تعمیر کیے اور ان میں ڈاکوؤں سے بچاؤ کے بہانے اسلحہ ذخیرہ کر لیا۔ وہ اسلحہ بعد ازاں مغلیہ حکومت کے خلاف استعمال ہوا اور یوں عیار تاجر مالک بن بیٹھا۔ گویا گرم مسالوں سے شروع ہونے والی تجارت نے انسانوں اور پھر ملکوں کو بھی اپنا غلام بنا لیا۔

مقدس رباب، چکوال

شب دیز

ایران کے بادشاہ خسرو کے پاس بہت سی نادر اشیا تھیں اور اس کے دربار کا محبوب ایک گھوڑا بھی تھا۔ یوں تو خسرو کے پاس پچاس ہزار گھوڑے، بارہ ہزار اونٹ اور ایک ہزار ہاتھی تھے۔ لیکن وہ گھوڑا جس کا نام ''شب دیز'' تھا۔ اس کی سواری کے لیے مخصوص تھا۔ یہ نہایت اصیل اور خوب صورت تھا اور مورخین کے مطابق آب و آتش کی صفات کا مجسمہ تھا۔ جس طرح رستم کی وجہ سے اس کا گھوڑا رقص بے حد مشہور ہوا۔ اسی طرح خسرو کا شب دیز کا یہ گھوڑا بے حد مشہور ہوا۔

مشہور روایت ہے کہ یہ گھوڑا خسرو کو اس قدر عزیز تھا کہ وہ کہتا تھا کہ جو شخص بھی اس گھوڑے کی موت کی خبر اس تک پہنچائے گا، اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ پھر اچانک ایسا ہوا کہ شب دیز نام کا ہی گھوڑا بیمار ہو گیا اور آخر کچھ دنوں بعد مر گیا۔ خسرو کے لیے اس کا مرنا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ جان کے خوف سے کوئی شخص یہ اطلاع بادشاہ کو نہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن خبر بھی بہر صورت پہنچانی تھی۔ آخر داروغہ اصطبل نے خسرو پرویز کے مشہور گویے بار بد کو وسیلہ بنایا۔ بار بد نے خسرو پرویز کے حضور گا کر شعر پڑھے جن کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''شب دیز نہ اب دوڑ سکے گا، نہ چل سکے گا، نہ سو سکے گا۔'' یہ سن کر خسرو پرویز چونک کر بولا۔ ''شب دیز مر گیا۔'' بار بد نے کہا۔

''حضور ہی یہ فرما رہے ہیں اور کسی کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔'' بار بد نے کہا۔

اس پر بادشاہ بولا۔

"بہت خوب! تو نے اپنے آپ کو بچالیا اور دوسروں کو بھی۔"

شازیہ خان.....ملتان

بحیرۂ روم

حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ وہاں کے افراد شرم ناک فعل میں مبتلا تھے۔ وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رغبت کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے تبلیغ بے اثر دیکھی تو رب العزت سے دعا کی۔ رب تعالیٰ نے ان کی سخت ناشائستہ حرکت کی پاداش میں جو ننگ انسانیت تھی، ان پر سجیل کے پتھر برسائے۔ بارہ فرشتے جو خوش شکل اور جوان تھے، ان کے ذمہ یہ کام سونپا گیا۔ اس سنگ باری سے بستی کے افراد ہلاک ہوگئے۔ قوم لوط کی بستی بالکل تہ وبالا کردی گئی اور اس سرزمین میں دفعتاً ایک بحیرہ نمودار ہوگیا جو بحیرہ لوط کے نام سے اب تک مشہور ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی تباہ شدہ بستی کا جائے وقوع تمام لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔ لیکن اس سے کافروں نے عبرت حاصل نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس مقام پر کوئلے اور گندھک کی کان تھی۔ جس کے اڑنے سے یہ بحیرہ نمودار ہوگیا تھا۔ الغرض یہ مقام صرف اہل ایمان کے لیے عبرت گاہ ہے۔ اہل کفر اس سے سبق نہیں سیکھتے۔

بحیرہ لوط کا پانی ایسا تلخ اور بدبودار ہے کہ کوئی ذی روح اس کو استعمال نہیں کرسکتا اور اس کے کنارے کوئی درخت بھی نہیں اگتا۔

سدرہ، سونیا چوہدری، لاہور

تعرض

ایک مرتبہ چند متشدد قسم کے لوگوں نے رضیہ سلطانہ کی دین داری دیکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ جمنا میں ہندوؤں کے تہواروں پر جو اشنان ہوتے ہیں اور جمنا کے کنارے جو مندروں میں بڑے زور شور سے گھنٹے بجاتے ہیں۔ ان سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں حکماً بند کردیا جائے۔

اپنے موقف کو تقویت پہنچانے کے لیے مشورہ دینے والوں نے سلطانہ کے باپ التمش کی مثال بھی پیش کی کہ۔

"انہوں نے اپنے عہد میں مہا کال مندر مسمار کرادیا تھا۔ آپ بھی جمنا کے کنارے جتنے مندر ہیں۔ مسمار کرادیں۔"

اتفاق سے سعد الدین کردی، جو اس زمانے کے ایک معتبر عالم تھے، ان کو اس بات کا پتا چل گیا۔ وہ فوراً سلطانہ کے پاس گئے اور کہا۔

"اے سلطانہ! لوگوں کی باتوں میں نہ آنا۔ آپ کے والد نے جو مہا کال مندر ڈھایا تھا۔ وہ خود اس مندر کے برہمنوں کی التجا پر منہدم کیا گیا تھا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ وہاں آوارگی کا اڈہ بن گیا تھا اور لوگ پوجا پاٹ کے بہانے وہاں آکر فحش حرکات کرتے تھے۔ اے سلطانہ! اسلام نے غیر مسلموں کی عبدت گاہوں کو ڈھادینے کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ایران فتح کیا تو وہاں زرتشتی مذہب قائم تھا۔ بے شمار آتش کدے روشن تھے لیکن انہوں نے فاتح ایران ہونے کے باوجود وہاں کے آتش کدوں کو مسمار نہیں کیا اور زرتشتیوں کو ان کی رسمیں ادا کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا۔ دور نہ جائیں۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کی مثال لے لیں۔ اس نے سندھ اور ملتان کو فتح کرکے وہاں کے ہندوؤں کی پوجا پاٹ پر کوئی تعرض نہیں کیا اور ایک بھی مندر مسمار نہیں ہونے دیا۔ اے سلطانہ! تم ان بزرگوں سے بڑھ کر نہیں ہو، اس لیے ایسا قدم ہرگز نہ اٹھانا، جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔"

رضیہ سلطانہ نے سعد الدین کردی کی باتیں سن کر ندامت سے سر جھکالیا۔ اور اعتراف کیا کہ وہ واقعی ان لوگوں کی باتوں میں آگئی تھی۔ مگر اب وہ

pklibrary.com

ہوگا جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور ہندوؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

کنول شاہین، جلال پور جٹاں

حجاج بن یوسف کا عجیب واقعہ

امام ابان بنت نعمان بن بشیر الانصاریہ نامی ایک بہت ہی حسینہ، جمیلہ، فصیح زبان اور ذہین خاتون تھی۔ اس کا پہلا نکاح روح زنباع سے ہوا تھا۔ اس کے بعد جبراً حجاج نے اس سے دو لاکھ درہم پر نکاح کیا۔ مگر اس کے دل میں حجاج کی نفرت برقرار رہی۔ ایک مرتبہ آئینہ میں اپنے حسن و جمال اور حجاج کا موزانہ کرتے ہوئے بے ساختہ فی البدیہہ اس کی زبان پر یہ اشعار جاری ہوئے۔

ترجمہ: ''ہندہ نہیں ہے، مگر عربی گھوڑی جو اچھے گھوڑے کی نسل سے ہے۔ جس سے ایک خچر نے نکاح کیا۔ اب اگر باکمال کو نہ جنے تو کیا خوب ہے اور اگر خچر کو جنے تو سمجھ لو کہ خچر سے خچر ہی پیدا ہوتا ہے۔''

جس وقت یہ شعر پڑھ رہی تھی، حجاج کمرے میں داخل ہوا تو اس نے یہ اشعار سن لیے اور مارے غصے کے اسے طلاق دے دی اور عبداللہ بن طاہر کے ذریعے مہر بھجوایا۔

اس غیرت مند خاتون نے ابو طاہر کو وہ رقم بطور تحفہ دے دی اور کہا۔

''ثقیف کے کتے سے نجات کی بشارت سنانے پر میں یہ خطیر رقم تجھے دیتی ہوں۔''

عدت کے بعد عبدالملک بن مروان کو اس کے حسن و جمال کی اطلاع ہوئی تو نکاح کا پیغام دیا۔ خاتون نے ایک تحریر لکھی۔ جس کا مضمون یہ تھا۔

''امیر المومنین کو معلوم ہونا چاہیے کہ برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا ہے۔''

خط پڑھ کر عبدالملک خوب ہنسا اور جواب تحریر کیا۔

''جب برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اس کو سات مرتبہ دھویا جاتا ہے۔ تم بھی برتن کو دھولو۔ قابل استعمال ہو جائے گا۔''

ہندہ ایک شرط پر نکاح کے لیے راضی ہوئی کہ ''میری رخصتی کے وقت حجاج میری سواری کی نکیل تھام کر آپ کے شہر تک پہنچائے گا۔ اس حال میں کہ وہ ننگے پاؤں چل رہا اور اپنے اباؤ اجداد کے اصلی لباس اونٹ کے چمڑوں کے لباس میں ہو۔''

شرط پڑھ کر عبدالملک خوب ہنسا اور حجاج کو حکم دیا کہ وہ ہندہ کو پہنچائے۔

بادشاہ کے حکم کے سامنے حجاج بے بس ہو گیا۔

جب حجاج ہندہ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر — جا رہا تھا تو ہندہ نے دایہ سے کہا۔

''ذرا محمل کا پردہ ہٹاؤ۔'' پھر حجاج سے کہا۔

''اے شتربان! ہمارا ایک درہم گر گیا ہے۔ اٹھا کر دے۔'' ہندہ نے نیچے دینار پھینک دیا تھا۔ حجاج زمین پر درہم ڈھونڈنے لگا پھر اس نے کہا۔

''یہاں پر دینار ہے۔ درہم نہیں۔''

ہندہ نے کہا۔ ''نہیں وہ تو درہم ہی تھا۔'' اس نے کہا۔

''نہیں دینار ہے۔'' حجاج نے یقین دلایا۔

ہندہ ہنس کر بولی۔

''میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ گر اتو میرا درہم تھا، مگر اس نے مجھے دینار عطا کیا۔ تجھ حقیر کے بدلے عبدالملک بن مروان جیسے بادشاہ کی زوجیت کا شرف بخشا۔''

حجاج پوری بات سمجھ گیا اور بے حد شرمندہ ہوا اور اس سے کوئی جواب نہ بنا۔ اس طرح ہندہ عبدالملک بن مروان کے پاس پہنچ گئی۔

فرزانہ مغل.....واہ کینٹ

واصفہ سہیل

کہیں آنسو کہیں مسکراہٹیں

پنجابی شادی

علی سفینہ جنہوں نے اپنے فنی سفر کا آغاز ڈی جے کے طور پر کیا پھر اداکاری کی طرف آئے۔ سات سال قبل ہوئی محبت پھر شادی کے متعلق کہتے ہیں کہ ''میں نے حرا کو ملاقات سے قبل تصویروں میں دیکھا تھا لیکن اندازہ نہیں تھا کہ یہ تصویروں سے نکل کر ایک دن اچانک سامنے بھی آجائیں گی۔''

ان کی پہلی ملاقات ایک مشترکہ دوست کے گھر ہوئی جہاں حرا نے علی سفینہ کو دیکھ کر کہا کہ ارے آپ تو جانے پہچانے لگ رہے ہیں۔ اس پر علی سفینہ نے انہیں بتایا کہ وہ ٹی وی پر آتے ہیں (ہاہاہا)۔ اگرچہ دونوں کے مزاج مختلف تھے لیکن کچھ چیزیں دونوں میں مشترک تھیں، جیسے موسیقی۔ دونوں کے درمیان پہلی ملاقات میں بات چیت بھی اسی پر ہوتی رہی۔

پھر ملاقاتیں بھی بڑھنے لگیں۔

حرا ترین کہتی ہیں کہ ''چھ ماہ بعد ہم نے اپنی پسند سے اپنے گھر والوں کو آگاہ کردیا۔ میرے والد چونکہ امریکہ میں ہوتے ہیں، انہوں نے علی سے فون پر ایک سوال کیا کہ آپ کا بیک اپ پلان کیا ہے۔ اس پر علی نے کہا کہ صرف اور صرف اداکاری ہے۔ والد کو علی کا جواب پسند نہیں آیا لیکن بھائی کو علی کی صاف گوئی بہت پسند آئی۔

ادھر علی سفینہ کے گھر والے ستر سے زیادہ لوگوں کو ٹرین میں بھر کر کراچی پہنچے اور پھر دھوم دھام سے بارات لے کر حرا کے گھر پہنچے کہ یہ شادی خالص پنجابی شادی تھی۔

متاثر

حرا مانی کی اپنے شوہر کے ساتھ بیٹے کے متعلق ہوئی گفتگو سوشل میڈیا پر وائرل ہوگئی (کیا یہ بھی شہرت حاصل کرنے کا طریقہ نہیں ہے)؟ جس میں مانی، حرا کو بیٹے کی تربیت کے لیے تلقین کررہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ جوتے لگاؤ (کیسے؟)۔ اس پر حرا نے کہا کہ مانی! آپ نے ایک تو میرے بیٹے کے بالوں کی کٹنگ اتنی بری کروادی ہے، اب میں اس کے جوتے بھی لگاؤں۔''

اس گفتگو سے کوئی اور متاثر ہوا ہو یا نہیں، لیکن اداکارہ صحیفہ جبار اس سے بہت متاثر ہوئی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ بھی جلد از جلد اپنے شوہر خواجہ خضر حسین کے ساتھ ایسی ہی نوک جھونک کی خواہش مند ہیں۔ (جوتے مارنے کی)۔

اثر

رابعہ بٹ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ

pklibrary.com

خوب صورت اور باصلاحیت اداکارہ ہیں، انہیں چھوٹی اور بڑی اسکرین پر یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔ رابعہ بٹ کو آپ آج کل فائزہ افتخار کے لکھے ڈرامہ سیریل ''پہلی سی محبت'' میں مایا علی کی سوتیلی ماں کا کردار ادا کرتے دیکھ رہی ہیں۔ رابعہ بٹ نے روایتی طور پر منفی سمجھے جانے والے سوتیلی ماں کے کردار کو اپنے منفرد انداز اور جان دار اداکاری سے مثبت رنگ میں بدل دیا۔

اس کردار کے بارے میں رابعہ کا کہنا تھا کہ مصنفہ نے اسے اتنا اچھا لکھا ہے کہ اس پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ والدہ کی وفات کے بعد بہت کم عمری میں رابعہ بٹ نے اپنی دو بہنوں کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ ڈرامے میں سوتیلی بیٹی سے محبت شاید اسی ممتا بھرے سلوک کا اثر ہے۔

ادھر ادھر سے

☆ یہ درست ہے کہ اگر چار سال پہلے کی شرح نمو برقرار رہتی تو آج معیشت سات سے آٹھ فیصد کی شرح سے آگے بڑھ رہی ہوتی اب بحالی کے اقدامات ہو رہے ہیں تو گویا چار برس پیچھے جانے کو کامیابی گردانا جا رہا ہے۔

(مجیب الرحمٰن شامی..... جلسہ عام)

☆ امراء بھی آخری سانس تک اولاد کا بھلا کرنے میں لگے رہتے ہیں جب بھی کوئی شخص کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو باقی تمام مقاصد اس کے نزدیک بے کار ہو جاتے ہیں۔ دولت حاصل کرنے میں بھی ایسی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

(بلال الرشید ماجرہ)

☆ مجھ سمیت سب کا دعویٰ ہے کہ ہم سچ بولتے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ وقت آن پڑے تو ہم سچ کے اصولوں کو بھول جاتے ہیں اور سچ کے کپڑوں میں ملبوس جھوٹ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا عوام کو پورا سچ نہیں پتا چلتا کیوں کہ میڈیا اول تو خبر کا مکمل بلیک آؤٹ کر دیتا ہے یا اس خبر کو ایسے ملفوف انداز میں پیش کرتا ہے کہ اس کے معنی مر جاتے ہیں۔

(اعزاز سید..... لاپتا سچ)

☆ معیشت کی بہتری اور جی ڈی پی گروتھ کے حوالے سے حکومتی دعووں پر اس لیے بھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ موجودہ حکومت اس حوالے سے ماضی میں غلط بیانی کی مرتکب پائی جاتی ہے مثلاً پچھلے سال بجٹ کے دوران جی ڈی پی کی جو شرح بتائی گئی اور اس کے اپنے نظر ثانی شدہ تخمینے میں بہت کم نکلی اور پھر عالمی اداروں نے حکومت کے نظر ثانی شدہ تخمینے کو بھی غلط قرار دے دیا۔

(سلیم صافی..... معیشت اور حکومتی دعوے)

pklibrary.com

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آج کل مختلف چینلز سے آپ کے سیریلز آن ایئر ہیں، کب سے تیار تھے؟''

''دیکھیں ہمارا کام تو کام کرنا ہے۔ یہ کب آن ایئر آئے گا کب نہیں یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہوتا۔ یہ پروڈکشن ہاؤس والوں کی مارکیٹنگ کا مسئلہ ہوتا ہے۔ تو جو ڈرامے آج کل آپ سب دیکھ رہے ہیں بہت پرانے نہیں ہیں بلکہ نئے ہی ہیں۔''

''آپ اچھی پرفارمر ہیں۔ اسکرین پر دیر سے کیوں آئیں؟''

''ایک تو میں اپنی پڑھائی میں بہت مصروف تھی دوسری بات یہ کہ میں ''تھیٹر'' سے وابستہ تھی۔ یعنی تھیٹر سے میری شروعات ہوئی۔ اور جب چھوٹی اسکرین والوں نے مجھے ''تھیٹر'' میں کام کرتے دیکھا تو مجھ سے رابطہ کرلیا۔''

''آپ نے کہا کہ آپ پڑھائی کر رہی تھیں تو کیا پڑھ رہی تھیں آپ؟''

''میں نے فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کیا ہے۔ اور پوسٹ سائیکالوجسٹ ہوں۔ یہ میری تعلیمی قابلیت ہے۔ اور پڑھائی تو ایسی چیز ہے کہ کبھی ضائع نہیں جاتی۔''

''مطلب ابھی ڈگریاں الماری میں ہیں؟''

''ارے نہیں ایسی بھی بات نہیں ہے۔ فیشن ڈیزائننگ میرا شوق ہے اور میں اس میں کام کرتی رہتی ہوں۔''

''شوبز کو گھر والے کتنا پسند کرتے ہیں؟''

''اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ گھر والے پسند نہ کریں۔ اب تو سب کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے شوبز میں آئیں۔ کیونکہ یہ بھی اب پروفیشن کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ تو میرے گھر والے بہت پسند کرتے ہیں میرا اس فیلڈ میں آنا اور بہت سپورٹیو ہیں۔''

''کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں اور قد کاٹھ سے تو پنجابی لگتی ہیں؟''

''نہیں میں پنجابی نہیں ہوں۔ ہماری مادری زبان اردو ہے اور گھر میں ہم اردو اور انگلش بولتے ہیں۔ میرا قد 5 فٹ 8 انچ ہے اور لڑکی کے حساب سے ایک اچھی ہائیٹ ہے۔ میں 28 اپریل کو پیدا ہوئی۔ ہم تین بہنیں اور ہمارا ایک ہی بھائی ہے، تو میں سب سے چھوٹی ہوں۔''

''صبح جلدی اٹھ جاتی ہیں..... کیوں کہ آج کل کی نوجوان نسل کو تو دیر تک سونے کی عادت ہے۔''

''ارے نہیں..... میں کبھی بھی دیر تک نہیں سوتی۔ ماشاء اللہ فجر میں اٹھ جاتی ہوں..... پورے گھر کا چکر لگاتی ہوں۔ اور فریش ہوجاتی ہوں۔ اچھا لگتا ہے صبح کے وقت اٹھنا۔''

''کمائی کا عمل شروع ہوا تو پہلی بار کیسا محسوس کیا؟''

''بہت خوشی ہوئی تھی اور اپنے گھر والوں پر خرچ کیے تھے۔ سب کے ساتھ انجوائے کیا تھا۔''

''آج کل کی نوجوان نسل نے وہ کھیل نہیں کھیلے جو آپ کے والدین نے کھیلے تھے۔ ایسا ہی ہے نا؟'' ''ایسا ہے بھی اور نہیں بھی۔ کیونکہ میں نے تو بچپن میں گڑیوں کے ساتھ بہت کھیل کھیلے ہیں۔ اور بچپن میں میری یہ بری عادت تھی کہ میں مٹی بہت کھاتی تھی۔''

''مٹی کھانے کی عادت تو بہت سے بچوں میں ہوتی ہے۔ خیر لاک ڈاؤن کا وقت کیسا گزرا اور اب کیسا گزر رہا ہے؟''

''لاک ڈاؤن کا وقت بس گزر گیا اور اب بھی گزر رہا ہے وہ پہلے والی سختی نہیں ہے۔ پہلے والے لاک ڈاؤن میں بہت سی چیزیں سیکھنے کو ملیں..... فیملی کے ساتھ وقت گزارنے کو ملا۔ خود سے ملنے کا موقعہ ملا۔'' ''شوبز میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟''

''اچھا یا برا شوبز میں آنے والوں پر منحصر ہے۔ ہمارے یہاں سوشل نیگیٹو بہت ہے جو کہ نہیں ہونی چاہیے۔''

☆

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2021

عید نمبر کے شمارے کی ایک جھلک

- ''سکندر اعظم کی آمد'' راشدہ رفعت کا مکمل ناول،
- ''مریض عشق'' گل ارباب کا مکمل ناول،
- ''متاع'' ام ایمان قاضی کا مکمل ناول،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، حمیرا نوشین، حمیرا شفیع، ہاجرہ عمران، منشاء محسن اور رابینہ عبدالقدیر کے افسانے،
- اداکارہ ''طوبیٰ صدیقی'' سے باتیں،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ ''گل ارباب'' سے ملاقات،
- ''کرن کرن روشنی'' احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، خبریں وبریں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی 2021 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

pklibrary.com

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

pklibrary.com

مدراس کلیجی

اشیاء	
بکرے کی کلیجی	آدھا کلو
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
املی کا گودا	دو کھانے کے چمچے
پسا لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
کڑی پتے	چھ عدد
لال ثابت مرچ	چار عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
رائی	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	چوتھائی کپ
نمک	حسب ذائقہ
دہی	آدھا کپ
پسا گرم مسالا	چوتھائی چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	تین کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	تین سے چار عدد

ترکیب:۔

ایک برتن میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز تلیں۔ ہلکی گلابی ہو جائے تو زیرہ، رائی، ثابت لال مرچیں کڑکڑائیں۔ پسا ادرک لہسن اور کلیجی ڈال کر بھونیں، تیل الگ ہو جائے تو کڑی پتے، نمک، پسی لال مرچ، پسا دھنیا اور پسی ہلدی شامل کر کے بھون لیں۔ پھر ایک کپ پانی ڈال کر ڈھکن لگا کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ کلیجی گل جائے تو دہی ڈال کر دوبارہ بھونیں۔ اب املی کا گودا اور پسا گرم مسالا ڈالیں۔ ہرا دھنیا، ہری مرچیں ڈال کر پیش کریں۔

دیگی بریانی

سیلا چاول	آدھا کلو
گوشت	آدھا کلو
دہی	ایک پاؤ
کٹی لال مرچ	دو چائے کے چمچے
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	دو چائے کا چمچہ
نمک	دو چائے کے چمچے
تیل	ایک کپ
گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
پسا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
پسی جائفل جاوتری	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
بادیان کے پھول	چار عدد
آلو	تین عدد
زردے کا رنگ	آدھا چائے کا چمچہ
تلی ہوئی پیاز	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر	ایک پاؤ
آلو بخارے	پچاس گرام
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
پودینہ	آدھی گٹھی
چاٹ مسالا	دو چائے کے چمچے
کڑی پتے	چھ عدد
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

ایک چائے کے چمچے دہی میں زردہ رنگ ملا کر ایک طرف رکھ دیں۔ ایک پین میں ایک کپ پانی، باقی دہی، کٹی لال مرچ، ہلدی، پسی لال مرچ، نمک، تیل، گرم مسالا، ادرک لہسن کا پیسٹ، پسی جائفل،

جاوتری اور بادیان کے پھول ڈال کر ملالیں۔ پھر گوشت شامل کرکے پکائیں۔ گوشت گل جائے تو آلو ڈال کر بھونیں، جب آلو آدھے گل جائیں تو اوپر سے زردے کے رنگ والا دہی پھیلا دیں۔ پھر تلی ہوئی پیاز، ٹماٹر، آلو بخارے، ہرا دھنیا، پودینہ، چاٹ مسالا، کڑی پتے اور ادرک ڈال کر ابلے چاول کی تہ بچھا دیں۔ اب چاولوں پر آدھا کپ تیل ڈال کر دم پر رکھ دیں اور چولہا بند کردیں۔ مزے دار دکنی بریانی تیار ہے۔ رائتے کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

حیدرآبادی گلاوٹ گوشت

اشیاء:۔

گوشت	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
پسا لہسن	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کپ
کٹی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
کچا پپیتا پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	چار سے پانچ عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

ایک پیالے میں گوشت پر پسا لہسن، دہی، کٹی لال مرچ، کچا پپیتا پیسٹ اور نمک لگا کر ایک گھنٹے کے لیے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

ساس پین میں تیل گرم کرکے پیاز کو سنہرا ہونے تک تلیں۔ اب اس میں میرینیٹ کیا ہوا گوشت ڈال کر اتنا بھونیں کہ تیل اوپر آجائے اور ہری مرچیں ڈال کر ہلکی آنچ پر دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

سرونگ ڈش میں نکال کر ادرک اور ہرا دھنیا سے گارنش کرکے نان یا تافتان کے ساتھ سرو کریں۔

ہاٹ چلی بیف مسالا

اشیاء:۔

گائے کا گوشت	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	آدھا کپ
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن کے جوے	چھ عدد
شملہ مرچ	دو عدد
ہری مرچیں	چھ عدد
کٹی سیاہ مرچیں	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب:۔

ساس پین میں تیل گرم کرکے لہسن ڈال کر تلیں، ایک منٹ بعد پیاز کا پیسٹ ڈال کر تلیں۔ سنہری ہونے لگے تو ابلا ہوا گوشت، نمک اور کٹی ہوئی سیاہ مرچیں ڈال کر ملا دیں۔ اس میں ہری مرچیں، شملہ مرچ، ادرک اور لیموں کا رس ڈال کر بھون لیں آدھا کپ پانی ڈال کر پکائیں۔ کارن فلور آدھا کپ پانی میں ڈال کر گھول لیں اور گوشت میں ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ گاڑھا ہوجائے تو چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر فرائیڈ رائس کے ساتھ پیش کریں۔

باربی کیو چوپس

اشیا:۔

مٹن چوپ	ایک کلو
دہی	ایک کپ
نمک	دو چائے کے چمچے
لال مرچ	دو چائے کے چمچے
پسا گرم مسالا	دو چائے کے چمچے
پسا ادرک لہسن	دو چائے کے چمچے
گھی یا تیل	پچھارا لگانے کے لیے

ترکیب:۔

نمک، پسی لال مرچ، پسا گرم مسالا اور پسا

pklibrary.com

ادرک لہسن، دہی میں ملالیں۔ مٹن چوپ میں اچھی طرح سب ملالیں اور دو گھنٹہ کے لیے رکھ دیں۔

اب اسے سیخ پر لگائیں اور کوئلہ پر سینک لیں۔ جب آدھا گل جائے، اس پر گھی، تیل لگا دیں۔ برش سے دونوں طرف اور اسے اور سینک لیں کہ گوشت گل جائے۔ چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ملائی بوٹی اسٹک کباب

اشیاء:۔

گوشت	ایک کلو
پیاز	ایک
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
کچری پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
دہی	دو کھانے کے چمچے
ملائی	آدھا کپ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب:۔

بڑے پیالے میں گوشت، پسی لال مرچ، ملائی، کچری پاؤڈر، دہی، پسا گرم مسالا، پیاز، لیموں کا رس، نمک اور تیل ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور چار سے پانچ گھنٹے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ سیخوں پر بوٹیاں لگا کر باربی کیو کرلیں، تھوڑا کلر آجائے تو برش سے تیل لگا کر مزید سینک لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر سلاد کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔ (اگر سیخیں نہیں ہیں تو پتیلے میں گوشت گلا کر کوئلے کا دم دے لیں۔)

کراچی چٹ پٹے سیخ کباب

اشیاء:۔

قیمہ	ایک کلو
پسا کچا پپیتا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچیں	بارہ سے پندرہ عدد
پسا ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
چنے	چار کھانے کے چمچے
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	دو چائے کے چمچے
خشخاش	دو چائے کے چمچے
براؤن پیاز	تین کھانے کے چمچے
دہی	چوتھائی کپ
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
انڈا	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
گھی	چار کھانے کے چمچے

ترکیب:۔

چوپر میں قیمہ، کچا پپیتا پیسٹ، پسا ادرک لہسن، ثابت لال مرچیں، بھنے ہوئے چنے، بھنا ہوا زیرہ، ثابت گرم مسالا، خشخاش، براؤن پیاز، دہی، ہرا دھنیا، انڈا اور نمک ڈال کر باریک پیس کرلیں اور پیالے میں نکال کر دو گھنٹے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

کباب کا آمیزہ سیخوں پر لگا کر باربی کیو کریں۔ گھی برش کی مدد سے لگائی جائیں۔ کباب تیار ہوجائیں تو سرونگ پلیٹ میں نکال کر املی کی چٹنی اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔ اگر انگیٹھی نہ ہو تو پتیلے میں بھون کر کوئلے کی دھونی دے لیں۔

عید اسپیشل میوہ کھیر

اشیاء:۔

دودھ	دو لیٹر
چاول	چوتھائی کپ
چینی	ڈیڑھ کپ
کھویا	آدھا پاؤ
پستے، بادام	گارنشنگ کے لیے

ترکیب:۔

چاول دھو کر بھگو دیں اور گرینڈر میں پیس لیں۔

pklibrary.com

دودھ ابال کر اس میں چاول ڈال کر پکائیں اور برابر چمچہ چلاتی رہیں کہ گٹھلیاں نہ بنیں۔ چاول اچھی طرح گل جائیں اور مکس ہو جائیں تو چینی ڈال کر دھیمی آنچ پر مزید پکائیں۔ اس کے بعد تھوڑی دیر میں چمچہ چلاتی رہیں، کھیر گاڑھی ہونے لگے تو کھویا شامل کر کے آدھے پستے، بادام ڈال دیں اور دو سے تین منٹ مزید پکائیں۔

عید اسپیشل میوہ کھیر سرونگ ڈش میں نکال کر پستے، بادام سے گارنش کریں۔ ٹھنڈی کر کے پیش کریں۔

کباب غزال

ضروری اشیاء:۔

میدہ	دو کپ
مکھن	آدھا کپ
تیل	ایک چوتھائی کپ
بادام	چار کھانے کے چمچے
چینی	ایک چوتھائی کپ
پسی دار چینی	آدھا چائے کا چمچہ
شہد	ایک کپ
پانی	آدھا کپ
آئسنگ شوگر	آدھا کپ

ترکیب:

ایک پیالے میں میدہ، مکھن اور تیل ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ پانی سے آٹے کی طرح گوندھ لیں۔

اگر آپ ضروری سمجھیں تو مزید پانی یا میدہ شامل کرسکتی۔ اب اس کو کپڑے سے ڈھک کر ایک طرف 30 منٹ کے لیے رکھ دیں اور اس دوران آپ فلنگ تیار کرلیں۔ فلنگ کی تیاری کے لیے ایک پیالے میں بادام، چینی، شہد، آئسنگ شوگر، دار چینی پاؤڈر اور تھوڑا سا پانی شامل کر کے اچھی طرح مکس کرلیں۔

تیار آٹے کے اخروٹ کے برابر پیڑے بنالیں اور انہیں گیلے کپڑے سے ڈھک دیں۔ ایک وقت میں ایک پیڑا نکالیں اور پیڑے کو گول بیل لیں۔ بالکل درمیان میں ایک چائے کا چمچہ فلنگ کا رکھ کر اس کو آدھے چاند کی طرح فولڈ کرلیں۔ کناروں کو دبا کر اچھی طرح بند کرلیں۔ اسی طرح سارے کباب تیار کرلیں۔

اب ان سب کو ایک بغیر گریس کی ہوئی شیٹ پر رکھ دیں۔ پہلے سے گرم اوون میں بیس منٹ کے لیے بیک کریں۔ سنہرا ہو جائے تو اوون سے نکال لیں اور سرو کریں۔

اسٹفڈ ایگ کباب

ضروری اشیاء:۔

ابلے انڈے	چھ عدد
گائے کا قیمہ	ایک پاؤ
ہری مرچ	چار عدد
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک کھانے کا چمچہ
میدہ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ
بریڈ کرمز	کوٹنگ کے لیے

ترکیب:

قیمے کو ایک کپ پانی میں ابال لیں۔ یہاں تک کہ وہ گل جائے۔ اب اسے اچھی طرح پیس لیں۔ پھر تیل گرم کر کے اس میں کٹی ہوئی پیاز، کٹی ہری مرچ اور ایک چائے کا چمچہ میدہ ڈال کر فرائی کریں۔ یہاں تک کہ وہ ہلکا سنہرا ہو جائے۔ اب اس میں قیمہ، نمک پسی لال مرچ، پسا زیرہ، گرم مسالا اور کٹا ہرا دھنیا شامل کر کے اچھی طرح ملا کر نکال لیں۔ پھر ایک پیالے میں ایک عدد انڈے کی زردی پھینٹ کر مکسچر میں شامل کردیں۔ اب ابلے انڈوں کی سفیدی کی جگہ پر تیار مسکچر بھریں اور انہیں بریڈ کرمز میں لپیٹ کر تل لیں، یہاں تک کہ سنہرے ہو جائیں۔

pklibrary.com

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

pklibrary.com

pklibrary.com

امت الصبور

بیوٹی بکس

دھوپ میں جھلسی ہوئی جلد

گرمیوں کے موسم میں سن برن (دھوپ سے جلد کا جھلس جانا) ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ حساس جلد والے اس موسم میں خاص طور پر اپنی جلد کا خیال رکھتے ہیں ورنہ دھوپ کی تمازت کی وجہ سے چہرے کی رنگت بھی جھلس جاتی ہے اور بدنما دکھائی دیتی ہے۔

خاص طور پر جب گرم موسم میں لوگ پکنک منانے کے لیے ساحل سمندر یا فارم ہاؤس کا رخ کرتے ہیں۔ سن بلاک کے استعمال کے باوجود بھی کچھ لوگوں کو سن برن کی شکایت ہو جاتی ہے۔ جس کے باعث ان کی رنگت بہت زیادہ جل جاتی ہے۔ جس کی ایک وجہ تو سوئمنگ پول کے پانی میں جراثیم سے محفوظ رکھنے کے لیے کلورین کی موجودگی ہے۔

جبکہ ساحل سمندر پر دھوپ براہ راست جلد سے ٹکراتی ہے اور سمندر کا کھارا پانی لگنے کی وجہ سے سن بلاک کا اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔

آسان علاج

1۔ سن برن کے فوراً بعد دوبارہ تیز دھوپ میں جانے سے گریز کریں۔

2۔ تیز دھوپ میں نکلنے سے پہلے اچھے اور معیاری سن بلاک کا استعمال کریں۔ سمندر پر جانے سے پہلے واٹر پروف سن اسکرین کا استعمال کریں۔

3۔ متاثرہ حصے پر فوری طور پر ٹھنڈا پانی بہائیں یا ٹھنڈا گیلا نرم کپڑا رکھیں۔

3۔ ابتدا میں متاثرہ حصے پر صابن کا استعمال بالکل نہ کریں۔

5۔ دھوپ میں جھلسی ہوئی جلد کے لیے ایلوویرا کا استعمال بہترین ہے۔ یہ بالکل قدرتی طریقہ علاج ہے۔

6۔ متاثرہ حصے پر برف کی ٹکور بھی کر سکتے ہیں۔

7۔ آنکھوں کے اردگرد ہونے والے سن برن کو استعمال شدہ سبز چائے یا سادے ٹی بیگز کی مدد سے دور کیا جا سکتا ہے۔

8۔ جھلسی ہوئی جلد میں بہتری آنے لگے تو ناریل کے تیل سے مساج کریں۔

ماسک گھر میں بنائیں

اگر رنگت زیادہ جل گئی ہے تو اسے ٹھیک کرنے کے لیے ایک کھانے کا چمچہ دال مسور کو بھگو کر پیس لیں۔ اس میں دو کھانے کے چمچے پسے کا گودا، چٹکی بھر صندل، پسی ہلدی، چند قطرے عرق گلاب، آدھا کھانے کا چمچہ کریم اور آدھا کھانے کا چمچہ دودھ ملا کر فیس پیک تیار کر لیں اور اس ماسک کو پندرہ سے بیس منٹ تک چہرے پر لگائیں۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو لیں۔ ہفتے میں دو سے تین مرتبہ یہ عمل کرنے سے جلی ہوئی رنگت بہتر ہو جائے گی اور آپ کا چہرہ نکھرا نکھرا شاداب و تر و تازہ نظر آنے لگے گا۔

ایک چمچہ دہی میں ایک چمچہ شہد اور ایک چٹکی ہلدی ملا کر پیسٹ بنا لیں۔ اسے جلد پر پندرہ منٹ لگا کر رکھیں پھر ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ ہفتے میں ایک بار اس ماسک کا استعمال ضرور کریں۔

گرمیوں میں دودھ بھی آپ کی جلد کے لیے مفید ہے۔ دودھ میں شہد اور بیسن ملا کر پیسٹ بنا لیں اور ہفتے میں ایک بار اس کا استعمال کریں۔

☆

pklibrary.com